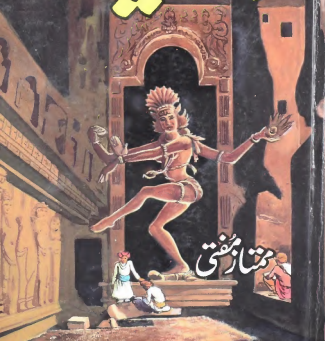


پند یاترا



ہندیاترا

ممتاز مفتی



نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

لاہور - دہلی - کراچی

حضرت امیر خسروؒ

کے نام

اگرچہ یہ کتاب اس لائق نہیں کہ

ایک بلند پایہ ادیب

عالم

فن کار

اور

عظیم بزرگ

کے نام معنون کی جائے

لیکن جیسی کیسی بھی ہے،

یہ کتاب انہی کی دین ہے۔

۲۶۶	پیش لفظ	۲۶۶
۲۶۶	دوسرا ایڈیشن	۲۶۶
۲۶۶	۱۹۹۲ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۱ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۲ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۳ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۴ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۵ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۶ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۷ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۸ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۰۹ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۰ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۱ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۲ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۳ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۴ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۵ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۶ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۷ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۸ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۱۹ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۲۰ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۲۱ء	۲۶۶
۲۶۶	۲۰۲۲ء	۲۶۶

فہرست

۷	پیش لفظ	۷
۹	ممتاز مفتی کی ادبی پارتا	۹
۱۹	تاری	۱۹
۳۴	رواگی	۳۴
۶۳	امر قمر	۶۳
۹۰	فریبرز میل	۹۰
۱۱۲	دلی	۱۱۲
۱۲۷	سکھت بکپ	۱۲۷
۱۳۰	ماضی	۱۳۰
۱۵۷	میرول	۱۵۷
۱۷۰	قلب صاحب	۱۷۰
۱۸۴	دردِ سنج	۱۸۴
۲۰۳	روز و شب	۲۰۳

۲۲۲

نئی سہ

۲۳۶

گل مریدک

۲۵۷

راگ وویا

۲۷۰

زیر تیں

۲۸۹

فراتیں

۳۰۹

آخری دن

۳۱۱

۳۱۲

۳۱۳

۳۱۴

۳۱۵

۳۱۶

۳۱۷

۳۱۸

۳۱۹

۳۲۰

۳۲۱

۳۲۲

۳۲۳

۳۲۴

۳۲۵

۳۲۶

۳۲۷

۳۲۸

۳۲۹

۳۳۰

۳۳۱

۳۳۲

۳۳۳

۳۳۴

۳۳۵

۳۳۶

پیش لفظ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۲ء

ایک روز قدرت اللہ شہاب نے بریکیل، ٹاکرہ کہا، ایک بات پوچھوں؟
میں نے کہا پوچھئے۔

یو نے آپ نے ہند یا تراس لئے کھسی تھی؟

کیا مطلب، میں نے پوچھا۔

آخر کوئی مقصد ہو گا۔

نہیں تو، کوئی مقصد تو نہیں تھا۔

عام طور پر سبب لکھنے کا مقصد سلف پر وجہ کشن ہوتا ہے۔

ہاں بالکل، میں نے جواب دیا۔

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ہندوستان کے بارے میں کچھ لکھنا مناسب

نہیں۔

میں نہیں سمجھا۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خیر سگالی کے

جذبات پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ آپ اس بات کو مانتے ہیں؟

جی بالکل مانا ہوں۔

ہر بات جو کھسی جاتی ہے، اس پر رو عمل ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ ہر بات کے

اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

بڑی معقول بات ہے، میں نے جواب دیا۔

کیا ہند یا تراس لکھتے وقت یہ بات آپ کے ذہن میں تھی؟

جی نہیں، بالکل نہیں تھی۔ میں نے تو ہند پارہ میں اپنے ذاتی اثرات بیان کئے

تھے۔

قدرت اللہ شباب بولے۔ آج کل ہندوستان کے سفرنامے لکھنے کا فیشن ہو چکا ہے۔ ان سفرناموں میں مصنف بلا تکلف ذاتی خیالات اور جذبات لکھ دیتے ہیں۔ انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ ان کے ذاتی جذبات دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات کی تشکیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دونوں ملکوں میں جذبات کے چھینٹے اڑاتے ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ اب ہمیں جذباتی تعلقات سے باہر نکل آنا چاہئے۔ چونکہ ہمارے باہمی تعلقات پر جنوب مشرقی ایشیاء کے تمام ممالک کے مستقبل کا انحصار ہے۔

قدرت اللہ کی بات بالکل صحیح ہے۔

کب تک ہم جذباتی رنگ پیکاریوں کی ہولی کھیلتے رہیں گے۔ کب تک ہم عزت کے چھینٹے اڑاتے رہیں گے۔ عقل کا ٹھکانا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے عزت اور احترام کے جذبات پیدا کریں اور انہیں فروغ دیں۔

دلی میں چند روز قیام کے دور ان مجھے یہ احساس ہوا کہ وہاں کے عوام کے دلوں میں پاکستان کے خلاف کوئی غم و غصہ نہیں، وہ پاکستان کو سچے دل سے تسلیم کر چکے ہیں۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف قصبہ نہیں۔ پھر ہند میں ہندو مسلم مساوات کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے اس امر کی وضاحت نہیں کی۔

ہندو مسلم مساوات یا اشتعال انگیز بیانات ہند کے عوام کے جذبات کے ترجمان نہیں ہوتے بلکہ سیاست دانوں کے مساوات کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں۔ ہند میں سیاست نے اپنے مساوات کے لئے ہندو قوم کو استعمال کر رہے ہیں۔ پاکستان میں سیاست نے اپنے مساوات کے لئے اسلام کو استعمال کر رہے ہیں۔

منہر مفتی

ڈاکٹر رشید امجد

ممتاز مفتی کی ہند یا ترا

ممتاز مفتی ایک شخص تھیں، نگلشن کا ایک عہد ہے۔

انہوں نے صرف اردو افسانے ہی کو ”ان کھی“ کے ایک نئے ڈانچے سے آشنا نہیں کیا بلکہ دو سری اصناف ناول، ڈرامہ، سفرنامہ، رپور تاژ اور خاکہ نگاری وغیرہ میں بھی اہم موضوعاتی اور فنی تجربے کئے ہیں۔ انہوں نے پہلی بار حقیقت نگاری اور رومان پسندی کے درمیان ایک ایسے نظریاتی تضاد کو ابھرا ہے جس سے ہماری کہانی میں ایسی نگاری و بازت پیدا ہوئی ہے کہ انسانی باطن کی گہرائیاں اس میں سمٹ آتی ہیں۔ انہوں نے محاور اور حقیقت کے درمیان درمیان ایک نئی سیمنٹی کو دریافت کیا ہے۔ یوں ان کے یہاں حقیقی زندگی کی کھری تصویریں بھی ہیں اور باطن کی ان ویسکی و دنیا کی ان کھی کہانیاں بھی۔

ممتاز مفتی کا فنی سفر کئی اصناف میں پھیلا ہوا ہے۔ انہوں نے ہر صنف میں اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی ہے لیکن یہاں بات ان کے سفرنامہ ”ہند یا ترا“ تک محدود ہے۔ اردو میں سفر نگاری کی روایت پرانی ہے اور پچھلے چند برسوں میں یہ سب سے مقبول صنف بھی ہے۔ یوسف خان کھل پوش اور محمود نظامی سے مستنصر حسین تارڑ تک کئی ادیبوں نے اس صنف میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن مفتی کا ”ہند یا ترا“ ایک مختلف سفرنامہ ہے جس میں ہندو سی گئی تھنیک سے ہٹ کر سفرنامہ اور رپور تاژ کو ملا کر ایک نیا تجربہ کیا گیا ہے جس سے ایک نیا ذائقہ پیدا ہو گیا ہے۔ مفتی کہتے ہیں:

”کیس کیس اس میں سفرنامے کی جھلک نظر آئے گی، کیس رپور تاژ کی تاثیر پیدا

ہو گا، کیس کیس ایسا لگے گا جیسے افسانہ ہو اور کئی ایک جگہوں پر یادوں کی

برسات کا رنگ جھلکے گا۔“

اصل بات یہ ہے کہ بڑا افکار حیثیت اور تھنیک کو سامنے رکھ کر نہیں لکھتا بلکہ اس کے

افکار و مشاہدات خود بخود کسی حیثیت میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور یوں بعض اوقات اس کی

خلافت مہارت ہیئت اور تکنیک کی صورت بھی بدل دیتی ہے۔ اس سفر نامے کا معاملہ بھی یہی ہے کہ مفتی نے اسے لکھنا شروع کیا، بنیادی طور پر یہ ایک سفر کی روداد ہے لیکن ان کے حجرے، علم اور وسیع مشاہدے اور مطالعے نے اس میں کئی رنگ بھر دیئے۔ سو یہ ایک سفر نامہ بھی ہے اور ایک تاریخ بھی۔ تاریخ اس حوالے سے کہ اس میں برصغیر کی دو بڑی قوموں مسلمان اور ہندوؤں کا انفسانی، فکری اور تمدنی مطالعہ بھی موجود ہے۔ یہ مطالعہ ایک پاکستانی مسلمان کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔ مفتی کے اپنے لفظوں میں:

”میں ہندو قوم کی جملہ مثبت خصوصیات کا مدراج ہوں۔ مجھے ان سے صرف

ایک شکایت ہے کہ ان کا رویہ مسلمان اور پاکستان کش ہے، پھر یہ بھی کہ

ہندو کے اس روپے کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ ہندو کے اس روپے نے مجھے

مسلمان بنادیا۔ مجھے ایک تعصب بخشنا، خفی نہیں، مثبت تعصب۔“

یہ مثبت تعصب پورے سفر نامے میں موجود ہے اور اس کی وجہ سے ہندو معاشرے پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا ممکن ہو سکی ہے۔ یوں تو یہ سفر نامہ ایک خاص عرصہ کا ہے لیکن اس کے پس منظر میں برصغیر کے مسلمانوں کے عروج و زوال کی ایک طویل تاریخ ہے۔ یہ دراصل دو ہرے سفر کی کہانی ہے۔ ایک سفر تو خارج میں اسلام آباد سے وطن تک کا ہے اور دوسرا سفر یادوں کے حوالے سے تقریباً ایک ہزار سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ مفتی نے کمال فنی مہارت سے ان دونوں سفروں کو یوں یکجا کیا ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ کہیں سے یادوں کا سفر شروع ہوتا ہے اور کہیں سے خارجی سفر، دونوں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ فنی طور پر ایک ایسی اکائی وجود میں آئی ہے کہ اسے حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ ایک اہتمام دیکھئے:

”ہندوی ہمیں ہزاروں میں داخل ہو گئیں۔ دورویہ دوکانیں بھی دوکانیں تھیں۔

بڑی معتبر قسم کی دوکانیں، تخت پر نہیبہ دوکانیں تھیں۔ سلاخی کی سلاخی دوکانیں

متنقل بڑی تھیں۔ یا اللہ یہ کیا بات ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے کو آئے ہیں، ابھی

تک کوئی دوکان نہیں کھلی۔ ہندو تو ایک سرخیز قوم ہے۔ صبح پو پختے وقت

جاگ اٹھتا ہے۔ ہندو کو مناخ کی نہیں، دوکان کی گنگ ہے لیکن یہ کیا،

ساڑھے آٹھ بج گئے اور ایک بھی دوکان نہیں کھلی۔ ہزاروں کوئی دوکان

میں کھلی تھی، ہر دروازہ منقل تھا۔ ہمیں یہ کیا ہوا۔ کیا ہندو کے دل سے دو کان کی محبت ختم ہوگئی، کیا اس پوتر گن کا انت ہو گیا۔ کیا ہندو بدل گیا۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہندو بھی نہیں بدل سکتا۔

ہندو صدیاں — بدھ مت کے تحت جیا۔ وہ بدھ مت جس نے سارے ایشیام کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ بدھ مت جس نے باہر کے انسان کو مسخ کر کے اندر کے انسان کو نکالا۔ جس نے امتیازات کو توڑا۔ جس نے کردار کی عظمت عطائی۔۔۔ وہ بدھ مت جس نے سارے ایشیام کو بدل دیا۔ وہ بدھ مت ہندو کا بال بھیکانہ کر سکا۔ لانا ہندو نے اس کے ماتھے پر اپنا ننگہ سجا دیا۔۔۔ پھر مسلمان آئے۔ سینکڑوں سال ہندو مسلمان کے تحت رہا۔ مسلمان بادشاہوں کا وزیر بنا۔ بڑے بڑے منصب حاصل کئے۔ مسلمانوں کے طور طریق میں رجن سن کیا۔ لیکن اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھی بلکہ مسلمان درباروں پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ پھر انگریز آیا۔ صدیوں ہندو انگریز کے تحت رہا۔ انگریز کا رنگ اپنایا لیکن باہر باہر سے۔ اس کے رنگ میں ڈوبا نہیں۔ اپنی روایات کو سینے سے لگائے رہا اور آج آزادی پالینے کے بعد صدیوں کے بعد اپنا راج قائم کر لینے کے بعد کیا ہندو بدل گیا ہے۔ کیا اس نے صبح سویرے جاگنا چھوڑ دیا ہے۔ کیا اسے دو کان کا جنون نہیں رہا۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ”

اس انتہاس میں مفتی نے صدیوں کا سطرکس خوبصورتی سے لمحوں میں طے کیا ہے۔ اہم بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ ان دو سطحوں میں انہوں نے ہندو قوم کا نفسیاتی تجربہ کر دیا ہے۔ ہندو کی نفسیات پر اور یہ کہ ہندو ازم ایک مذہب ہے یا جینے کا ایک طریقہ، ان گنت مضامین اور کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن مفتی نے جس انضام اور خوبی سے چند سطروں میں یہ نفسیاتی گرہ کھولی ہے، اس کی داد ممکن نہیں۔

”ہندو ہاتھ“ میں یادوں اور ماضی کے حوالے سے جو سفر تاریخی سطر کے ملبوں چنا ہے، وہ صرف یادوں یا چندوں تک محدود نہیں بلکہ تاریخی حقائق، تحقیقی معلومات اور نفسیاتی

و معاشی تجربوں تک پہنچا ہوا ہے۔ یہ برصغیر کی تاریخ کو درست رکھنے کی ایک تخلیقی سعی بھی ہے اور اس سعی کے پیچھے ایک مسلمان ذہن کا فرما ہے جو ہندو کے ساتھ صدیوں کے رہن سہن کے باوجود اپنی ایک ”مسلم شناخت“ رکھتا ہے۔ بظاہر یہ سفر ہومیو پیٹھی سکیموں کی تلاش تک محدود ہے اور مطلق اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں بٹول ان کے وہ ہندوستان کو لوٹ لائے ہیں لیکن یہ سفر صرف اس مقصد تک محدود نہیں بلکہ درون خانہ کشی اور اہم معلومات بھی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا مسئلہ ماضی کی بازیافت ہے لیکن یہ ماضی پرستی نہیں بلکہ ماضی کی یادوں کے حوالے سے حال کا جائزہ لینا ہے اور ہندو کے جدید دور سے اپنا تقابلی مطالعہ کر کے اس مقام و حالت کا تعین کرنا ہے جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ دوسرا اہم مسئلہ مفتی کی روحانیت ہے۔ وہ اس سفر کے ذریعے بعض روحانی بزرگوں کے حزار پر حاضری دیتا چاہتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم بزرگ قطب الاقطاب حضرت بختیار کلکیؒ ہیں۔ مفتی نے لاہور کے شاہ بابا کا پیغام بھی ان کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ یہ چند صفحات جن میں مفتی اپنے کمپ سے قطب صاحب کے حزار پر حاضری دینے اور واپسی کا سفر کرتے ہیں، برصغیر کے صوفیاء اور مختصر سی درجہ بندی کی ایک وریج تاریخ ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ مفتی نے حمیرہ چودہ صفحات میں کتنی اہم اور مفصل باتیں کر دی ہیں اور کتنی بے تکلفی اور روانی سے۔ ان چودہ صفحات میں مفتی لاہور سے دہلی، دہلی سے لاہور اور پھر موجودہ عہد سے انتشارش کے عہد میں لے جاتے ہیں اور ایک لمحے میں پڑھنے والا کبھی خود کو جدید دہلی میں قطب صاحب کے قیام پر کھڑا پاتا ہے اور کبھی سلطان انتشارش کے عہد میں قطب صاحب کی خوشبو محسوس کرتا ہے۔ فنی گرفت کا یہ کمال شاید ہی کسی دوسرے نثر نگار کو حاصل ہو۔

یہ سارا سفر دو تہذیبوں، دو ملکوں، دو عقیدوں اور دو قوموں کا ایک تقابلی مطالعہ ہے۔ دہلی اور اسلام آباد دو علاقہ میں ہیں جن کے توسط سے دو ملکوں کی مجموعی صورت حال کا قیاس کیا گیا ہے۔ دہلی کی جدت پسندی، ترقی اور رفتار میں ایک ٹھہراؤ اور تہذیبی رک رکھاؤ دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس اسلام آباد کی جدت پسندی اور ترقی میں ایک (بہملا پن ہے، یہی فرق دونوں ملکوں کی سفارت اور دفتری طریقہ کار میں بھی ہے۔ مفتی نے مختلف جگہوں پر اس فرق کو واضح کیا ہے اور دو ایک جگہ دہلی میں پاکستانی سفارت خانے کے مجموعی رویے پر طعنے بھی کیا ہے۔ ذرا عین سے پاکستانی سفیر کی ملاقات، بلکہ اس ملاقات کی حمید جس طرز پر انداز

میں ہانسی گئی ہے اور جس طرح یہ ملاقات ہوتی ہے اور سفر صاحب کی جگہ ان کے فرسٹ سیکرٹری پر آمد ہوتے ہیں، وہ حصہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک مختصر گفتگو دیکھئے:

”میں اس وقت چھوٹی ملازمی والا داخل ہوا۔ ”وہ آرہے ہیں، وہ آرہے ہیں“ وہ یوں انحصار بھری سرگوشی میں بولا جیسے حضرت امیر خسروؒ ”بخش نصیب تشریف فرما ہو رہے ہیں۔“ انہوں، وہ بولا ”خود نہیں، فرسٹ سیکرٹری کو بھیجا ہے۔“

اور اس عظیم ملاقات کی گرم جوشی کا حال دیکھئے:

”باری باری انہوں نے سب سے ہاتھ ملایا۔ جب میری باری آئی تو میرے ہاتھ میں ایک لفٹا بے جان ہاتھ تھا جیسے وہ اسٹیمولینڈ سے خاص طور پر میرے لئے امپورٹ کیا گیا ہو“

”ہندو پاترا“ میں ایک ٹاول کی سی کمانی، ایک سفر ٹائے کی سی منظر نگاری، ایک رپور ٹاؤ کی سی روایتی اور ایک تاریخ کی سی حقائق نگاری ہے۔ ملتی بات میں سے بات نکالنے کا فن چلتے ہیں۔ ان کی فنی مہارت کا کمال یہ ہے کہ وہ کمانی کو ایک ماہر نگار کی طرح جس شکل میں چاہیں، دھال سکتے ہیں۔ اپنے قاری کو ہدمر گھٹا چاہیں، گھٹا سکتے ہیں۔ اس سفر ٹائے میں بھی انہوں نے اپنے قاری کو ایک ہی حسرت میں کئی جلوے دکھائے ہیں۔ صدیوں کا سفر لکھوں میں کرایا ہے اور پڑھنے والا ان کے ساتھ ساتھ یوں چلتا ہے جیسے کوئی بچہ کسی بزرگ کی انگلی پکڑے چل رہا ہو۔ لیکن اس چلنے میں کوئی جبر نہیں بلکہ ایک لطف اور سپردگی کی لذت ہے۔ ملتی جب ایک طویل حسرت لگا کر حال سے ماضی اور ماضی سے حال میں آتے ہیں تو ذہن کو ذرا بھی جھٹکا نہیں لگتا اور پڑھنے والا کمانی در کمانی کے دیوار سراووں میں سفر کرتے ہوئے یوں محسوس کرتا ہے جیسے بالکل سیدھی پکی سڑک پر چلے جا رہا ہو۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے یہ سفر ٹائے صرف حال کا نہیں بلکہ اس کے پس پشت ایک طویل ماضی بھی ہے۔ ملتی کا کمال یہ ہے کہ جس شدت سے ماضی میں ڈوب کر ابھرتے ہیں، اسی شدت سے اپنے قاری کو بھی یہ تجربہ کراتے ہیں۔ یادوں کا یہ سلسلہ محض جذباتی نہیں بلکہ فکری اور تاریخی ہے اور مختلف مناظر سے تخلیق ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے

ماضی کے حوالے سے کئی فلمیں نگڑوں کی صورت میں چل رہی ہیں۔ ایک نگڑا ایک منظر دکھاتا ہے، پھر دوسرا نگڑا دوسرا منظر پیش کرتا ہے۔ یہ سارے سلسلے ایک تھون، ایک فکر اور ایک نظریے حیات کے حوالے سے ایک سرزمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر یہ سارے منظر ایک ہی سلسلے میں ہوتے تو ایک خشک تاریخ بن جاتے۔ مفتی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان بے شمار مناظر کو نگڑوں میں تقسیم کر کے پورے سفر میں پھیلا دیا ہے اور بڑی خوبصورتی سے انہیں حال کے مناظر سے جوڑ دیا ہے کہ قاری ایک پلیٹ قدم سے دوسرے پلیٹ قدم پر جست بھی لگاتا ہے اور اسے جھٹکا بھی محسوس نہیں ہوتا۔ اس میں مفتی کی فنی مہارت بھی ہے اور سفرنامے کی دلچسپی بھی جس میں کئی چھوٹے چھوٹے افسانے اور کہانیاں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں۔ بظاہر کئی باتیں معمول کی ہیں لیکن مفتی ان معمول کی باتوں کو غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ”ہند پترا“ صرف ایک معمول کا سفرنامہ نہیں بلکہ دائرہ و دائرہ ایک پیچیدہ سفر ہے جو خدج سے ہاتن اور ہاتن سے خارج میں آکر ایک تاریخی روپ اختیار کر لیتا ہے۔

مستار مفتی ایک صاحب اسلوب نثر نگار ہیں۔ مختصر طرز پر جملے لکھنے میں ان کا خوب نہیں۔ وہ بڑی آسانی سے ایسا طرز کر جاتے ہیں کہ کلیجہ پھٹتی ہو جاتا ہے اور پڑھنے والا فہم بھی نہیں کر پاتا کہ بات بہت آگے نکل چکی ہوتی ہے۔ اس سفرنامے میں بھی انہوں نے اپنے اس فن سے بڑا کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ جمل ضرورت پڑی ہے۔ ایک مقررہ کی طرح جذباتی تقریر بھی کی ہے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ تقریر کا احساس نہ ہو۔ قاری غور و فکر کرے یا اسلوب کے بہلاؤ میں نہ پئے اور اپنے آپ کو روک سکے تو اسے احساس ہو گا کہ مفتی نے اس کے ساتھ کیا ہاتھ کر دیا ہے اور اس کی شخصیت کو کیسے ریڑھ ریڑھ کر کے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔

اس سفرنامے کی ایک اور دلچسپی اس کے ذیلی عنوان ہیں جن سے آگے پڑھنے کی ایک انگ پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی مفتی کا ایک کمال ہے کہ وہ قاری کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیتے۔ قاری ایک سرزدہ شخص کی طرح ان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس کی دلچسپی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ ذیلی عنوانات نہ صرف یہ کہ چوتھے ہیں بلکہ ایک تہجس بھی پیدا کرتے ہیں۔ جیسے کھون ہی کھون۔۔۔ بجیر کر پاں۔۔۔ جڑو منتر۔۔۔ قلیوں کا جلوس۔۔۔

سکھ ہی سکے۔۔۔ نکلا کھڑا۔۔۔ لایں۔۔۔ دودھیا جوڑا۔۔۔ نیند میں پچھڑا۔۔۔ خوف کی دھجلا۔۔۔ اصل لڑکی۔۔۔ وغیرہ، قدری ایک تجسس کے ساتھ ان عنوانات کے دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے اور اس طلسم کے اسراروں میں کھو جاتا ہے۔

اس کتاب کی دلچسپی اور روانی میں دوسرے عناصر کے ساتھ مفتی کے اسلوب کا بھی نمایاں حصہ ہے۔ پنجابی کی کوکھ سے پھوٹا ہوا اسلوب مفتی کی پہچان ہے۔ انہوں نے اس سفر نامے میں بھی لردو، ہندی اور پنجابی الفاظ کو ایک دوسرے میں گونج کر ایک ایسی زبان بنائی ہے جو سفر نامے کے عمومی مزاج اور حالات و واقعات کے ساتھ اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ ایک عنصر کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں۔ اس طرح کی فنی اکائی ہی ایک اعلیٰ فن پارے کو جنم دیتی ہے اور یہ خوبی مفتی کے دوسرے کاموں کی طرح اس سفر نامے میں بھی پوری طرح موجود ہے۔ پنجابی الفاظ کے استعمال سے جملہ پڑنے کا رویہ پوری کتاب میں موجود ہے۔ مثال کے لئے یہ چند جملے پیش ہیں:

میں چوری چوری کانٹن آکھ سے چو باروں کو دیکھ رہا تھا۔

اسی طرح جتھ پنگلیاں گھومتی ہیں۔

پھر سڑک کے عین درمیان میں وہ چٹا سفید پاؤں۔

میرے سر کو کھون چڑھ گیا ہے۔

کیا یہ سب فوت شدہ لوگ ہیں۔

ایسا زانہ مزاج پایا ہے کہ پٹا مار کر دیئے بھٹاتی ہے۔

دیگنوں میں کھجول ہوتا ہے۔

کچ کے گلاس کی طرح نازک۔

ایک بار اس کے سونڈھے پر سر رکھ دوں، پھر جو ہوتا ہے ہو جائے۔

اسے مٹی میں رول دیا۔

جب دور سے فرنیشر میل کی کوکھ سنائی دی۔

تھا تو انگو، پر مسلمانوں کا بہت بڑی تھا۔

مفتی نے پنجابی الفاظ کا استعمال اتنی سہولت اور روانی سے کیا ہے کہ وہ جیسے کا لازمی

حصہ محسوس ہوتے ہیں۔ مفتی کے بیان اور اظہار میں اتنی روانی ہے کہ جب وہ جملوں اور

وقت کو چیزی سے سمیٹنے ہیں تو احساس ہی نہیں ہوتا کہ واقعہ یا بات کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جب ان کی بیوی موت کی دہلیز پر کمزی تھی، دونوں میاں بیوی انتہائی مہربانی کے عالم میں ہسپتال کو خیرباد کہتے ہیں۔

”چلو گھر چلیں“۔۔۔ ”چلو“ میں نے کہا۔۔۔ وہ بولی۔۔۔ ”جو ہوتا ہے وہی ہو“

پھر ہم ریل گاڑی میں بیٹھے قصور جا رہے تھے جہاں میں سکول باسٹر تھا۔ گاڑی کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں ہو سکتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ پھر دفعہ اس چھائی ہوئی مسلوہ عید کچھ بھی نہیں سے امید کی ایک کرن پھوٹی۔ ڈبے میں بیٹھے ہوئے لوگ لدھیانے کے کسی ڈاکٹر محمود کے حیرت انگیز مہجرات کا ذکر کر رہے تھے۔

میں نے زیر لب کہا ”شان من رہی ہو“

”ہاں“ وہ بولی ”من رہی ہوں“

”چلو لدھیانے چلیں۔۔۔ چلو گی“

”جہاں جی چاہے لے چلو“ وہ بولی ”کیا فرق پڑتا ہے“

ڈاکٹر محمود نے ایک پڑیا شان کے منہ میں ڈال اور بولا ”چلو، جوں جوں گھر پہنچو، اچھے ہوتے چلو“

ہم گھر پہنچتے گئے، شان اچھی ہوتی گئی، اچھی ہوتی گئی اور پھر چند ہی دنوں میں وہ ”کچھ بھی نہیں“ ”بہسی کچھ“ میں بدل گیا۔ زندگی پھر جری ہو گئی۔ پھول کھل گئے۔۔۔

اس فتناس میں جس طرح وقت اور فاصلے سٹے ہیں لیکن کہیں جھٹکے کا احساس نہیں ہوتا، وہ مفتی کے فن کا اعجاز ہے۔ مفتی کے قلم نے دم بھر میں طویل فاصلہ ہی طے نہیں کیا، بہت سی تفصیلات کو تائے بغیر ہی تصویر کھینچ کر رکھ دیتی ہے۔ چند مختصر مکالموں اور دو ایک جملوں نے اتنی مکمل تصویر بنائی ہے کہ اس کی ہر آراؤں میں بھی مکمل کرنا مشکل ہے۔ یہ مفتی کے فن کا اعجاز ہے جو ہر سے سفر نامے میں جگہ جگہ اپنی پہچان کراتا ہے۔

اس سفر نامے کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ مفتی نے یہ سفر ایک مسافر کی حیثیت سے

ایک شخص نہیں، ٹکشن کا ایک عدد ہے جس کا اپنا ایک اسلوب، ایک بیان اور انفرادیت ہے اور یہ سب کچھ اس سفر نامے میں موجود ہے۔

رشید امجد

C-52 لین نمبر 7-8

گلستان کالونی، راولپنڈی

کے سر

رضا - ۱۰ روبر

کیا گئے "ننگر پارک" چکوا

میں نے آج بھی یہی کہہ چکے بغیر نہ رہا تھا

میں نے اس قدر بار بار کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

میں نے یہی کہہ چکے ہیں کہ میں نے یہی کہہ چکے ہیں

تیاری

گزشتہ چونتیس سال میں کئی مرتبہ میراجی چاہا کہ ہندوستان جاؤں۔ ایک بار اپنے
بھائی بٹالے کو دیکھوں جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ مضافیاں محلے کو دیکھوں جس کے چوکوں میں
کھیل کھیل کر میں بڑا ہوا تھا۔

مضافیاں محلہ

کیا مضافیاں محلے کی وہ عظیم ڈیوڑھی جو محلے کو کوچہ بند کرتی تھی اب بھی جوں کی توں
تاثم ہے۔ وہ ڈیوڑھی جسے شہنشاہ جہانگیر نے بنوایا تھا۔ جہاں شہنشاہ خود ایک پار آکر ٹھہرا
تھا۔ وہ ڈیوڑھی جس میں سے گزرتے ہوئے مجھ پر دہشت سی طاری ہو جایا کرتی تھی۔
ساتھ ہی فخر سے میری گردن تن جاپا کرتی۔ کیا اس عظیم ڈیوڑھی کے بڑے بڑے چوٹی کواڑ
جو کبھی بند نہ ہوئے تھے، اب بھی ویسے ہی کھلے رہتے ہیں۔

کیا ڈیوڑھی سے ملحقہ مسجد اب بھی اسی طرح سفید چادر میں لپیٹی ہوئی گیان دھیان
میں نغمہ جیجی ہوئی ہے۔ کیا مسجد کے کنوئیں کا پانی اب بھی اتنا ہی طعنا ہے کہ سارا خمیں
جاتا۔

مجھے یاد ہے جب مجید ملک پہلی مرتبہ بٹالے آیا تھا اور اس کنوئیں کے سقاوے میں
نمایا تھا تو اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ”مطلق یہ کیسا پانی ہے۔ اتنا ٹھنڈا، اتنا تازہ، شہر میں تو
میں نے ایسا پانی کبھی نہیں دیکھا۔ ایسے گناہ ہے آج میں زندگی میں پہلی مرتبہ نمایا ہوں۔

کیا کنویں کے پہلو میں نور شاہ ولی اب بھی اسی المیہ کن اور سکون سے اپنے حرار میں لیٹے ہوئے ہیں۔ "نور شاہ ولی جو محلے کے محاذ تھے۔ مشہور تھا کہ چور مفتیاں محلے سے باہر نکلنے ہوئے نور شاہ ولی کے مزار سے گزرتا ہے تو اندھا ہو جاتا ہے۔ شاید اسی ڈر کے مارے مفتیاں محلے میں کبھی چوری نہ ہوئی تھی۔ کیا نور شاہ ولی اب بھی محلے کے محاذ ہیں۔

کیا چاروں اطراف محلے کے اونچے اونچے چار منزلہ مکانوں سے گھرے ہوئے چھوٹی اینٹ کے فرش والے وسیع میدان کو اب بھی منڈی کہتے ہیں۔ کیا اب بھی وہاں بچے کھیلتے ہیں، شور مچاتے ہیں اور کڑکیوں میں بیٹھی ہوئی بوڑھی عورتیں انہیں ڈانٹتی ہیں۔ سرد لاش کرتی ہیں۔ ہانکے تو باز نہیں آتا اچھا آلے گھر۔

کیا اب بھی بھتی گلی کو گھیرا کہتے ہیں۔ وہاں ہر وقت دل کی دھڑکنوں بھرا منظر اندھرا چھایا رہتا ہے۔ کیا اب بھی محلے کے کچے نوجوان وہاں گھنٹوں چپے رہتے ہیں کہ آتی جاتی لڑکیوں کی خوشبو قرب سے سونگھ سکیں۔

کیا اب بھی محلے کی بڑی بوڑھیاں کام کے بنائے اکٹھی بیٹھ کر سیکڑل کے جال بنی رہتی ہیں۔ اسی طرح آجہ بچکیں گھومتی ہیں۔ ہاتھ چلتے ہیں۔ ہونٹ کانوں میں گھس جاتے ہیں، بھر قہقہے کو بجتے ہیں۔

ہاں گزشتہ چونتیس برس میں کئی بار جانے میں ان جانے میں میں بنالے کے ٹکڑا ہزاروں میں گھومتا پھرا۔ وارونے والے کھوہ کے قبرستان میں اپنے دادا کی قبر پر بیٹھا رہا۔ باولی کے تالاب کے کنارے گیند بلا کھیلتا رہا۔

پھر دفعتاً میں جاگ اٹھا۔ نہ۔ نہ میری جان ان ہونے پہنے دیکھنے کا قاعدہ۔

رنگ پککاری

پھر وہ اے حمید ہے۔ امرتسر کا دیوانہ۔ اے حمید۔ اب میں اس کی شکایت کیے کروں، کس سے کروں۔ وہ میرا ساتھی قلم کار جو ہوا۔ اے حمید بد اخلاص ہے۔ ہر چند بلا بعد اپنی کسی ناکسی تحریر میں امرتسر کا ذکر نہ بھیج دیتا ہے۔ اس کی تحریروں میں اتنی جان ہے، اتنی زندگی ہے، اتنی رنگینی ہے کہ امرتسر میرے سامنے پھر سے اٹھ کھڑی لے کر جاگ اٹھا ہے، جی

انتہا ہے۔ وہ یکجہت مجھے امرتسر کو بھولنے نہیں دیتا۔

میں نے زندگی کے چند ایک سال امرتسر میں گزارے ہیں۔ مجھے امرتسر سے عشق ہے۔ میں امرتسر کی رنگ پچکاری سے ایسا پیچا کہ آج تک رنگ نہیں چھوٹا۔

ہاں کئی مرتبہ میرا جی چاہا کہ امرتسر جاؤں۔ وہاں اس ریل کی لائن کو دیکھوں جو ٹالے کو جاتی ہے۔ ہاں بازار میں گھوموں۔ کٹڑہ گھنٹیاں میں چوری چوری کاپی آنکھ سے چوہدوں کی طرف دیکھوں۔ سڑ ہوتے سازوں کی آوازیں سنوں۔ غنٹی چروں کی ج ج دجج دیکھوں۔

دفترا میں ان خوابوں سے جاگتا۔ چونکا۔ امرتسر۔ کون سا امرتسر۔ امرتسر تو اجڑ گیا تھا۔ ختم ہو گیا تھا اب امرتسر کہاں۔

۱۹۴۷ء میں ۳۰ ستمبر کو جب میں ٹالے سے واپسی امرتسر سے آخری بار گزرا تھا تو امرتسر کی سڑکیں لاشوں سے بھری ہوئیں تھیں۔ مکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ہوا میں خون کی بو رہی ہوئی تھی۔ فضا میں ملو دھماکا کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ماحول تشدد کی ہولناکیوں سے متعفن ہو رہا تھا۔

امرتسر میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہلرے ڈرائیو نے فوجی ڈک کو روک لیا تھا اور پھر اسے سڑک سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا تھا۔ پوچھنے پر وہ خوفزدہ آواز میں بولا تھا۔ نہ پائی نہ جو ہم امرتسر میں داخل ہو گیا تو پھر کبھی باہر نہیں نکلے گا۔ بچنے کا صرف ایک راستہ ہے باقی کہ امرتسر کو کاٹ کر نکل جائیں۔ اگر نصیب والے ہیں تو نکل جائیں گے ورنہ۔۔۔ نکل گئے تو صرف ایک خطرہ باقی رہ جائے گا۔ انٹری۔

کھوں ہی کھوں

ہاں ہندوستان جانے کی آرزو کئی بد سیرے دل میں ابھرتی لیکن۔۔۔ ساتھ ہی ۳۰ ستمبر کا وہ سفر یاد آ جاتا جب ہم بیٹھ کے لئے ہٹا۔ چھوڑ کر لاہور آ رہے تھے۔

سڑک کے کناروں پر جا بجا ہوائی اڈوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے جیسے علاقے میں عید قرباں منائی گئی ہو۔ فضا ان غلٹی سٹی لاشوں کی سرائے سے متعفن تھی۔ کتے ان نہ ختم ہونے والی لاشوں کو تنہو ذکر تک گئے تھے اور اس چھائی ہوئی آکٹا ہٹ اور بھرے پیٹ کی

بست سے خوف زدہ ہو کر رو رہے تھے۔

اور..... وہ بچہ۔ درخت کے تنے سے لپٹا ہوا۔ وہ بچہ۔ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے چڑا گئی تھیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کہیں ہو رہا ہے۔ وہ بچہ کھل سے درخت کے تنے میں لٹکا ہوا تھا۔

وہاں خالی پڑے تھے۔ کھیت ویران تھے۔ جگہ جگہ مکانات سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ پھر سڑک کے عین درمیان میں وہ چٹا سفید پاؤں جس کی بالکل جھاڑیوں کے پیچھے ڈھکیں پھیلائے براہند چڑی ہوئی تھی۔ مسلسل تشدد کی وجہ سے اس کی کوکھ باہر نکل آئی تھی۔

لو۔۔۔ وہ دیوانہ قبلی لالہ جو ماحول کے تشدد کی وجہ سے اپنا ذہنی توازن کھو چکا تھا اور اس کھٹن سے نجات پانے کے لئے ہمارے ٹرک کے سامنے لیٹ گیا تھا۔ ”کچل دو مجھے کچل دو۔ میرے سر کو کھون چڑھ گیا ہے مجھے کچھ بجائی نہیں دیتا۔ میں تھک گیا ہوں۔ کھون بہا ہمارا تھک گیا ہوں۔ ہار گیا ہوں۔ مجھے کچل دو۔“

ٹرک رک گیا۔ وہ لالہ سڑک کے درمیان لیٹا ہوا پتھریاں لے لے کر روئے جا رہا تھا۔ ”میرے سر کو کھون چڑھ گیا ہے۔ مجھے کچل دو۔“

ہاں کئی بار میرے دل میں خواہش ابھرتی کہ ہندوستان جاؤں۔ اپنا گھڑا بنالہ دیکھوں۔ امرتسر۔ لیکن دفعتاً منظر خون آلود ہو جاتا۔ تشدد کی پتھریاں چلتیں۔ نفرت اور حقارت کی آوازیں ابھرتیں۔ ہوس ڈکھیل کی بھڑاس اٹھتی اور پھر بغض و عناد کی خون آلود دیوار کھڑی ہو جاتی۔ نہیں میں ہندوستان نہیں جاؤں گا۔ میں نے جو ایک بار حقیقت میں جیتا ہے اسے دوبارہ ذہنی طور پر جیتنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ نہیں میں ہند نہیں جاؤں گا۔ وہ لاکھوں شہید جن کے خون سے ہار ڈر کی زمین ابھی تک سرخ ہے، وہ پو پھیں گے کہاں جا رہا ہے تو۔ یہ کیا کر رہا ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔ نہیں، میں ہند نہیں جاؤں گا۔

پھر ۱۹۸۱ء میں چھ تیس سال کے بعد دفعتاً میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ہند جاؤں گا۔ میں یہ بھول گیا کہ ہند کی سرحد ابھی تک لاکھوں مسلمانوں کے خون سے رنگی ہوئی ہے۔ میں یہ بھول گیا کہ مشرقی پنجاب میں لاکھوں شہید حیرت سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ پوچھ رہے ہیں تو کہاں جا رہا ہے۔ یہ تو کیا کر رہا ہے۔ ساری شراوت ہو میری دشمنی کی

تھی۔ ہومیو پتھی کی نگن میں میں اتنا سرشار ہوا کہ سب کچھ بھول گیا۔

ہومیو پتھی

ہومیو پتھی سے میں ۱۹۴۰ء میں واقف ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے میری بیوی اپنی سن ہسپتال میں پڑی تھی اور میں اس کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بھی چپ تھی۔ میں بھی چپ تھا۔ ایک دوسرے سے کہنے کے لئے ہمارے پاس کچھ نہ رہا تھا اور وہ بات جو ہونی بن کر ہمارے سامنے کھڑی تھی، اسے کہنے کی نہ مجھ میں ہمت تھی نہ اس میں حوصلہ تھا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ چاری ہے۔ مجھے علم تھا کہ وہ رخصت ہو رہی ہے۔ ہمارے درمیان موت کھڑی تھی۔

ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ کوئی امید باقی نہ تھی۔ اس بھری دنیا میں ہم دونوں اکٹھے تھے۔ نہ کوئی ہمدرد نہ رشتہ وار نہ ساتھی۔ اس لئے کہ ہم لے پڑے بوڑھوں کی رضا مندی حاصل کئے بغیر ملاپ کر لیا تھا۔ ہم نے مروجہ رسوم و روایات کے خلاف بغاوت کی تھی اور اس کا بیلنک نتیجہ بھگت رہے تھے۔ اس زمانے میں بھگت کو تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ہم دونوں تحقیر کی دنیا میں رہتے تھے۔ وہ اور میں اور تحقیر سے بو جھل بنے پاپاں فدا نے ہم دونوں کو کھڑا کر دیا تھا۔ کھڑا اور تھا۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ صدیاں بیت گئیں۔ پھر وہ دم سی آواز میں بولی "اب ہم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں"

"کچھ بھی نہیں" میں نے جواب دیا۔ "اب کرنے کو کیا رہ گیا ہے شان"

"کچھ بھی نہیں" وہ بولی۔

ہسپتال کے اس وسیع مگر ویران وارڈ نے آہ بھری۔ "کچھ بھی نہیں"

"چلو مگر چلیں" وہ بولی۔ "ہو ہوتا ہے وہیں ہو"

"چلو" میں نے کہا۔

پھر ہم ریل گاڑی میں بیٹھے قصور جا رہے تھے جہاں میں سکول ماسٹر تھا۔ گاڑی، کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں، ہو گئی ہوئی چل چاری تھی۔

پھر دفعتاً اس چھائی ہوئی مسلحہ و محیط کچھ بھی نہیں، سے امید کی ایک کرن

پھولی۔

ڈپے میں بیٹھے ہوئے لوگ لورہ صیانی کے کسی ڈاکٹر محمود کے حیرت انگیز معجزات کا ذکر کر رہے تھے۔

میں نے ذریعہ لب کہا۔ ”شان سن رہی ہو“

”ہاں“ وہ بولی ”سن رہی ہوں“

”چلو لورہ صیانی چلیں۔ چلو گی“

”جہاں جی چاہے لے چلو۔“ وہ بولی۔ ”کیا فرق پڑتا ہے“

ڈاکٹر محمود نے ایک پڑیا شان کے منہ میں ڈالی لورہ بولا۔ ”جاؤ۔ جوں جوں گھر پہنچو گے اچھے ہوتے جاؤ گے۔“

ہم گھر پہنچے گئے، شان اچھی ہوتی گئی۔ ابھی ہوتی گئی۔ اور پھر چند ہی دنوں میں وہ کچھ

بھی ضعیف۔ کبھی کبھ، میں بدل گیا۔ ذہنی پھر رہی ہو گئی۔ پھول کھل گئے۔

ہو میوہ پختی کے اس سبزے پر میں حیران تو ہوا لیکن مجھے یہ شعور نہ تھا کہ یہ میوہ ہو

میوہ پختی کا ہے۔ میں اسے سواج کا میوہ ہی سمجھا رہا۔ مجھے علم نہ تھا کہ ایک ہو میوہ پختہ

ہے۔

جاننا ماننا

اگر میں یہ جان بھی لیتا تو شاید ماننے کی نوبت نہ آتی۔ جاننا اور بات ہے اور ماننا اور

بات۔

ہم بہت سی باتیں جان لیتے ہیں مگر وہ ہلکا جڑ ایمان ضعیف بنتیں۔ جاننا صرف ذہن کو متحرک کرتا ہے، دل میں جذبہ پیدا کرنے کی صلاحیت ضعیف رکھتا۔ عمل پر اپنا رنگ ضعیف چڑھاتا۔ ایسا جاننا ذہن پر یو جہ کے علاوہ کوئی حیثیت ضعیف رکھتا۔

میری طرح بہت سے لوگ ایسے ہیں جو سڑوں پر جاننے کی بجائی گھنڑیاں اٹھائے پھرتے ہیں لیکن ماننے کی سبک روختی سے محروم ہیں۔

پھر ۱۹۵۳ء میں جب دلوپنڈی میں کانچ روڑ پر رہتا تھا تو ہلکے مگر کے پاس ہی ایک ہو میوہ پختہ کی دکان تھی۔ ان کا نام رشید تھا۔

ایک روز میں نے کہا ”رشید صاحب کیا آپ کے پاس کوئی ایسی دوا بھی ہے جو انسان کی شخصیت کو بدل دے۔“

انہوں نے کہا۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا۔“

میں نے کہا۔ ”ایسی دوا جسے کھا کر میں محسوس کروں کہ میں میں نہیں رہا۔“

انہوں نے کہا۔ ”ہاں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”ہو سکتا نہیں۔ ہوتا ہے۔“ وہ بولے۔

”شرط رہی۔“ میں نے کہا۔

”رہی“ وہ بولے اور مسکراتے گئے۔

”تو دیجئے۔“

انہوں نے کہا۔ ”آج نہیں کسی روز دیں گے۔“

چھ مہینے گزر گئے۔ وہ بات میرے ذہن سے نکل گئی۔

ایک روز رشید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ دھنسا

بولے۔ ”کیا آپ کو زکام کی شکایت ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں کچھ کچھ۔“

بولے۔ ”ایک خوراک کھالیں۔“

میں نے خوراک کھالی۔

اگلے روز جب میں سو کر اٹھا۔ تو سب کچھ عجیب سا لگا۔ چائے پینے لگا تو پی نہ پایا۔

حیران۔ چائے اور ابھی نہ گئے۔ میں تو چائے کا رسیا تھا۔ سگریٹ سلگایا تو وہ کانٹے کو

دوڑا۔ بجھا دیا۔ پڑھنے بیٹھا تو پی نہ پایا۔ لکھنے لگا تو ذہن خالی پات۔ میں رشید کے پاس

دوڑا دوڑا گیا۔

بولے۔ ”کیا تکلیف ہے۔“

میں نے کہا۔ ”سب گزر رہا ہے۔“

بولے۔ ”مثلاً۔“

میں نے کہا۔ ”یوں کچھ لیجئے کہ میں میں نہیں رہا۔“

نہے۔ بولے۔ ”آپ شرط ہار گئے۔ چہ میبے پہلے آپ نے پوچھا تھا کہ ہومیو پتھی شخصیت کو بدل سکتی ہے۔ آپ نے دیکھ لیا ہومیو پتھی کا اعجاز۔“

ہومیو پتھی کا اعجاز جان کر بھی میں نے اسے نہ مانا اور میرا یہ تجربہ جزو زندگی نہ بنا۔

۱۹۷۵ء میں مجھے دورے پڑنے لگے۔ ہر آٹھ دس دن کے بعد دورہ پڑتا۔ اٹھا کر مجھے ہسپتال لے جاتے۔ اتنی دیر شوگر کے نیچے لگاتے۔ اسی سی سی کرتے۔ قے کی دوا دیتے۔ پھر چار ایک کھینے کے بعد میں گھر آ جاتا۔ جانا تو یقین نہ ہوتا کہ واپس آؤں گا۔ ڈاکٹر کہتے تھے خوفناک قسم کی المی ہے۔

مجھے مرنے پر اعتراض نہ تھا۔ ستر سال گزار چکا تھا۔ آخر مرنا تو ہے ہی۔ لیکن مجھے ہسپتال میں مرنے پر سخت اعتراض تھا۔ انسان مرے تو امینان سے اپنے بستر میں مرے۔

میں نے اشفاق احمد سے کہا کہ یاد رکھ کر وہ آرام سے گھر میں مروں۔
وہ مجھے احمد خان کے پاس لے گیا۔

احمد خان زراعت کے مجھے میں بیٹا افسر تھا۔ اشفاق سے ہومیو پتھی کا بھڑا دیکھا۔ اسے جانا۔ پھر مان لیا اور ساری زندگی ہومیو پتھی کے لئے وقف کر دی۔
احمد خان کی دوا نے میرے دورے ختم کر دیئے۔ اس بات پر میں اتنا حیران ہوا کہ ہومیو پتھی کو جاننے کے لئے بے تاب ہو گیا۔

مطالعہ کیا تو حمید حیران ہوا۔ یا اللہ یہ کیسا طریق علاج ہے کہ دوا جس قدر کم ہوگی اتنی ہی طاقت ور ہوگی۔ یہ بات تو کسی درویش ہی کو سوجھ سکتی ہے نہ عالم کو نہ حلق کو۔ یوں میں ہومیو پتھی کو جاننے میں کھو گیا۔

انہی دنوں اشفاق حسین اسلام آباد گیا۔

اشفاق حسین میرا پرانا دوست ہے جسے میں ۱۹۳۰ء میں ملا تھا تاکہ اس سے راگ و دھڑیکوں، سریکوں، ٹال سیکوں، ردھم جانوں تاکہ میری طبیعتی تخیلی میں مناس پیدا ہو۔

اشفاق حسین یہاں آنے سے پہلے کراچی میں مقیم تھا۔ اسے آٹھ ماہ سے چھوٹا بھڑا

آتا تھا۔ بیسیوں علاج کر چکا تھا۔ کوئی افادہ نہ ہوا تھا۔ اشفاق حسین چند سال کیسٹ کی دکان بھی چلا چکا تھا اس لئے اسے ایلوپیتھی سے واقفیت تھی۔ ضرورت سے زیادہ واقفیت تھی۔

ایک روز اشفاق حسین آیا تو میرے ہاتھ میں ہومیو پیتھی کی کتاب دیکھ کر پرچنے لگا۔
”یہ کیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”دیکھ لو۔“

اشفاق سے کتاب کھولی تو ٹائیک ایسٹ کا بیان نکل آیا۔ لکھا تھا۔ اگر پیشاب سے گھوڑے کے پیشاب کی بو آئے تو ٹائیک ایسٹ مفید رہتا ہے۔

کہنے لگا۔ ”یار۔ میرے پیشاب سے ایسی بو آتی ہے۔ ایک خوراک مجھے دو۔“

وہ ایک خوراک کھائی تو اشفاق حسین کا آٹھ مہینے پرانا بخار ٹوٹ گیا۔ اس پر وہ تو پاگل ہو گیا اور یوں ہومیو پیتھی کا پروانہ بن گیا۔

پھر ہم دونوں اکٹھے ہومیو پیتھی پڑھنے لگے۔ مسعود کے بیٹے محبوب الہی اور خالد نے ہماری رہنمائی کی۔ جتنی کتابیں یہاں دستیاب تھیں سب پڑھ لیں تو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ہندوستان میں مچھی ہوئی کتابیں پڑھیں۔ ہندوستان ہومیو پیتھی کا گھر ہے۔ مغرب میں فرانس، مشرق میں ہند۔ وہاں سے کتابیں منگوا نہیں سکتے تھے۔ لہذا سوچا ہند چلیں۔

یوں ہند جانے کا منصوبہ آپ ہی آپ بن گیا اور میں بھول گیا کہ سرحد کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے ابھی تک رنگین ہے اور مشرقی پنجاب کے لاکھوں شہید حیرت سے میری طرف دیکھ کر پوچھ رہے ہیں کہ کہاں جا رہے ہو، یہ تم کیا کر رہے ہو۔

عرضی پھر عرضی

بے شک ہم نے ہند جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن فیصلوں سے کیا ہوتا ہے۔ زندگی میں میں نے اتنے فیصلے کئے، مصمم ارادے کئے۔ اگر ان میں سے چوتھائی بھی پورے ہو جاتے تو میری زندگی کا دھارا کسی اور رخ پر بس رہا ہوتا۔ میرا کردار فقیر کی گدڑی کی طرح بوند زدہ نہ ہوتا۔ میری صلاحیتیں یوں رنگ آلود نہ ہوتیں۔ وہ سارے فیصلے یک طرفہ اشارات

سے آگے نہ ابر سکے۔

اگرچہ ایک جنون اس کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ لیکن میرا جنون بھی تو لون غنا والا جنوں ہے۔ بظاہر اس بات کا کوئی امکان نہ تھا کہ ہم سرحد پار جاتے۔ کون پاسپورٹ کے جمیلوں میں پڑے۔ کون ویرا کے دفتر کے پھیرے لگائے۔

اتفاق سے ہمارے پڑوس میں ایک ڈپٹی سیکرٹری رہتے ہیں۔ انہوں نے کہا۔ یارو۔ کہاں این اوسی کے بکھیزوں میں پڑو گے۔ ویرا کے لئے در در کی خاک چھانو گے۔ دائروں کے کسی جھٹے میں شامل ہو جاؤ۔ ایک پنٹھ دو کالج۔ بابا کو سلام بھی کر لینا۔ عرس میں حاضری بھی لگوا لینا۔ ہو میوڈیتی کی کتابیں بھی لے آنا۔ امیر خسرو کا عرس آگست میں ہو رہا ہے۔ بس ایک عرضی داغ دو۔ نام نکل آیا تو واہ۔ ورنہ پھر عرضی۔ پھر عرضی۔ پھر عرضی۔

ہم دونوں نے مذہبی امور کے نام دو عرضیاں داغ دیں۔ اسی رات امیر خسرو نظر آئے۔

لکا ہوا منہ موڑے بیٹھے تھے۔

میں نے عرض کی، ”عالی جاہ ہم تو حاضری کے لئے کوشاں ہیں، آپ منہ موڑے بیٹھے ہیں۔“

بولے۔ ”اپنے شوق بھلانے کو آتے ہو۔ ہمارا نام مفت میں بد نام کرتے ہو۔ کوئی ہندسی سلاخیاں خریدنے آتا ہے۔ کوئی بنی کا جینر بنانے آتا ہے۔ کوئی دلی کا قلعہ کرنے آتا ہے۔ کوئی رشہ داروں دوستوں سے ملنے آتا ہے۔ کوئی ناچاڑ کاروبار کی ہوس لے کر آتا ہے۔ ہمارا نام تو مفت میں بد نام ہے۔ ہمارے لئے آؤ تو چاہیں۔“

میں نے ایک دوست سے ہلت کی۔ میں نے کہا۔ ”یار بات بنتی نظر نہیں آتی۔“

”کیوں“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”امیر منہ موڑا کئے بیٹھے ہیں، کہتے ہیں ہمارے لئے آؤ تو چاہیں۔“

”میں نہیں“ ہنسا۔ وہ بولا۔ ”اگر امیر خلی بزرگ ہوتے تو شاید اس بات پر

آزاد وہ خاطر ہوتے۔ بھئی وہ تو بزرگ ہونے کے علاوہ بہت بڑے دانشور ہیں، عالم ہیں، فن کار ہیں اور تم بھی تو علم کے حصول کے لئے چارہ ہے ہو۔"

اس کی بات سے اگرچہ دھارس بندھی لیکن میں ڈانٹوں ڈول ہی رہا۔
دراصل میں خود شرمندہ تھا۔

زندگی بھر میں نے ایسا کیا۔ کام کچھ کیا۔ پنم کچھ لیا۔ خود کو دھوکا دیتا رہا۔
دوسروں کو دھوکا دیتا رہا۔

جج آفس

پھر دفعتاً ایک روز ایک لمبا لفافہ موصول ہوا۔ کھولا تو دیکھا۔ لکھا تھا آپ کا پنم دائرین کی پادٹی میں قرعہ اندازی سے نکل آیا ہے۔ آپ اپنا پاسپورٹ شناختی کارڈ اور ۱۰ روپے کا بینک ڈرافٹ لاکر فلاں تاریخ کو دفتر میں جمع کرا دیں۔

اشفاق حسین اور میں اس پر اتنے حیران ہوئے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا کہ ارادہ اتنی جلدی حقیقت میں بدل جائے۔ اشفاق حسین حیران تھا کہ یہ کیا ہوا۔ اس میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔

مقررہ تاریخ سے پہلے اشفاق حسین نے کہا۔ "یاد کانڈنٹ تو رہنے ہی ہیں۔ تم جا کر دے آؤ۔ آج ہی۔ تم ایک جانے پہچانے شخص ہو۔ تم نے جج پر ایک کتاب جو کہی ہے۔ وہ ہمیں فوراً پہچان لیں گے۔ اس طرح آسانی ہو جائے گی۔"
اشفاق حسین کے کہنے پر میں کانڈنٹ لے کر جج دفتر جا پہنچا۔

اسلام آباد کی ایک پر فضا اور پر رونق سڑک پر وہ ایک دیران اور اس بنگلہ تھا۔ باہر سے ہوں نظر آتا تھا جیسے سالہا سال سے غیر آباد ہو۔ ڈرتے ڈرتے میں اندر داخل ہوا۔
ایک مختصر سے خلی خلی کمرے میں دو نوٹی ہوئی میزوں پر دو افراد یوں بیٹھے تھے جیسے وفات پر اطوس کرنے آئے ہوں۔

انہوں نے چونک کر میری طرف ہوں دیکھا جیسے کسی کا کمرے میں آنا ایک غیر ار معمول بات ہو۔ اس ماحول کو دیکھ کر میں خود سہم چکا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے پاس بیٹھ کر صف ماتم میں شریک ہو جاؤں اور قاتحہ ہنسنے کے لئے ہاتھ اٹھاؤں۔ لیکن مجھ میں بہت

نہ پڑی۔ میں نے مدغم آواز میں کہا جناب مجھے نیکشن انٹر صاحب سے ملنا ہے۔
ایک نے سامنے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ بولا۔ ”اوپر۔“ میڑھیاں ہڑھ
کر۔“

میں دروازے سے باہر نکل گیا۔

وہ ریپیشن تھی۔ خلی ویران اداس۔ ایک بوسیدہ سائینڈ اوپر جا رہا تھا۔ زینے
کے پاس ایک چھڑی ٹوٹے ہوئے سنول پر بیٹھا لوگھ رہا تھا۔
حیرانی سے میں اس اداس ویران سے آباد ریپیشن کو دیکھتا رہا۔ یا اللہ اس حسین
شہر میں اس شاداب سڑک پر واقع اس پیچھے کو غیر آباد ویران اور اداس بنانے میں ان
لوگوں نے کتنی محنت کی ہو گی۔ کیا یہ جج آفس ہے۔ کیا یہ دفتر من لوگوں کے لئے ہے
جنہیں مکہ اور مدینہ شریف سے بلاوا آتا ہے۔ جہاں جج کے ذوق سے سرشار پروانے آتے
ہیں، وہ لوگ خوشی کے مارے جن کے پاؤں زمین پر نہیں نکلتے، جو حاضری کی خوش قسمتی پر
پھولے نہیں ملتے۔

کیا یہ جمہوری اسلامی کالج کا دفتر ہے۔ اس خدا داد ملکیت کا بڑا اسلام کے نام پر بنی
ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ضرور میں لفظی سے کسی اور جگہ آگیا ہوں۔ اس سے تو مسندوہ
کے نشین پر پھول جانے والے مسافروں کا ویٹنگ ہال کہیں زیادہ آباد ہے۔

وقف سنول پر بیٹھے ہوئے چھڑی نے آنکھ کھولی۔ میری طرف دیکھا۔
انگوٹھے سے زینے کی طرف اشارہ کیا اور پھر سے لوگھنے لگا۔

یا اللہ کیا میں کانکا کے کاسل میں آ نکلا ہوں۔ کیا یہ عالم برزخ ہے۔ کیا یہ سب
نوت شدہ لوگ ہیں۔ زینہ چڑھتے ہوئے مجھ پر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔
زینے کے مین پبلو میں نیکشن آفیسر کی نیم پیٹ لگی ہوئی تھی۔

میں نے اندر جما لگا۔ ایک مسافروں نما کمرے میں ایک خشونت بھرا شخص کھڑا تھا۔
اس کے بائیسوں میں بہت بڑا کاغذ تھا۔ اس کے سامنے ایک شخص سو ب تھت کھڑا تھا۔
مجھے دیکھ کر نیکشن انٹر چو لگا اور خشک لہن لگا ہوں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ
رہا ہو تم۔ کیوں آئے ہو۔

"جناب ان کاغذات کی رسید دیں گے"۔ نور دین بولا۔

"رسید"۔ اس نے غشکیں لگا ڈالی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے"۔ نور دین نے اپنی گھستائی کو روک رکنے کے لئے کہا۔

"کوئی پروگرام۔ میرا مطلب ہے۔ یعنی جانے کا پروگرام"۔

"پروگرام"؟ اس نے پھر گھور کر دیکھا۔

"میرا مطلب ہے ہمیں کب روانہ ہونا ہے۔ کب پہنچنا ہے۔ کیا کیا سامان"۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے نور دین کو خاموش کر دیا۔ پروگرام جب بنے گا بھیج دیں گے۔

نور دین عالم بے بسی میں اٹھ بیٹھا۔ "جی بہت اچھا۔ بہت اچھا"۔

"دیکھو" وہ بولا۔ "کاغذات جمع کروا دینے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ لوگ

خود کو زائرین پارٹی میں شامل سمجھا شروع کر دیں۔ ہم کاغذات کو پروسس کریں گے۔ پھر

آخری فیصلہ ہو گا کہ پارٹی میں کون کون لوگ شریک ہیں۔ کبھے"۔

"جی سمجھ گیا"۔ بالکل سمجھ گیا۔

میں وہاں سے بھاگا۔ یوں بھاگا جیسے مجرم جائے واردات سے بھاگتا ہے۔

میں نے کہا نہ تھا

مسجد روڈ پر پہنچ کر مجھے گویا پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اسلام آباد کس قدر خوبصورت

شہر ہے اور نیکیر ٹریٹ کو جانے والی وہ سڑک جس پر جے آفیس واقع ہے لمبے لمبے سانس لینے

کے لئے کس قدر موزوں ہے۔

اشفاق حسین میرا انتظار کر رہا تھا۔ "کیاں دے دیئے کاغذات"۔

"ہاں دے دیئے"۔

"ٹھیک ٹھاک"۔

"ہوں۔ ٹھیک ٹھاک"۔

"انہوں نے حمیس پہچان لیا ہو گا"۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں۔

”دیکھنا“۔ وہ بولا۔ ”میں نے کمانہ تھا کہ وہ تمہیں پہچان لیں گے اور کاغذات منظور کر لیں گے۔“

”ہاں ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے کہا تھا۔“

”جانے پہچانے آدمی کے ساتھ زیادہ پر جانے میں بڑی سہولتیں ہوتی ہیں۔ مجھے پتہ ہے۔ پروگرام دیا انہوں نے۔“

”پروگرام۔ ہاں پروگرام۔“ میں نے تھوک نکلتے ہوئے کہا۔ ”ابھی پروگرام طے نہیں ہوا۔“

”کیا کہا؟ پروگرام طے نہیں ہوا۔“

”کیسے ہو سکتا ہے بھائی۔ ابھی انیس فارن آفس سے ملنا ہے۔ انڈین ایسے سے بات کرنی ہے۔ ویزے لینا ہیں۔ این اوسی لینے ہیں۔ ان مرحلوں کو طے کرنے کے بعد ہی پروگرام بنے گا۔ پچارے بہت مصروف ہیں۔“

”لوہ۔“ وہ بولا۔ ”یہ بھی ٹھیک ہے۔ ہر مل انہوں نے حمیس تفصیلی اطلاع دے دی۔ ہر کسی کو تفصیلی اطلاع تو نہیں دیتے نا۔“

”اونہوں۔ بالکل نہیں“ میں نے جواب دیا۔

”میلڈ انکرم پر چھا ہو گا۔“

”بالکل بالکل۔ چائے کچھ زیادہ سی مینٹی تھی۔“

”بہر حال ے اکو روٹنگی تو طے شدہ بات ہے نا۔“

”بالکل طے شدہ۔“

”تو پھر تم فکر کو اطلاع دے دو نا۔“

فکر تو نسوی

فکر تو نسوی۔ میرا ایک پرانا دوست ہے۔

تقسیم سے پہلے ہم دونوں مل کر ادب لطیف کو ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ کام کا ایڈٹر وہ تھا نام کا میں۔ وہ شاعر تھا میں نثر نگار تھا۔ وہ منتخب تھا میں درشتی تھا۔ وہ خاموش تھا۔ میں سکھ زدہ تھا۔

تہذا تقسیم کے بعد ملک کا لاہور میں رہتا مشکل ہو گیا۔ چونکہ وہ ہندو تھا۔ تمام کشادہ رام لال تھا یا کیا۔ کتبہ اردو کے مالک چھوڑی برکت علی نے کیا اگرچہ فکر نام کا ہندو ہے پھر بھی نصیبی بڑی مکدر ہے۔ کوئی نام اور کام کا فرق نہیں رہا۔ فکر بھاری قوم دلدی ہے۔ اس کی سلامتی اور افراس ہے۔ یہ سن کر نام سب نے فیصلہ کیا کہ فکر کو ہندوؤں کے ریاضی کپ میں چھوڑ آئیں۔ تقسیم سے متعلق واقعات نے فکر اور مجھ پر بے حد اثر کیا۔ فکر جو ہندو ہے ہے یا تو تھا۔ بے زار ہو گیا۔ میں جو مذہب سے کورا تھا سلطان بن گیا۔

ہند میں جا کر فکر نے اپنے قلم کو کھول دیا اور سماج کے خلاف چغائی کرتے لگے۔ اس کی طرح میں شدت سے کات تھی اس لئے وہ روز نامہ ملک کا نمبر وقت کانسٹ بن گیا۔

ہندو پہلے فکر پاکستان آیا تھا۔ لاہور میں اس نے مختلف ادبی محفلوں میں شرکت کی تھی۔ دانشوروں سے ملاقاتیں کی تھیں۔ موقوفین و خطا حقیقہ میں کہیں کہیں لکھیں وہ اسلام آباد گیا۔ ایک بڑے کچھ شکل اس کے پاؤں پہنچے۔ برکت علی کا ایک پینڈا گزار گیا اور وہ مجبوراً فکر نامہ واپس دلی چلا گیا۔

میں نے فکر کو خط لکھا۔ میرے دلی آنے کے امکانات بڑھ چکے ہیں۔ میں ہومیو پتھی کے طالب علم کی حیثیت سے آرہا ہوں لیکن دائرہ کار وسیع و حد وسیع آؤں گا۔ میں ادیب کی حیثیت سے نہیں آرہا ہوں بلکہ خیر خواہ کسی کو اطلاع دے کر بلا کہ میں آرہا ہوں۔

”مذہب سے متعلق آؤ۔“

”مذہب سے متعلق۔“

”مذہب سے متعلق۔“

جسٹر منتر

میری بات یہ ہے کہ میں ہندی پالیسی سے مخالف ہوں۔ ہندی پالیسی یہ ہے کہ جو آؤ گے چاہے وہ ادیب ہوں گویا ہو۔ معذور ہوں، دانش ور ہوں۔ اسے اپنا لو۔ سر آنگھوں پر بٹھاؤ۔ دارے ہارے جاؤ۔ آنے والے سے کوہم تو بھائی بھائی ہیں مگر آؤ گے پادشہ کی گلیں جس نے ہمیں ملک ملک کو توڑا ہے جموئی ہے۔ ہندی زبان ایک ہے۔ انہیں ایک ہے۔ انہیں سن لکھ سکتے ہیں۔ مسائل ایک ہے۔ میں نے پھر تقسیم نہیں کی۔ بھائی بھائی کو کوئی ایک کر سکتا ہے۔

ہندو۔

صاحب ہندو قوم ایک عظیم قوم ہے۔ اس میں اپنا لینے کی اتنی قوت موجود ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں بڑی بڑی قومیں آئیں۔ بڑے بڑے مذہب آئے لیکن ہندوئے جذب کو اپنا لینا جذب کر لیا۔

مثلاً بدھ مت آیا۔ بدھ مت ایک عظیم مذہب تھا۔ ایک ایسا مذہب جس نے ملت انڈیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام انڈیائی ممالک پر چھا گیا تھا۔ بدھ مت نے اکثر ہندو کے انسان کو جگایا۔ چھوٹے چھوٹے کے اعتبارات سے دیکھو۔ سارے انسانوں کو ایک مرجہ مغل دیوانہ بنانے کا مارجہ۔

اس کے برعکس ہندو مت باہر کے انسان کو مانا تھا۔ بڑے چھوٹے کا شامل تھا۔ اعتبارات کے بل بوتے پر تمام خاندان کو بیچ اس کی محنت میں لپیٹی تھی۔

بدھ مت سارے ہند پر چھا گیا۔ لیکن بدھ مت میں ہندو کے کیا جلدو پھر نکال دیوں گا۔ جہیز مشرق پر جا کر اسے عظیم اور مغرب مذہب کو خود میں جذب کر لیا۔ ایسا ہی کیا کہ اس کی انفرادیت ختم کر کے رکھ دی۔ آج اس کا نشان تک نہیں رہتا۔

پھر جین مت آیا۔ وہ بھی ہندو ازم میں جذب ہو کر رہ گیا۔ پھر سکھ مت آیا۔ سکھ کے اوصاف ہندو سے بیکر مختلف ہیں۔ سادہ مزاج، جو عقیدہ، جذباتی، مسخت مند، ٹھنڈے آئے بھی اپنا لینا اور آج سکھ مت کی حیثیت اتنی ہے کہ جیسے وہ ہندو ازم کی ایک شاخ ہو۔ وہ تو فکر ہے کہ سکھ اپنی پانچ خصوصیات پر کھڑا کیا، کیس اور سنگھاسے ذرہ دستی چٹا ہوا ہے۔

اگر وہ نہیں اور چنگیزی کی خصوصی انفرادیت کو چاک دیا تو آج ہم ہندو میں سکھ کو دھڑکتے پھرتے۔

ہندو کی اس اپنائیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دوسرے دھرم کو اپنا لیتا ہے کہ اس کی انفرادیت ختم ہو کر وہ جلتی ہے لیکن خود ہندو پر آمچ نہیں آتی۔ وہ دوسروں کو جذب کر لیتا ہے خود جذب نہیں ہوتا۔ وہ اس لئے اپنا تاک ہے کہ خود کو تقویت دے دوسرے کو کمزور کر کے رکھ دے۔

ہندو کو مسلمان سے شکایت ہے کہ وہ سالہا سال ہندو کے ساتھ رہا۔ اس قدر قریب جیسے بھائی بندہ ہوتے ہیں لیکن ہندو اسے جذب نہ کر سکا۔ اسے یہ کیا شے ہے جو ہندو دیکھ میں آتی دیر آج پر پڑی رہی لیکن گلی ضمیمہ۔ ایسا کو کڑو کبھی دیکھنے میں ضمیمہ آیا۔ ہم نے انہیں لاکھ لپٹا لیکن یہ ہم میں جذب نہ ہوئے۔ حالانکہ سکھوں کی طرح مسلمانوں میں کوئی خصوصی جہلتی پہچان بھی ضمیمہ تھی پھر بھی یہ الگ نظر آتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اب ایک لپٹا ملک پاکستان قائم کر کے بندھے گئے ہیں۔ صاحبو میں ہندو کے غصے سے ضمیمہ ڈرتا حالانکہ میں نے تقسیم کے وقت اس کا راکششی روپ دیکھا ہے۔ میں ہندو کے پیار سے ڈرتا ہوں۔

بندہ جانے سے گریز کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ڈرتا تھا لپٹا جانے سے۔ ڈرتا تھا سر آنکھوں پر بھائے جانے سے۔ میں ایک کمزور آدمی ہوں مجھ میں اخلاقی مضبوطی ضمیمہ ہے۔ اگر کوئی دونوں ہاتھ جوڑ کر کمال جھڑپ کے مدارج ہم تو ایک ہیں اور بارڈر کی یہ کلیئر جو ہمیں جدا کرتی ہے بھولی ہے۔ میں اسے یہ ضمیمہ کہہ سکتا کہ ضمیمہ مدارج میں آپ میں سے ضمیمہ ہوں۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ ہمارے رہن سہن الگ ہیں۔

جب میں نے ہند جانے کا فیصلہ کیا تو ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ میں کسی ادبی محفل میں شریک ضمیمہ ہوں گا۔ کسی ہندو قلم کار بھائی سے ضمیمہ ملوں گا۔ میل ملاپ ویسے بھی میری شخصیت سے ہم آہنگ ضمیمہ ہے۔ میں پیدا انٹی طور پر ایک چھوٹا اور اکلیا آدمی ہوں۔ مجھے گنتا سی ہند ہے۔

لیکن اگلے روز ہی جب میں مدافنی سر فرنا کے گھر ایک تقریب پر گیا تو دیکھا کہ بھانڈہ چھوٹ چکا ہے۔ اور میرے ہند جانے کی خبریں وہاں ابھی جبکہ پہنچ چکی ہے۔

منصور قیصر لا۔ "ملتی صاحب مہارک ہو"

"میں بات کی تھی نے پوچھا۔

"بھتی ہند جا رہے ہو"

"ضمیمہ میں نے کہا"

"اٹلہ میں نام بھپ چکا ہے۔ لہٰذا میں اور والوں نے دائروں کی فہرست چھوڑ دی

ہے۔" اختر امان بولا۔

"مخل نہ کرو یاد۔" میں نے ہاتھ ٹالنے کی کوشش کی۔

"بچی۔" سداغنی سرفراز بولی۔

ادھر سے غٹایا دہولا، ادھر سے مظہر کی آواز سنائی دی۔ اس پر فراز نے تھپ۔

لگایا۔

سداغنی محفل چہ بیٹکونیاں کرنے لگی۔

منصور قیصر کہنے لگا۔ "مفتی جی میں نے تو منیر شیخ کو بھی لکھ دیا ہے۔"

"نظر تو سوسے تو آپ ملیں گے ہی۔" مظہر ہنسا۔

میں نے ہاں محسوس کیا جیسے میری شیا ہی ڈوب گئی ہو۔

ہشیدہ باش

اچھے روز جج آفس سے ایک خط موصول ہوا۔ جس نے جلتی پر تیل ڈال دیا۔

اس خط میں ہندو کے دورے کا پروگرام مطلق تھا۔ ساتھ ہی لکھا تھا کہ وہاں کسی محفل میں شرکت سے گریز کیا جائے۔ کسی مجلسی تقریب میں شمولیت نہ کی جائے ورنہ وفد کا لیڈر مجاز ہو گا کہ آپ کو بلیک لسٹ کر دے۔ اس صورت میں مستقبل میں آپ ہندو میں کسی زیارت پر جانے کے نااہل قرار دے دیئے جائیں گے۔

والہ۔ جواب نہیں۔ میں نے سوچا۔ خود ہی تفسیر کرتے ہیں پھر خود ہی دامن تر مکین ہشیدہ باش کا مشورہ دیتے ہیں۔۔۔ خبردار بھی کرتے ہیں۔ تاوجہ ٹکروائی کی دھمکس بھی دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کٹر اور بے بس کا قصہ بہت شدید ہوتا ہے۔ میں نے دل مضبوط کرنے کے لئے جج آفس کو ایک خط لکھا۔

علی جاہ۔ ڈائریکٹ کے نام انہد میں تفسیر کرنے کی کیا ضرورت تھی بھلا۔ اس طرح جانے پہچانے لوگوں کے لئے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر آپ ڈانٹتے بھی ہیں کہ خبردار دامن تر نہ ہو اور جناب والا! ڈائریکٹ کے ہر وفد میں ایک نایک جانا پہچانا فرد تو ہوتا ہی ہے۔ انہ کے واسطے انہد میں ڈائریکٹ کے نام تفسیر کرنے کی رسم بند کر دیجئے۔

ہے بس آدمی کو غصہ ملنا کرنے کے لئے بھی حق بجانب کہتی ہے۔ ”
مجھے یقین ہے میرا وہ خط آج بھی راج دفتر کے کسی نوٹے ہوئے وہ نوٹ جس کسمپرسی کی
حالت میں پڑا ہو گا اشفاق حسین ہر حال بہت خوش تھا کہ چند چاہنے کی بات لیکن کئی ہو گئی
لیکن ساتھ ہی وہ سخت گھبرایا ہوا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ ” (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) (۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰)

کیسا قلابی بیماری

”...“ (۲۱) (۲۲) (۲۳) (۲۴) (۲۵) (۲۶) (۲۷) (۲۸) (۲۹) (۳۰) (۳۱) (۳۲) (۳۳) (۳۴) (۳۵) (۳۶) (۳۷) (۳۸) (۳۹) (۴۰) (۴۱) (۴۲) (۴۳) (۴۴) (۴۵) (۴۶) (۴۷) (۴۸) (۴۹) (۵۰) (۵۱) (۵۲) (۵۳) (۵۴) (۵۵) (۵۶) (۵۷) (۵۸) (۵۹) (۶۰) (۶۱) (۶۲) (۶۳) (۶۴) (۶۵) (۶۶) (۶۷) (۶۸) (۶۹) (۷۰) (۷۱) (۷۲) (۷۳) (۷۴) (۷۵) (۷۶) (۷۷) (۷۸) (۷۹) (۸۰) (۸۱) (۸۲) (۸۳) (۸۴) (۸۵) (۸۶) (۸۷) (۸۸) (۸۹) (۹۰) (۹۱) (۹۲) (۹۳) (۹۴) (۹۵) (۹۶) (۹۷) (۹۸) (۹۹) (۱۰۰) (۱۰۱) (۱۰۲) (۱۰۳) (۱۰۴) (۱۰۵) (۱۰۶) (۱۰۷) (۱۰۸) (۱۰۹) (۱۱۰) (۱۱۱) (۱۱۲) (۱۱۳) (۱۱۴) (۱۱۵) (۱۱۶) (۱۱۷) (۱۱۸) (۱۱۹) (۱۲۰) (۱۲۱) (۱۲۲) (۱۲۳) (۱۲۴) (۱۲۵) (۱۲۶) (۱۲۷) (۱۲۸) (۱۲۹) (۱۳۰) (۱۳۱) (۱۳۲) (۱۳۳) (۱۳۴) (۱۳۵) (۱۳۶) (۱۳۷) (۱۳۸) (۱۳۹) (۱۴۰) (۱۴۱) (۱۴۲) (۱۴۳) (۱۴۴) (۱۴۵) (۱۴۶) (۱۴۷) (۱۴۸) (۱۴۹) (۱۵۰) (۱۵۱) (۱۵۲) (۱۵۳) (۱۵۴) (۱۵۵) (۱۵۶) (۱۵۷) (۱۵۸) (۱۵۹) (۱۶۰) (۱۶۱) (۱۶۲) (۱۶۳) (۱۶۴) (۱۶۵) (۱۶۶) (۱۶۷) (۱۶۸) (۱۶۹) (۱۷۰) (۱۷۱) (۱۷۲) (۱۷۳) (۱۷۴) (۱۷۵) (۱۷۶) (۱۷۷) (۱۷۸) (۱۷۹) (۱۸۰) (۱۸۱) (۱۸۲) (۱۸۳) (۱۸۴) (۱۸۵) (۱۸۶) (۱۸۷) (۱۸۸) (۱۸۹) (۱۹۰) (۱۹۱) (۱۹۲) (۱۹۳) (۱۹۴) (۱۹۵) (۱۹۶) (۱۹۷) (۱۹۸) (۱۹۹) (۲۰۰) (۲۰۱) (۲۰۲) (۲۰۳) (۲۰۴) (۲۰۵) (۲۰۶) (۲۰۷) (۲۰۸) (۲۰۹) (۲۱۰) (۲۱۱) (۲۱۲) (۲۱۳) (۲۱۴) (۲۱۵) (۲۱۶) (۲۱۷) (۲۱۸) (۲۱۹) (۲۲۰) (۲۲۱) (۲۲۲) (۲۲۳) (۲۲۴) (۲۲۵) (۲۲۶) (۲۲۷) (۲۲۸) (۲۲۹) (۲۳۰) (۲۳۱) (۲۳۲) (۲۳۳) (۲۳۴) (۲۳۵) (۲۳۶) (۲۳۷) (۲۳۸) (۲۳۹) (۲۴۰) (۲۴۱) (۲۴۲) (۲۴۳) (۲۴۴) (۲۴۵) (۲۴۶) (۲۴۷) (۲۴۸) (۲۴۹) (۲۵۰) (۲۵۱) (۲۵۲) (۲۵۳) (۲۵۴) (۲۵۵) (۲۵۶) (۲۵۷) (۲۵۸) (۲۵۹) (۲۶۰) (۲۶۱) (۲۶۲) (۲۶۳) (۲۶۴) (۲۶۵) (۲۶۶) (۲۶۷) (۲۶۸) (۲۶۹) (۲۷۰) (۲۷۱) (۲۷۲) (۲۷۳) (۲۷۴) (۲۷۵) (۲۷۶) (۲۷۷) (۲۷۸) (۲۷۹) (۲۸۰) (۲۸۱) (۲۸۲) (۲۸۳) (۲۸۴) (۲۸۵) (۲۸۶) (۲۸۷) (۲۸۸) (۲۸۹) (۲۹۰) (۲۹۱) (۲۹۲) (۲۹۳) (۲۹۴) (۲۹۵) (۲۹۶) (۲۹۷) (۲۹۸) (۲۹۹) (۳۰۰) (۳۰۱) (۳۰۲) (۳۰۳) (۳۰۴) (۳۰۵) (۳۰۶) (۳۰۷) (۳۰۸) (۳۰۹) (۳۱۰) (۳۱۱) (۳۱۲) (۳۱۳) (۳۱۴) (۳۱۵) (۳۱۶) (۳۱۷) (۳۱۸) (۳۱۹) (۳۲۰) (۳۲۱) (۳۲۲) (۳۲۳) (۳۲۴) (۳۲۵) (۳۲۶) (۳۲۷) (۳۲۸) (۳۲۹) (۳۳۰) (۳۳۱) (۳۳۲) (۳۳۳) (۳۳۴) (۳۳۵) (۳۳۶) (۳۳۷) (۳۳۸) (۳۳۹) (۳۴۰) (۳۴۱) (۳۴۲) (۳۴۳) (۳۴۴) (۳۴۵) (۳۴۶) (۳۴۷) (۳۴۸) (۳۴۹) (۳۵۰) (۳۵۱) (۳۵۲) (۳۵۳) (۳۵۴) (۳۵۵) (۳۵۶) (۳۵۷) (۳۵۸) (۳۵۹) (۳۶۰) (۳۶۱) (۳۶۲) (۳۶۳) (۳۶۴) (۳۶۵) (۳۶۶) (۳۶۷) (۳۶۸) (۳۶۹) (۳۷۰) (۳۷۱) (۳۷۲) (۳۷۳) (۳۷۴) (۳۷۵) (۳۷۶) (۳۷۷) (۳۷۸) (۳۷۹) (۳۸۰) (۳۸۱) (۳۸۲) (۳۸۳) (۳۸۴) (۳۸۵) (۳۸۶) (۳۸۷) (۳۸۸) (۳۸۹) (۳۹۰) (۳۹۱) (۳۹۲) (۳۹۳) (۳۹۴) (۳۹۵) (۳۹۶) (۳۹۷) (۳۹۸) (۳۹۹) (۴۰۰) (۴۰۱) (۴۰۲) (۴۰۳) (۴۰۴) (۴۰۵) (۴۰۶) (۴۰۷) (۴۰۸) (۴۰۹) (۴۱۰) (۴۱۱) (۴۱۲) (۴۱۳) (۴۱۴) (۴۱۵) (۴۱۶) (۴۱۷) (۴۱۸) (۴۱۹) (۴۲۰) (۴۲۱) (۴۲۲) (۴۲۳) (۴۲۴) (۴۲۵) (۴۲۶) (۴۲۷) (۴۲۸) (۴۲۹) (۴۳۰) (۴۳۱) (۴۳۲) (۴۳۳) (۴۳۴) (۴۳۵) (۴۳۶) (۴۳۷) (۴۳۸) (۴۳۹) (۴۴۰) (۴۴۱) (۴۴۲) (۴۴۳) (۴۴۴) (۴۴۵) (۴۴۶) (۴۴۷) (۴۴۸) (۴۴۹) (۴۵۰) (۴۵۱) (۴۵۲) (۴۵۳) (۴۵۴) (۴۵۵) (۴۵۶) (۴۵۷) (۴۵۸) (۴۵۹) (۴۶۰) (۴۶۱) (۴۶۲) (۴۶۳) (۴۶۴) (۴۶۵) (۴۶۶) (۴۶۷) (۴۶۸) (۴۶۹) (۴۷۰) (۴۷۱) (۴۷۲) (۴۷۳) (۴۷۴) (۴۷۵) (۴۷۶) (۴۷۷) (۴۷۸) (۴۷۹) (۴۸۰) (۴۸۱) (۴۸۲) (۴۸۳) (۴۸۴) (۴۸۵) (۴۸۶) (۴۸۷) (۴۸۸) (۴۸۹) (۴۹۰) (۴۹۱) (۴۹۲) (۴۹۳) (۴۹۴) (۴۹۵) (۴۹۶) (۴۹۷) (۴۹۸) (۴۹۹) (۵۰۰) (۵۰۱) (۵۰۲) (۵۰۳) (۵۰۴) (۵۰۵) (۵۰۶) (۵۰۷) (۵۰۸) (۵۰۹) (۵۱۰) (۵۱۱) (۵۱۲) (۵۱۳) (۵۱۴) (۵۱۵) (۵۱۶) (۵۱۷) (۵۱۸) (۵۱۹) (۵۲۰) (۵۲۱) (۵۲۲) (۵۲۳) (۵۲۴) (۵۲۵) (۵۲۶) (۵۲۷) (۵۲۸) (۵۲۹) (۵۳۰) (۵۳۱) (۵۳۲) (۵۳۳) (۵۳۴) (۵۳۵) (۵۳۶) (۵۳۷) (۵۳۸) (۵۳۹) (۵۴۰) (۵۴۱) (۵۴۲) (۵۴۳) (۵۴۴) (۵۴۵) (۵۴۶) (۵۴۷) (۵۴۸) (۵۴۹) (۵۵۰) (۵۵۱) (۵۵۲) (۵۵۳) (۵۵۴) (۵۵۵) (۵۵۶) (۵۵۷) (۵۵۸) (۵۵۹) (۵۶۰) (۵۶۱) (۵۶۲) (۵۶۳) (۵۶۴) (۵۶۵) (۵۶۶) (۵۶۷) (۵۶۸) (۵۶۹) (۵۷۰) (۵۷۱) (۵۷۲) (۵۷۳) (۵۷۴) (۵۷۵) (۵۷۶) (۵۷۷) (۵۷۸) (۵۷۹) (۵۸۰) (۵۸۱) (۵۸۲) (۵۸۳) (۵۸۴) (۵۸۵) (۵۸۶) (۵۸۷) (۵۸۸) (۵۸۹) (۵۹۰) (۵۹۱) (۵۹۲) (۵۹۳) (۵۹۴) (۵۹۵) (۵۹۶) (۵۹۷) (۵۹۸) (۵۹۹) (۶۰۰) (۶۰۱) (۶۰۲) (۶۰۳) (۶۰۴) (۶۰۵) (۶۰۶) (۶۰۷) (۶۰۸) (۶۰۹) (۶۱۰) (۶۱۱) (۶۱۲) (۶۱۳) (۶۱۴) (۶۱۵) (۶۱۶) (۶۱۷) (۶۱۸) (۶۱۹) (۶۲۰) (۶۲۱) (۶۲۲) (۶۲۳) (۶۲۴) (۶۲۵) (۶۲۶) (۶۲۷) (۶۲۸) (۶۲۹) (۶۳۰) (۶۳۱) (۶۳۲) (۶۳۳) (۶۳۴) (۶۳۵) (۶۳۶) (۶۳۷) (۶۳۸) (۶۳۹) (۶۴۰) (۶۴۱) (۶۴۲) (۶۴۳) (۶۴۴) (۶۴۵) (۶۴۶) (۶۴۷) (۶۴۸) (۶۴۹) (۶۵۰) (۶۵۱) (۶۵۲) (۶۵۳) (۶۵۴) (۶۵۵) (۶۵۶) (۶۵۷) (۶۵۸) (۶۵۹) (۶۶۰) (۶۶۱) (۶۶۲) (۶۶۳) (۶۶۴) (۶۶۵) (۶۶۶) (۶۶۷) (۶۶۸) (۶۶۹) (۶۷۰) (۶۷۱) (۶۷۲) (۶۷۳) (۶۷۴) (۶۷۵) (۶۷۶) (۶۷۷) (۶۷۸) (۶۷۹) (۶۸۰) (۶۸۱) (۶۸۲) (۶۸۳) (۶۸۴) (۶۸۵) (۶۸۶) (۶۸۷) (۶۸۸) (۶۸۹) (۶۹۰) (۶۹۱) (۶۹۲) (۶۹۳) (۶۹۴) (۶۹۵) (۶۹۶) (۶۹۷) (۶۹۸) (۶۹۹) (۷۰۰) (۷۰۱) (۷۰۲) (۷۰۳) (۷۰۴) (۷۰۵) (۷۰۶) (۷۰۷) (۷۰۸) (۷۰۹) (۷۱۰) (۷۱۱) (۷۱۲) (۷۱۳) (۷۱۴) (۷۱۵) (۷۱۶) (۷۱۷) (۷۱۸) (۷۱۹) (۷۲۰) (۷۲۱) (۷۲۲) (۷۲۳) (۷۲۴) (۷۲۵) (۷۲۶) (۷۲۷) (۷۲۸) (۷۲۹) (۷۳۰) (۷۳۱) (۷۳۲) (۷۳۳) (۷۳۴) (۷۳۵) (۷۳۶) (۷۳۷) (۷۳۸) (۷۳۹) (۷۴۰) (۷۴۱) (۷۴۲) (۷۴۳) (۷۴۴) (۷۴۵) (۷۴۶) (۷۴۷) (۷۴۸) (۷۴۹) (۷۵۰) (۷۵۱) (۷۵۲) (۷۵۳) (۷۵۴) (۷۵۵) (۷۵۶) (۷۵۷) (۷۵۸) (۷۵۹) (۷۶۰) (۷۶۱) (۷۶۲) (۷۶۳) (۷۶۴) (۷۶۵) (۷۶۶) (۷۶۷) (۷۶۸) (۷۶۹) (۷۷۰) (۷۷۱) (۷۷۲) (۷۷۳) (۷۷۴) (۷۷۵) (۷۷۶) (۷۷۷) (۷۷۸) (۷۷۹) (۷۸۰) (۷۸۱) (۷۸۲) (۷۸۳) (۷۸۴) (۷۸۵) (۷۸۶) (۷۸۷) (۷۸۸) (۷۸۹) (۷۹۰) (۷۹۱) (۷۹۲) (۷۹۳) (۷۹۴) (۷۹۵) (۷۹۶) (۷۹۷) (۷۹۸) (۷۹۹) (۸۰۰) (۸۰۱) (۸۰۲) (۸۰۳) (۸۰۴) (۸۰۵) (۸۰۶) (۸۰۷) (۸۰۸) (۸۰۹) (۸۱۰) (۸۱۱) (۸۱۲) (۸۱۳) (۸۱۴) (۸۱۵) (۸۱۶) (۸۱۷) (۸۱۸) (۸۱۹) (۸۲۰) (۸۲۱) (۸۲۲) (۸۲۳) (۸۲۴) (۸۲۵) (۸۲۶) (۸۲۷) (۸۲۸) (۸۲۹) (۸۳۰) (۸۳۱) (۸۳۲) (۸۳۳) (۸۳۴) (۸۳۵) (۸۳۶) (۸۳۷) (۸۳۸) (۸۳۹) (۸۴۰) (۸۴۱) (۸۴۲) (۸۴۳) (۸۴۴) (۸۴۵) (۸۴۶) (۸۴۷) (۸۴۸) (۸۴۹) (۸۵۰) (۸۵۱) (۸۵۲) (۸۵۳) (۸۵۴) (۸۵۵) (۸۵۶) (۸۵۷) (۸۵۸) (۸۵۹) (۸۶۰) (۸۶۱) (۸۶۲) (۸۶۳) (۸۶۴) (۸۶۵) (۸۶۶) (۸۶۷) (۸۶۸) (۸۶۹) (۸۷۰) (۸۷۱) (۸۷۲) (۸۷۳) (۸۷۴) (۸۷۵) (۸۷۶) (۸۷۷) (۸۷۸) (۸۷۹) (۸۸۰) (۸۸۱) (۸۸۲) (۸۸۳) (۸۸۴) (۸۸۵) (۸۸۶) (۸۸۷) (۸۸۸) (۸۸۹) (۸۹۰) (۸۹۱) (۸۹۲) (۸۹۳) (۸۹۴) (۸۹۵) (۸۹۶) (۸۹۷) (۸۹۸) (۸۹۹) (۹۰۰) (۹۰۱) (۹۰۲) (۹۰۳) (۹۰۴) (۹۰۵) (۹۰۶) (۹۰۷) (۹۰۸) (۹۰۹) (۹۱۰) (۹۱۱) (۹۱۲) (۹۱۳) (۹۱۴) (۹۱۵) (۹۱۶) (۹۱۷) (۹۱۸) (۹۱۹) (۹۲۰) (۹۲۱) (۹۲۲) (۹۲۳) (۹۲۴) (۹۲۵) (۹۲۶) (۹۲۷) (۹۲۸) (۹۲۹) (۹۳۰) (۹۳۱) (۹۳۲) (۹۳۳) (۹۳۴) (۹۳۵) (۹۳۶) (۹۳۷) (۹۳۸) (۹۳۹) (۹۴۰) (۹۴۱) (۹۴۲) (۹۴۳) (۹۴۴) (۹۴۵) (۹۴۶) (۹۴۷) (۹۴۸) (۹۴۹) (۹۵۰) (۹۵۱) (۹۵۲) (۹۵۳) (۹۵۴) (۹۵۵) (۹۵۶) (۹۵۷) (۹۵۸) (۹۵۹) (۹۶۰) (۹۶۱) (۹۶۲) (۹۶۳) (۹۶۴) (۹۶۵) (۹۶۶) (۹۶۷) (۹۶۸) (۹۶۹) (۹۷۰) (۹۷۱) (۹۷۲) (۹۷۳) (۹۷۴) (۹۷۵) (۹۷۶) (۹۷۷) (۹۷۸) (۹۷۹) (۹۸۰) (۹۸۱) (۹۸۲) (۹۸۳) (۹۸۴) (۹۸۵) (۹۸۶) (۹۸۷) (۹۸۸) (۹۸۹) (۹۹۰) (۹۹۱) (۹۹۲) (۹۹۳) (۹۹۴) (۹۹۵) (۹۹۶) (۹۹۷) (۹۹۸) (۹۹۹) (۱۰۰۰)

اور اصل وہ بیمار تھا۔ اس کی بیماری بڑی پر اسرار تھی۔
ہو یہ مرضی جانتے سے پہلے ہم سمجھتے تھے کہ بیماری ایک سادہ مزاج اور صاف گو
کیفیت ہے۔ وہ آتے ہی لارم بھگتی ہے۔ یا تو درد شروع ہو جاتا ہے یا بخار آنے لگا
ہے۔

اس لارم نے بیماری کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرد کو سمجھو ڈکر چکائے۔ بھائی تمہارے
جسم میں کوئی خرابی ہے۔ اس کی طرف توجہ کرو اپنا علاج کرو اور اچھے ہو جاؤ۔
پھر ہم علاج کے پاس چلتے ہیں تو وہ پیچھے سے اس کے کان میں کہہ دیتی ہے، میں
قلاں بیماری ہوں، میرا نام یہ ہے۔ جسم کے قلاں عضو کی خرابی کی وجہ سے میں نازل ہوئی
ہوں۔

ہو یہ مرضی پڑنے کے بعد یہ چلا کہ بیماری اتنی سادہ مزاج اور صاف گو نہیں ہوتی
بلکہ عورت کی طرح اپنا کہہ دیتی ہے۔ مجھے کہیں ہوتی ہے اشد سے کسی اور جگہ کی جانب
کے جاتی ہے تاکہ بیماری توجہ کج مقام کی طرف مبذول نہ ہو۔ ایسا زمانہ مزاج پایا ہے کہ چلا
دا کر دے بھگتی ہے۔ خود کو کیسا کھانا کرتے ہیں اس کا جواب نہیں۔ مثلاً

میرا دوست احمد بیچہ کچھ دیر سے بیمار ہے۔ اس کی بیماری کے کوئی ملاحظہ ہوں۔
سداوتوں وہ بڑا خوش باش رہتا ہے۔ پڑھتا ہے، لکھتا ہے، کھاتا ہے، چتا ہے، سی
چاہے تو پھر بھی ہے۔ دیکھوں میں کھلی ہوتا ہے۔ دیکھتے ہیں اس گناہ ہے جیسے صحبت
مندی کا نمونہ ہو۔

رات کو زینہ کے ساتھ طہریں کھینا ہے، کپ لگاتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔ رات کو جب رات کا ایک بجتا ہے تو بھاری کمین گاہ سے نکل کر اپنا دھو تو بہلاتی ہے۔
 انہیں کی ڈاج سے بیٹ پھڑکا ہوتا ہے۔ پھر ڈاکڑ آئے شروع ہو جاتے ہیں۔ خاصوش نہیں کھلم ڈاکڑ۔ بڑا دم۔ بڑا دم۔
 ڈاکڑ والے جاگ اٹھتے ہیں۔ ڈاکڑ والے کھیرا چاہتے ہیں۔ یہ کھیرا بھلا کج رہا ہے۔ ڈاکڑ والے کھیرا کھاتے ہیں۔ ڈاکڑ والے کھیرا کھاتے ہیں۔ ڈاکڑ والے کھیرا کھاتے ہیں۔

انہو بیڑوں دوران میں یوں ابھرتا ہے جیسے کسی دھنکی کی زد میں آ گیا ہو۔
 خلیج بچے نکلے۔ بل رنگ بھارت ہے ہر دم چڑ جاتا ہے اور وہ سو جاتا ہے۔
 صبح آٹھ بجے جب وہ جاگتا ہے تو یوں جیسے سو فیصد صحت مند ہوں۔ تکلیف کی کوئی بات ہی نہ ہو۔ سارا دن خوش رہتا ہے۔ خلیج کو اگلی رات پھر ایک بجے بھاری کا گھو کو جاتا ہے۔ اور پھر وہی بڑا دم۔ بڑا دم۔ بڑا دم۔

بھری ایک عزیز ہے۔ ابو ہر مہر کی خاتون ہیں۔ سارا دن وہ بھری خاتون ہیں۔ بڑے شوق سے اپنی بساط سے زیادہ کام کرتی ہیں۔ رات کو تھک کر سو جاتی ہیں۔
 صبح سویرے جب وہ جاگتی ہیں تو یوں محسوس کرتی ہیں جیسے جسم میں جان نہ ہو۔ نا طاقی اور سردی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جیسے دو دن سے مرنے ہوئی ہوں۔ جسم ٹوٹ ہو چکا ہو۔ صرف روح باقی رہ گئی ہو۔ گھر والے دیر دہی ان کے منہ میں چائے کے چند گھونٹ ڈالتے ہیں۔ پھر اجابت محسوس ہوتی ہے۔ دیشیں کھینٹ کھینٹ کر ہاتھ روم میں لے جاتی ہیں۔

دو تین مرتبہ اسہال کی صورت اجابت ہوتی ہے۔ پھر جسم میں پھر سے زندگی کی کرنٹ چلنے لگتی ہے۔ سردہ جسم میں جان چڑ جاتی ہے۔ وہ آٹھ تھنٹی ہیں اور پھر بڑے ذہن شوق سے بھری خاتون کے کام میں یوں بہت جلتی ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے انہیں کوئی تکلیف ہی نہ ہو۔ خلیج کو اگلی صبح پھر وہی دو گھنٹے کی سردی انہیں آ رہی ہے۔

یہ کہیں بھاری ہے۔ دو گھنٹے کی موت اور پھر ۲۲ گھنٹے کی بھرپور زندگی۔
 جوں جوں ہمیں مرض اور مریضوں سے واسطہ پڑ رہا ہے توں توں بھاری کے لوگ اور حیرت انگیز روپ سامنے آ رہے ہیں۔

بہارِ معالج

اشفاق حسین کی بیماری بھی خود کو دیکھنا علاج کئے بغیر تھی کہ گیس ڈانکوسز ہو جائے۔ بعید نہ کھل جائے۔

اشفاق حسین کے سر میں کوئی جانور چسپا بیٹھا تھا۔ وہ بچہ مارتا تھا۔ جو نہی بچہ لگتا۔ مدے جسم کی خٹائیں ڈھیلی پڑ جاتیں۔ جان نکل جاتی اور پیچھے دھڑکی دھڑکی رہ جاتا۔ اشفاق حسین نے اپنے گھر میں خیراتی مطب کھول رکھا ہے۔ مریض آتے ہیں دوا کھاتے ہیں۔ پرانے امراض ۶۰ فی صد ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسے اپنے مرض کا پتہ نہیں چلتا۔ بڑی کوشش سے اپنے سپیشل لکھتا ہے۔ کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ دواؤں کی خاصیتیں دیکھتا ہے۔ دواؤں کھاتا ہے۔ لیکن ہر دوا تکلیف دہ ہوا رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے سر میں بچہ مارنے والا جانور فیسے میں آ جاتا ہے علاج مست کر دیا وہ خیراتہ ہو گئے۔

پندرہ ایک درویش صفت دوست کو گیس سے آئے تھے۔ اشفاق حسین کی بیماری کے کوائف سن کر مسکرائے۔ بولے۔ بوالہ کے نام پر لوگوں میں شفا ہانتا ہے۔ وہ خود صحت مند نہیں رہ سکتا۔

اسے تو صحت مند رہنا چاہئے تاکہ زیادہ خدمت کر سکے۔ میں نے کہا یہ تو انہی بات ہوئی۔

وہ مسکرائے۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ چاہے انہی چٹائے چاہے سیدھی۔ اسے کون پوچھ سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ بیماری رست ہو۔

”بیماری۔ رست ہو؟“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”اللہ تعالیٰ کسی کے ہاتھ میں شفا بخش دیں تو یہ امکان بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ معالج کے دل میں شوکت ٹپس پیدا ہو جائے کہ میری دوا سے شفا ہو رہی ہے۔ اگر معالج کو ایک بیماری لگ جائے جو دور نہ ہو تو اسے ہر وقت احساس رہتا ہے کہ میری تجویز شدہ دوا کچھ بھی نہیں۔“

غیر چاہے کوئی بھی وجہ ہو اشفاق حسین گذشتہ چھ ماہ سے بیمار تھا اور چونکہ وہ طبی طور پر ایک محتاط معالج کی ذہنیت کا مالک ہے۔ اس لئے اس نے چھ ماہ سے احتیاطی تدبیریں عمل

میں لارنگھی ہیں۔

چار مہینے سے وہ مسلسل دو وقت اہلا ہوا کدو کھا رہا ہے جس میں نہ کھجی ہوتا ہے، نہ نمک۔ ناشتے میں وہ صرف دہی کھاتا ہے۔

بے شک اسے بند جانے پر بہت خوشی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اسے اپنی غذائی احتیاط کا فکر وسیکھر تھا۔ کیا سفودہ اپنی احتیاطیں قائم رکھ سکے گا۔ سفر کی دقتیں برداشت کر سکے گا۔ دلی پہنچ کر چل پھر سکے گا۔ اور اگر سر کے چبہ ہار نے شرارت کی تو کیا ہو گا۔

بہر طور یہ تھا میرا ہم سفر۔ احتیاطوں کی گھڑی۔ ایمینٹوں کا پلندہ۔ کچج کے گھاس کی طرح بڑک۔ فھو کر کھانے کے خوف میں ہٹا۔

اس سفر میں ہم دونوں ساتھی تھے۔ اشفاق حسین اور میں۔

میں رہا کرتا تھا۔

جب وہ رات کو سو گیا تو اس نے سوچا کہ میں نے کیا کیا ہے۔

جب وہ صبح سویرے اٹھا تو اس نے سوچا کہ

میں نے کیا کیا ہے۔ جب وہ رات کو سو گیا تو اس نے سوچا کہ

میں نے کیا کیا ہے۔ جب وہ صبح سویرے اٹھا تو اس نے سوچا کہ

میں نے کیا کیا ہے۔ جب وہ رات کو سو گیا تو اس نے سوچا کہ

میں نے کیا کیا ہے۔ جب وہ صبح سویرے اٹھا تو اس نے سوچا کہ

میں نے کیا کیا ہے۔ جب وہ رات کو سو گیا تو اس نے سوچا کہ

میں نے کیا کیا ہے۔ جب وہ صبح سویرے اٹھا تو اس نے سوچا کہ

روانگی

ہدایات کے مطابق تمام وزٹریں کولابور میں سترہ اگست کی صبح ۸ بجے دانا کے دربار میں اکٹھے ہونا تھا۔

۸ بجے ہم دانا کے دربار پہنچ گئے۔

بھیڑ بکریاں

اشفاق حسین کاخیل تھا کہ دربار کے باہر جج دفتر کا نمائندہ جہڑی رلو دیکھ رہا ہو گا۔

تاکہ ہمیں ہدایات دے سکے فلاں جگہ آپ اپنا سامان رکھ دیں۔ فلاں جگہ تشریف رکھیں۔

اپنے نام جہڑے کارکنوں کو کھنکھوا دیں۔ اس سے اپنے نمبر چھ لیں تاکہ آئندہ حوالے میں

آسانی ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس کاخیل تھا کہ اگر نمائندہ نہ ہوا تو دربار سے باہر نمایاں جگہ پر

ایک بڑا سا بورڈ لگا ہو گا۔ جس پر جلی حروف میں ہدایات درج ہوں گی۔

دانا کے دربار کے صدر دروازے پر نہ کوئی پورڈ لگا ہوا تھا نہ ہی کوئی نمائندہ کھڑا

وزٹریں کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”لب پولو“۔

وہ کہنے لگا۔ ”تمہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کوئی نا کوئی انتظام تو ہو گا۔ اتنی بڑی

وزارت کا انتظام ہے۔ اتنے بڑے جگے کا کام ہے۔ لگا بڑا احتیاج رہا ہے۔ ہمیں تو بے

وزٹریں ہیں، دو چار نہیں۔ کیا انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح چھوڑ دیا جائے گا کہ اپنا راستہ خود

حلاش کریں۔

در اصل اشفاق حسین ایک آئیڈلیسٹ ہے۔ وہ باقاعدگی اصول اور قانون کا دلدادہ ہے۔ وہ RIGHTS کی دنیا میں رہتا ہے کہ یوں ہونا چاہئے۔ جیڑا یوں ہو گا۔ لازماً ہو گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو بالکل غلط بات ہے اس پر شک بات ہے۔ یہ اس چونکہ عام طور پر دیا نہیں ہوتا جیسا وہ سمجھتا ہے کہ ہونا چاہئے، اس لئے یہ اس کے لئے باعث تکلیف ہوتا ہے اور بار بار تکلیف میں مبتلا رہ کر وہ اپنی صحت بگاڑ لیتا ہے۔

میں نے اس کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سبوں کے قصود پر خود کو سزا دے۔ میں نے خود کو کبھی رکھنے کے لئے یہ اصول بتا رکھا ہے کہ جو ہونا چاہئے اس کی توقع نہ رکھو۔ اگر نہ ہو تو غم نہیں ہو گا۔ ہو جائے تو مفت کی خوشی ہے۔

اس کے برعکس اشفاق حسین نے بہت توقعات استوار کر رکھی ہیں۔ جو ہونا چاہئے اگر وہ نہ ہو تو ایسے دکھ ہوتا ہے اور اگر ہو بھی جائے تو بھی اسے خوشی نہیں ہوتی۔ چونکہ پھر وہ اس کی تفصیلات پر غور مبنی شروع کر دیتا ہے۔ اگر یہ تفصیل یوں ہوتی تو بہتر رہتا۔ اگر وہ بات اس طریقے پر منظم کی جاتی تو مناسب رہتا۔ ہر صورت میں وہ انتقالات میں کھڑے نکلتا ہے۔ لہذا اس کے لئے زندگی میں خوشی حاصل کرنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ یا شاید جان بوجھ کر اس نے اہتمام کر رکھا ہو کہ زندگی میں خوشی حاصل ہونے کے امکانات پیدا نہ ہو جائیں۔

انارے ساتھی نذیر قیس نے کہا۔ یاد اندر چلو۔ چونکہ دربار میں منہج کے قریب کچھ لوگ سناٹے لئے بیٹھے ہیں۔ خرد کی بات ہے کہ وہ دائر ہوں گے۔ کیونکہ دربار میں سناٹا کا کیا کام۔

ہم نے سناٹا اٹھایا اور دربار کے اندر جا کر بیٹھ گئے۔ وہیں دوسرے لوگوں سے پوچھا۔ کیوں جنت آپ امیر خسرو کے دائر ہیں۔

”جی“ انہوں نے جواب دیا۔

”کیا پوچھ گچھ ام ہے“

”کیا پتہ“ وہ بولے، ”شاید ہو۔ یہاں کوئی تانے والا نہیں ہے۔“

"یہاں کوئی مختلم نہیں کیا؟"

"ایک آدمی ہے جو نام لکھ رہا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح لاعلم ہے۔"

"آپ نے نام لکھوایا؟" اشفاق حسین نے پوچھا۔

"جی لکھوایا۔"

اس سے پوچھا کہ پروگرام کیا ہے۔

"جی پوچھا۔"

"کیا کتا ہے؟"

"کتا ہے ابھی لیڈر اور مختلمین آئیں گے تو اطلاع ہو گا۔ جب تک آپ بیٹھ کر

انتظار کریں۔"

دربار کے اس کونے میں ہم یوں بیٹھے تھے جیسے ریلے سے پلیٹ فلام پر سفر بیٹھے

ہوتے ہیں۔ سامنے دانا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ یہ دانا لوگ بھی خوب لوگ ہیں۔ صرف دو کام

جانتے ہیں دنا اور مسکراتا۔ دیتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ دیتے جاتے ہیں اور مسکراتے

جاتے ہیں۔

دانا

ایک ہزار سال پہلے حضرت علی بن ابی طالب کو حکم ملا تھا کہ لاہور جا کر بیٹھ جاؤ۔ جو بھی

مسافر سے دور پر آکر باتگئے اسے دو۔ اٹا دو۔ اٹا دو کہ دانا بن جاؤ۔ یہ نہ دیکھنا کہ مانگنے والا

کون ہے۔ کیا ہے۔ ہندو ہے۔ بدھ ہے۔ عیسائی ہے۔ یا مسلمان ہے۔ ٹیک ہے یا بدھ ہے۔ اچھا

ہے یا برا ہے۔ دینے والا دنا جاتا ہے۔ پر کتنا نہیں جانتا۔

دانا اس ہندو گھری میں آ بیٹھے جسے لاہور کہتے ہیں۔ سائل کو دیا۔ اور اس خوش

اخلاقی محبت لاہور لیا کہ لاہور میں دانا کی دھوم مچ گئی۔ اور لوگ مسلمان ہونے لگے

ہوتے گئے۔ یہ دانا کے کردار کی عظمت تھی۔

دانا زندگی بھر دیتے رہے پھر مرنے کے بعد بھی دیتے رہے۔ یہ دینے کا سلسلہ آج

تک چل رہا ہے۔ پہلے چٹائی پر بیٹھ کر دیتے تھے اب مزار کے مرقد پر بیٹھے دیتے جا رہے

ہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں اسلام گوار کے زور پر پھیلا۔ سچ کہتے ہیں۔ لیکن وہ گوار کو ہے کی گوار میں تھی۔ کر دہ کی گوار تھی۔ ایڈر کی گوار تھی۔ خدمت کی گوار تھی۔ یہ سامنے جو دانا بیجا ہوا ہے یہی وہ گوار ہے جس نے شمالی ہند میں اسلام پھیلایا۔ ایک ایسی ہی گوار اجیر شریف میں پڑی ہے ایک پاک غن میں۔ ایک قلعہ جتہ کے پاس دلی میں ہے۔ ایسی کئی ایک گواریں ہیں۔ انہیں رنگ نہیں لگایہ آج بھی کالٹ کر رہی ہیں۔ صرف غیر مسلموں کو ہی نہیں مسلمانوں کو بھی مسلمان بنا رہی ہیں۔ ان گواروں نے ہند میں آکر غور پھار دیا۔ اندر پرست کو دلی بنا دیا۔ اجودھن کو پاک غن بنا دیا۔ لاہور کو دہلی کی گمری میں بدل دیا۔

میں نے اس دانا کے کئی روپ دیکھے ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں دسویں پاس کرنے کے بعد میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تو بمبائی دروازے میں اپنے عزیزوں کے گھر ٹھہرا۔

وہاں صاحب خانہ ایک معزز محترم تھی۔ اس کے ہاں لمبے تھے چرایاؤ تھا۔ سرخ و سفید تھا۔ چرے پر اس قدر رعب تھا کہ ان سے بات کرنا بھی مشکل تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تن تھارہتی تھیں۔ ہر دو ایک کھینے کے بعد ان کے کمرے سے ایک پردہ لٹک کر قسم کا نمرا سٹائی رہتا۔ "دانا" اس زمانے میں مجھے دانا کا طم نہ تھا۔ یہی میں اس لفظ کے مفہوم سے شناسا تھا۔

میں نے محترمہ کی بیٹی سے پوچھا۔ یہ کیسا نمرا لگتی ہیں۔ دانا کون ہے۔ وہ کہنے لگی یہ دانا کی پرستار ہیں۔ کبھی دانا کے دربار پر جاتا اور دانا کو دیکھ لو۔ تب میں نے پہلی مرتبہ دانا کی خدمت میں حاضری دی۔ میں نے دیکھا دانا تو ایک حراز ہے۔ جس کی قبر پرست لوگ ہاتھ دیکھتے ہیں۔

پھر میں نے وہ رنگ بھی دیکھا جب لاہور میں جمہور کی شام کو بیرون منڈی کی مسجد طوائفیں بن ٹھن کر دانا کی حاضری کے بہانے جلوس کی صورت میں چلتیں۔ نام دانا کا لیتیں۔ نمائش اپنی کرتیں۔ ان کے پیچھے تماشا بیٹوں کا ایک جھوم ہوتا۔

پھر وہ دن بھی دیکھے جب دانا کا دربار شوقین حضرات کے لئے ملاقات کی جگہ تھی۔ "راندے دو" تھی اور وہ دن بھی جب دانا کے ارد گرد کے مکانات و حندے کے لئے برتے جاتے تھے اور اب بھی جب اوجاف کے تحت دانا کا دربار واقعہ میں دربار بنا ہوا ہے۔

راجہ نے دانا لوگ بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں جو ماحول کی پرامتھی سے آواز دہ نہیں
 ہوتے۔ جو سڑکیں کی حریم کو ہوس پر میں سڑکیں نہیں ہوتے۔ انہوں نے اور دھڑکائی کی
 سو اچھ نہیں کرتے۔ یہاں پر لوگ بہت زیادہ ہوس پر ہیں۔ یہاں پر لوگ بہت زیادہ ہوس پر
 ہیں۔ یہاں پر لوگ بہت زیادہ ہوس پر ہیں۔ یہاں پر لوگ بہت زیادہ ہوس پر ہیں۔
 زائر تاجر یہاں پر لوگ بہت زیادہ ہوس پر ہیں۔ یہاں پر لوگ بہت زیادہ ہوس پر ہیں۔
 یہاں پر لوگ بہت زیادہ ہوس پر ہیں۔ یہاں پر لوگ بہت زیادہ ہوس پر ہیں۔
 پھر وقتاً ایک عجیب کی آواز میرے کان میں چڑی۔ "سو کے اسی" میں نے اس کی
 میں نے اس کی آواز پر کچھ بھی نہیں سمجھا۔ میں نے اس کی آواز پر کچھ بھی
 وہاں تمام زائر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ چلے آئے۔ انہوں نے درپردہ کی بڑی ڈھکی کی طرف
 امید بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ کب کوئی اہل کار یا لڑکے آئے اور انہیں بتائے کہ اب
 کیا کرنا ہے۔

کچھ دیر بعد پھر وہی آواز آئی۔ "سو کے اسی" میں نے پھر سوچا۔ میرے
 بائیں ہاتھ بیٹھا ہوا زائر اپنا سر گھٹنوں میں دیکھنے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک پولی سی
 چڑی ہوئی تھی۔ شاید اس پولی سی میں یہ اپنا ہاتھ ہانک کر لایا ہو۔ میں نے سوچا۔ لیکن وہ
 آواز نہ تھی۔

پھر ایک منٹ بعد کانٹوں کی کڑکڑ سنائی دی۔ میں نے دیکھا تو پولی سی چڑی تھی
 اور اس میں نوٹوں کے پتھر تھے جسے وہ زائر گن رہا تھا پھر بھی ہاتھ بھری کچھ میں نہ آئی۔
 ابھی میں حیرت سے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ زائر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔
 "سو کے اسی"

"سہنیا" میں نے پوچھا۔
 "پاکستانی سو کے بعد وہاں آئی"۔ وہ مسکرایا۔
 اسے یہ شخص زائر ہے یا کارکن ہے۔ اور پھر اسے بڑے درپردہ میں نوٹ پٹنے کا
 کام کرنا ہے۔

"کب زائر ہیں کیا"۔ میں نے پوچھا۔
 "جی"۔
 "ہمارے ساتھ دلی جا رہے ہیں"۔

"میں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اشفاق حسین کی آواز سنائی دی۔

"باپ جی آپ کو میں پتہ اس دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔"

"داتا جی آپ بن رہے ہیں۔" میں نے داتا صاحب کی طرف دیکھ کر ڈول جی ڈول

میں سرگوشتی کی۔ داتا ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ جو لاوارث بھینروں کی طرح بیٹھے منہ اٹھاٹھا کر رکھوالوں کا انتظار کر رہے تھے۔

بھینروں اور رکھوالے

مجھے یاد ہے جب میں انوب خان کے دور میں صدر گھر میں ملازم تھا تو ایک شخص مدینہ منورہ سے صدر کے نام ایک پیغام لایا تھا۔ اس نے کہا تھا مسجد نبوی کے چابی بزدلوں سے صدر کے نام پیغام بھیجا ہے۔ کہ "بھینروں کے رکھوالے خود چھلوں میں نہیں بیٹھتے" ہمارے ہاں تو رکھوالے بیٹھ چھلوں میں بیٹھے رہے اور بھینروں آؤرنگی کی عادی ہو گئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب اس مملکت خدا داد کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

دفعہ مسجد کالاؤڈ چیکر بولنے لگا۔ زائرین کے کان کھڑے ہو گئے۔

"امیر خسرو کے زائرین مسجد میں آگئے ہو جائیں۔" سب لوگ اپنا اپنا سامان اٹھا کر مسجد میں داخل ہو گئے۔ ہینک پر غالب وہی شخص کھڑا ہم سے مخاطب تھا جو باہر زائرین کے نام گلبد کر رہا تھا۔

"حضرات!" اس نے تقریر شروع کی۔ "یہ آپ کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ حضرت امیر خسرو کے عرس پر حاضری دینے جا رہے ہیں۔ لیکن آپ فرد کی حیثیت سے نہیں جا رہے۔ جماعت کی حیثیت سے جا رہے ہیں اور آپ کا فرض ہو گا کہ آپ ہندو میں جماعت کے رکن کی حیثیت سے رہیں اور جتنے کے قادم کے احکامات کے مطابق عمل کریں۔"

دوسری اہم بات یہ ہے کہ آپ میں سے ہر فرد وہاں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے جا رہا ہے۔ آپ وہاں کسی ایسی وکی حرکت کے سرآوردہ نہ ہوں جو پاکستان کے وقار کے منافی ہو۔

پھر ایک اور صاحب قشرب لے آئے۔ بھرے سے ظاہر تھا کہ وہ اعلیٰ عہدیدار ہیں۔

انہوں نے حضرت امیر خسرو کی زندگی سے واقعات سنائے شروع کر دیئے۔ ان کی تقریر بڑی

عمرہ تھی لیکن اس میں تاثر نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ اہل کار تھے۔ انداز میں برتری تھی، فائنل تھی۔

تقریر ختم کرنے کے بعد اہل کار نے اعلان کیا کہ اب جتنے کے لیڈر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔

”لیڈر صاحب ابھی تشریف نہیں لائے۔“ کارکن صاحب کی آواز سنائی دی۔

اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری۔ ”یاریہ سب لوگ ہاری ہاری بیٹھوں کو ہدایات دے رہے ہیں کہ وہاں جماعت کی حیثیت سے رہتا۔ لیڈر کے انکشافات کی پیروی کرتا۔ کیا کوئی صاحب لیڈر کو نہیں بتائیں گے کہ ان کو وہاں کیا کرتا ہے۔“

”لیڈر ہدایات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔“ ہمارے پاس بیٹھے ہوئے صاحب بولے۔ ”نہیں نہیں، ایسی بات نہیں۔ ضرور انہیں بریف کیا ہو گا۔“ ایک اور صاحب نے کہا۔

”جیسی تو وہ ابھی تک نہیں آئے۔“

”کیا مطلب؟“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”بھائی صاحب! ضرور انہیں سمجھایا ہو گا کہ پہلے زائرین کو اکٹھا ہونے کی سہولت دینا۔ جب پتہ چل جائے پھر صورت دکھاتا۔ یہی لیڈر کے شاہان شکن ہے۔“

”تو پھر ہمیں کیوں ساڑھے سات کا وقت دیا تھا؟“ اشفاق حسین بولا۔

”بھئی ہم زائر ہیں لیڈر نہیں۔ اگر لیڈر بھی عوام کا سادہ رویہ اختیار کر لیں تو وہ لیڈر کیسے رہیں۔“

دفعتاً شور مچ گیا۔ ”آگئے۔ آگئے۔“

ایک نہایت مسرور ہونے والے پہچانے صاحب تشریف لے آئے۔ ان کا چہرہ نورانی تھا۔ بشرہ پر وقار تھا۔ آواز میں رعوت تھی۔ بات میں خود اعتمادی تھی۔ بات کا انداز تقریری تھا۔ تقریر کا انداز رکھی تھا۔ کتابی تھا۔ یوں جیسے وہ شخص جو جانتا ہے کہ جانوں سے بات کر رہا ہو۔ ہدایات میں سند تھی۔ انداز میں مصلحت تھی۔ اشفاق تھا۔ تقریر میں سبکی کچھ تھا لیکن تاثر نہیں تھا۔ وہ تاثر جو مجھ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ مجھ کو ہونٹوں پر نہیں کھیلتا بلکہ دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔

ہی والے ہیں۔

— یہ کیا کہنا ہے؟

— چپ لوگ، جیسے کہ تو یوزر صاحبہ بن میں تقریباً لاکھ لوگ پوائنٹ اخلاق سے فریڈا فریڈا پوچھتے، لگے کہ آپ اگر اس سے بچتے ہیں، تو اس کی دیکھنا دیا گیا۔ پھر دوسری بس میں داخل ہو کر یہی سوال پوچھنے لگے۔

دم بخت

اس پر بس والے ایک زبان ہو کر بولے چپ کی مرانی ہے۔ ہم سب ٹھیک ہیں۔
ابنہ شدت کی گری ہے۔ اور ہم یہاں کری میں یوں دم بخت ہو رہے ہیں جیسے ویک میں
پڑے ہوں۔ روائی کا حکم دیجئے۔ تاکہ بس چلے تو ہوا لگے۔
”بس اب تو روانہ ہونے والے ہیں“ تاکہ یہ کہہ کر یوزر بس سے بیٹھے اتر گئے اور
دلہن میں امید پر مٹھنیں تو لگے کہ یقیناً اب بن کو روانہ ہونے کا حکم دینے کا
اہتمام کرنے میں مصروف ہوں گے۔

ویک میں پڑنے پڑنے تاکہ ٹھنڈے گنڈا گیا۔
بھیزیں مہانے لگیں۔

”کیوں بھی اب کس کا انتظار ہے۔“

”پتہ نہیں۔“

”پوچھو تو سی یاد کہ تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔“

”کیس سے پوچھیں؟“

”یوزر کہاں ہیں؟“

”پتہ نہیں۔“

”بھی بسوں کی روائی کے اہتمام میں مصروف ہیں۔“

”کیس لگے ہیں جاکا۔“

”جد ہو گئی یاد۔“

ایک ٹھنڈے گنڈا گیا۔

بھیزیں بے کار ہوئی جاری تھیں۔ بھاری بھیزوں کی خصوصیت ہے کہ وہ بے کار

ہو کر بھی گھر میں رہتی ہیں۔

واقعاً ایک دیکھن لہا کلاہوں کے قریب آ کر رکی گئی۔ لیڈر بیچے لڑے اور بڑی محبت سے پوچھنے لگے۔ کیوں حضرات آپ تیار ہیں۔ کوئی صاحب بس کے باہر تو نہیں نکلے ہوئے۔

"وہ جواب نہیں"۔ اشفاق نے کہا۔ "ہم سے روانگی کی اجازت طلب کی جا رہی ہے"۔

"ہیش سے یہی دستور ہے۔ فیصلوں کے بعد عوام سے انگوٹھا لگوایا جاتا ہے۔

بھائی۔

منظور کہ نہ منظور۔

لیڈروں کی دیکھن چل پڑی۔

اس کے پیچھے دونوں بسیں چل پڑی۔

ایک صاحب بولے۔ "یار ہمارے لیڈر تو ہمارے ساتھ بس میں بیٹھے تھے۔ ان کی جگہیں ابھی خالی ہیں"۔

"ہاں وہ ہیش ہمارے ساتھ بیٹھے ہیں اور ان کی جگہیں ہمیشہ خالی پڑی رہتی ہیں"۔ پیچھے سے آواز آئی۔

کشم ہاؤس

زندگی بھر کشم ہاؤس کو میں نے کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ اس ضمن میں میرے تجربات بے حد محدود تھے۔ میں صرف ایک بار ملک سے باہر گیا تھا وہ بھی حج کے لئے۔ کشم ہاؤس کے ایک خوش اخلاق افسر نے دہلی آواز میں مجھے سے پوچھا تھا۔ "سونا تو نہیں لائے"۔

"لا یا ہوں"۔ میں نے کہا تھا۔

اس پر وہ بے حد محفوظ ہوئے۔ جھک کر زیر لب بولے۔ "کہاں چھپایا ہے"۔

"یہ تو دن لٹین ڈالر سیکرٹ ہے"۔ میں نے جواب دیا۔

”بھئی بہت سنگا ہے۔“ وہ بولے اور پھر سوٹ کیس کھولے بغیر اس پر چاک سے نشان ڈال کر قحی سے کمالے چاؤ۔

پھر ایک روز میں نے ٹیلی ویژن کا مشہور پروگرام فٹنی فٹنی دیکھا۔ ایک حسین و جمیل لڑکی کا سونہرے چاہوا تھا۔

تین امیدوار تھے۔ ایک الہکار۔ ایک دوکاندار اور ایک گنوار۔ لڑکی ہاتھ میں رضا مندی کی ملا لٹائے چل پڑی۔ الہکار کے پاس رکی۔ اس کا جائزہ لیا اور آگے بڑھ گئی۔ پھر دوکاندار کو غور سے دیکھا۔ اچھی وہ دوکاندار کو دیکھ ہی رہی تھی کہ تیسرے امیدوار گنوار نے جیب سے ایک حقیقی نکالی جس پر لکھا ہوا تھا ”کشم کشم کا چچا اسی“ یہ دیکھ کر لڑکی نے لپک کر گنوار کے گلے میں پریم ملا ڈال دی۔

اس روز سے میرے دل میں کشم کشم کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔

واپس کا کشم کشم دیکھ کر میں بہت مایوس ہوا۔ دیر تک چچا اسیوں کا جائزہ لیتا رہا۔ لیکن وہ چچا اسی نظر نہ آیا جس کے گلے میں لڑکی نے پریم ملا ڈالی تھی۔ واپس کے کشم کشم میں دو ہال کمرے تھے۔ ایک آنے والے مسافروں کے لئے۔ دوسرا جانے والے مسافروں کے لئے۔ ایک بڑا کمرہ قاریز کے لئے مخصوص تھا اور دو ایک چھوٹے کمرے شاف کے لئے۔ عمارت کے سامنے ایک لمبا برآمدہ تھا۔ اس کے سامنے ایک وسیع پلاٹ۔ پلاٹ کے قریب سڑک پر کوئی چالیس پینتالیس نئے گھر چمکتے ہوئے سوٹ کیس اور بیک قطار میں چڑے ہوئے تھے۔ قریب ہی بہت سے فائیرز کا ایک جھنڈ کھڑا تھا۔

پھر میں نے کشم کشم کے دوسرے محلے کی طرف توجہ کی۔ چند ایک خوش لباس نوجوان ہلی آئی اے کے خانہ کی طرح چاق و چوبند چل پھر رہے تھے۔

پلاٹ میں ایک جانب دو لمبی میزیں پڑی ہوئی تھیں۔ دو الہکار ان میزوں کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ چچا اسی نے اعلان کیا۔ ”ڈائریں اپنا اپنا سامان لے کر باری باری آتے جائیں۔“ یہ سنتے ہی میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

کہاں چھپاؤں

اسلام آباد سے روانگی سے پہلے ہی اشفاق حسین اور میں نے مل کر پوتی محنت سے ہیریوٹھی کی کتابوں کی ایک فہرست بنائی تھی۔ دلی کے ہیریوٹھنک ہائبریری کے ڈائریکٹ پر اسے یکساں ہلدے پاس موجود تھے۔ ہم نے قابل خرید کتابوں کی قیمتوں کو جمع کیا تھا کہ اندازہ لگا سکیں کہ کتنی رقم ہمیں ساتھ لے جانی پڑے گی۔

ایک روز جب ہم اسی سلسلے میں غائب کتاب میں مصروف تھے تو ہمارے پڑوسی اچھا "اشفاق حسین بولا۔ "کتنی رقم ساتھ لے جاسکتے ہیں۔"

میں نے اسے اندازہ کر دیا کہ وہ فقیر مد کر رہے ہوئے۔ قانون کے مطابق آپ اپنی رقم ساتھ نہیں لے جاسکتے۔

"اچھا۔" اشفاق حسین بولا۔ "کتنی رقم ساتھ لے جاسکتے ہیں۔"

"میں کوئی پچاس ساٹھ روپے"

"لیکن لوگ تو بڑی بڑی رقمیں لے کر جاتے ہیں"

"جی اچھا اگر لے جاتے ہیں۔ ویسے نہیں لے جاسکتے"

"اور اگر پکڑے جائیں تو"

"تو رقم ضبط ہو جاتی ہے"

یہ خبر ہمارے لئے سخت پریشان کن تھی۔ جب پڑوسی چلا گیا تو میں نے اشفاق حسین سے کہا "لوٹو لوٹو"

"رقم تو لے کر جانی ہی پڑے گی ورنہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔"

"اور اگر پکڑی گئی تو"

"یہ رنک تو دیکھنا ہی پڑے گا۔" اشفاق حسین ہنسنا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ رقم کہاں چھپائیں۔

پرائی گناہوں میں سنا آجیا تھا کہ ماں بیٹے کو سڑ پر بھیجے نئے وقت روپے اس کی صدی میں ہی دیا کرتی تھی کہ اگر ڈاکو اس سے بڑھ جائے تو رقم محفوظ رہے۔

میں نے سوچا چلو روپے میں بھی ڈاکٹ میں ہی کو گا۔ بہت تو بڑی معمول تھی۔

وقت یہ تھی کہ ڈاکٹ پہننے کا موسم نہ تھا۔ اچھی گرمی میں بھلا ڈاکٹ کون پہنے اور بہن لے تو غیر از معمول بہت نشان دہی کر دے گی۔

پھر میں نے سوچا کہ جوتے میں رکھ لوں۔ یہ عرصہ درازی سے میں دیکھتا ہوتا ہوں۔ جو بہت ہلکا ہوتا ہے۔ جو جوتے میں ٹوٹ چھالنے کے لیے میں نے دو پتھرے خریدے۔ لوگوں کو کانڈ میں لپیٹ کر میں نے پتھرے کی پھیلا دی ہیں۔ جب وہ آئے۔ اس طریق کار سے میں مطمئن نہ ہوا چونکہ جب بھی چلتا تو پتھرے کے پچھلے ہاتھ کا کوئی ڈاکوئی کرنا مشکل آتا۔

اس بات کو ہاتھ کے لئے دو روز میں لوگوں کو پتھرے سے چھپا کر چلنے پھرنے کی رسم سیکھ کرنا پھر بھی میں یقین سے نہیں کر سکا تھا کہ کیا واقعی کانڈ کا کوئی ہتھیار نکل آتا تھا یا مجھے تو لگا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس طریق کار کو رو کر دیا۔ جوتے میں ٹوٹ چھپانے کی بات نہیں چلے گی۔ لوگوں۔

سامیو قانون کے خلاف کام کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ سب سے پہلا مسئلہ ہے۔

دو۔ حاکم کو مجھے پھینک نہیں آتا۔ یہ ایک طبی یقین ہے۔ شاید تو دانی ہو۔ لیکن ان دنوں کے دوران مجھے اتنے پیسے آئے کہ حاکم کو دانی نہ آئے ہوں گے۔ ایک عرصہ نے کمان لوہے تو انسان کام ہے خبر ہے پاس ایک ایسی فٹو لہ ہے جس میں جیب لگے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوہے کی فٹو لہ میں لگے ہوئے ہیں۔ بہت ہی سوزوں تھے لیکن وقت یہ تھی کہ شلوار کمان کی جیبوں میں رکھنی تھی اور ان کی پھوٹ دینی تھی۔ یہاں پر ان لوگوں نے کہا کہ ہر ایک کو جوان آگے بڑھے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ "تو پھر اصل کر دو" میں نے کہا۔ "پہلے سب سے دیکھو"۔

انسان ایک ایک نور ایک سیٹنگ ایک پر مشتمل تھا۔ وہ لوگوں نے کہا کہ اس نے ایک کو ٹولا۔ "اس میں کمانیں نہیں کیا جاتی"۔ "جوتے میں پتھرے"۔ "ہاں میں کمانیں ہیں"۔

مجھے تو شاید غور خیالی نہ آتا۔ "اشفاق نے کہا یہ غور تو سہی کے لیے کوئی عقد نہ لے چکیں"۔

”خبردار“۔ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن کیا لے کر جائیں“۔

وہ ایک دن میں اس موضوع پر سوچنا رہا۔ آخر ایک صاحب ہو لے۔ ”بھئی اویس آدمی ہے۔ کتابیں لے جاؤ۔ تازہ بہ تازہ قسم کی“۔

میں نے بازار سے تین تازہ ترین کتابیں خرید لیں۔ وہ بیک میں پڑی تھیں۔
نوجوان نے کتابیں کام بن گیا۔

اس نے کتابوں کے سرورقوں کے نیچے نوٹ رکھ کر اوپر لٹی لگا دی۔
پس تو میں کہہ رہا تھا جب کسٹم دالوں نے آواز دی کہ زائرین اپنا اپنا سامان لے کر
باری باری معائنہ کے لئے آتے جائیں تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔

وہ چہرہ سی

وہ ایک عجیب صورت حال تھی۔

ہر زائر کے پاس رقم حسب توفیق موجود تھی۔ کسی کے پاس ایک ہزار کسی کے پاس
دس ہزار۔ پردیس میں بھلا رقم کے بغیر کون جاتا ہے۔

جج آفس نے روانگی سے پہلے ہر زائر سے ۱۰ روپے وصول کر لئے تھے۔ یہ رقم
اخراجات کے لئے تھی اور اس رقم میں سے انہوں نے ہمیں بھارتی کرنسی میں گزاردہ ۱۱ روپے
دیتا تھا۔

داتا کے دربار میں اعلان کیا گیا تھا کہ زائرین کو بھارتی کرنسی میں رقم ہر قسم میں
جائے گی۔ کسی نے اس بات کی وضاحت نہ کی تھی کہ کتنی رقم دی جائے گی۔ اس لئے
زائرین سب ڈانٹوں ڈول تھے۔ ہر حال ہر زائر کے پاس رقم موجود تھی تو اس نے اپنے
سامان میں چھپا رکھی تھی۔

اور سرکسٹرز کے اہلکاروں کو بھی علم تھا کہ ہر زائر کے پاس رقم موجود ہے۔ تو سامان
میں چھپائی گئی ہے۔ سرکسٹرز کے اہلکاروں کا کام ہی یہ ہے کہ وہ جو جیس کہ رقم کہیں چھپائی گئی
ہے۔

سامان اور سامان والے کو دیکھ کر وہ انوازہ لگاتے کہ رقم کہیں ہے۔ مسکراتے اور
سرسری طور پر ان جگہوں کو دیکھ کر جہاں رقم نہ ہوتی۔ سامان پر چاک سے نشان لگاتے۔

جانے دو۔

میں حیران کھڑا دیکھتا رہا۔ واہ کیا صورت حال ہے۔ اہلکاروں کو پتہ ہے لیکن وہ چشم پوشی کر رہے ہیں اور مسافر خوش ہیں اور مونچھ پر تلوے رہے ہیں کہ واہ ایسی ذہانت سے رقم چھپائی کہ سلاہوجہ ہی نہیں سکا۔

بھر دفعتاً پتہ نہیں کس بات پر کسٹمز کا ایک چڑھسی بھر گیا۔ حلال میں آگیا۔ زائر سے بولا بستر کھولو۔

زائر نے بڑی بے نیازی سے بستر کھول دیا۔

چڑھسی بولا۔ نکلیے مجھے دو۔ زائر نے پنگپاتے ہوئے نکلیے دے دیا۔ چڑھسی نے نکلے کا ایک کون چھان دیا۔ اندر ہاتھ ڈالا اور دو ہزار کے نوٹ باہر نکال کر رکھ دیئے۔ یہ سدا عمل ہیں ہوا جیسے سڑک پر قحاش کرنے والے مداری کیا کرتے ہیں۔ انگوٹھی آپ کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں اور پھر وہی انگوٹھی سامنے کھڑے بابو کی جیب سے برآمد کر دکھاتے ہیں۔ لیکن کسٹمز کے چڑھسی کا یہ عمل شعبہ دہری نہیں تھا بلکہ تجربہ تھا۔ نگاہ تھی۔

بھر جو میں نے فور سے چڑھسی کی طرف دیکھا تو فوراً بچپان گیا۔ ارے یہ تو وہی ہے جس کے گلے میں فغنی فغنی کی دو شیزہ نے پریم والا اٹلی تھی۔

کسٹمز سے فارغ ہو کر ہم اپنا اپنا سامان اٹھا کر ہندی بارڈر کی طرف چل پڑے۔

پاکستانی بارڈر پر کوئی قلی دستیاب نہ تھا۔ چونکہ سدا سے قلی فلڈ نیوز کے نولے کا سامان اٹھانے پر لگے ہوئے تھے۔ وہاں انیس دس کی جگہ میں میچیں روپے کی توقع تھی۔ بھجبھش فلگ۔ اس لئے ہم دہری لوگ ان کے لئے گھانے کا سودا تھے۔

پاکستانی حد سے ہند حد تک کافی لمبا فاصلہ تھا۔

اشفاق بولا۔ "یار آج تو بدے گئے۔"

"کیا مطلب؟"

"اپنا کبازہ ہو گیا۔ سامان اٹھا اٹھا کر۔ میں تو یوں محسوس کرنے لگا ہوں جیسے میں

اسلام آباد کا زائر نہیں بلکہ بارڈر کا سامان اٹھانے والا قلی ہوں۔"

"خیر یہاں تو جمہوری ہے لیکن وہاں ہم پر ناحق زیادتی کی گئی۔"

یہیں انے خبر پڑے تھے سکھ علمی کی طرف دیکھتے یہ اصلی علمی مقلوم نہیں پرچہ علمی ملی
سی باتیں کرتا رہا ہے۔

برآمدے میں ایک سکے آکھڑا ہوا۔ جسے اپنے پاسپورٹ اندر جا کے دیکھو۔
پاسپورٹ لے کر میں اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں ایک بہت ہی لمبی سی مشین پر دو سو سو روپے لکھے
ہی سکے بیٹھے ہیں۔ چست کپڑیاں پہنے۔ چہرے پر صحت کے پورے سجائے۔ آنکھوں میں
چمکنا اور ان کے لیے تکیوں پر لٹائے ہوئے ہیں۔ یہ تو ایک عجیب سی چیز ہے۔

میں سکھائے جاتے تھے۔ ان کے مل تحریروں غنوں تحریروں جیسے اچانک میں بیٹھا ہوں۔ سکھ میں سادگی ہے۔ بے تکلفی ہے، خلوص ہے۔ وہ جذباتی ہے، غصیل ہے، صحت مند ہے، کھانا کھاتا ہے، چاہتا ہے، براہ راست ہے، کچھ سمجھیں رہتا۔ جو ٹھیک ہے۔ اس میں زندگی ہے، آزادی ہے۔ سکھ میں صرف ایک خاص ہے۔ وہ یہ کہ انہیں کھانا سے استغناء کیا جاسکتا ہے۔ یہ وصف ہر سادہ مزاج جذباتی قوم میں ہوتا ہے۔

جلانگر تقسیم کے وقت جو کچھ شہری بھجایا گیا تھا اس کے بعد میرے دل میں
 سکھ کے خلاف انتہائی جذبہ پاکم لازم بغض پیدا ہو جانا چاہئے تھا۔ یہی بات یہ ہے کہ میں نے
 بہت کم شش کی کہ یہ بغض بڑھ کر چاہئے نہیں تھا۔ اسباب نہ ہو سکا۔ غالب اس کی
 وجہ یہ تھی کہ سکھ میں لوگ کر دار کا عنصر غالب ہے اور لوگ کر دار سے مجھے متنفر ہے۔
 لوگ کر دار کے حامل لوگ دیکھے جیسے نہیں ہوتے۔ ان میں بد و جاری ہیں۔ وہاں یہ
 نہیں کہ منہ پر کچھ بغض میں کچھ۔

ہر صورت میں نے سکھ سے دوستی کی چٹی بھی تقویٰ کی کہیں سب غلام ہو گئیں۔ جب بھی سکھ پاکستان میں رہتے تو کھانا پھوس ہوا جیسے اپنے گائے ہوں۔ انہیں دیکھ کر مجھے سکھ سامعین ہوں ہوا۔ خوشی کی ایک کڑوئی چلی۔ یہ ہے سکھ کا حال

پاسپورٹ چیکنگ کے بعد۔ سلمان چیک کرنے کا کام شروع ہوا۔ ہند کے گھنٹرو بھی علم تھا کہ ہر مسافر نے سلمان میں پاکستانی کرنسی چھپائی ہوئی ہے۔ گھنٹرو انہوں نے توجہ نہ دی۔ سرسری طور پر دیکھا اور پاس کرتے گئے۔ ان کا معاملہ پاکستانی گھنٹرو کی نسبت زیادہ سرسری تھا۔ شاید اس لئے کہ انہیں پتہ تھا کہ یہ مسافر روپیہ ہند میں خریدو فروخت پر صرف ہو گا۔

دوسرا محل بھی تھی۔ شام ہونے والی تھی لیکن زائرین کے کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ کوئی سیب کھا کھا کر گزرا کر رہا تھا۔ کوئی پکڑوں سے پیٹ بھرے جا رہا تھا۔

فریج ریولوشن

جب ہم اسلام آباد سے چلے گئے تو میرا خیال تھا کہ زائرین کے کھانے پینے کا بندوبست جج دفتر والے سرانجام دیں گے۔ جو سات سو دس روپے ہر زائر نے لوا کیے تھے۔ یہ انتظام اسی رقم میں سے ہو گا۔

لاہور روانہ ہونے سے پہلے اتفاقاً ایک صاحب مل گئے۔ کہنے لگے۔ بے شک کھانے اور رہائش کا انتظام وہی کریں گے لیکن کھانے کے دام زائر خود ادا کریں گے۔

اشفاق حسین یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ بند جانے سے پہلے اسے ایک ہی فکر دامنگیر تھا۔ یار میرے پریشانی کھانے کا بندوبست کیسے ہو گا۔ کیا مجھے وہاں بے شک مریج کا کدو پکا ہوا مل جائے گا۔ کیا ناشتے میں دہی میرا آئے گا۔ کیا

اشفاق حسین بولا۔ اگر کھانے کا انتظام جج آفس کرے گا پھر تو کچھو کچھو ہو گئی۔ دلی پہنچے ہی میں منتظرین کو اپنی ضروریات کی لسٹ بنا کر دے دوں گا۔ دہی۔ بے شک کا کدو اور پودے کی چٹنی جس میں نمک نہ ہو۔ بس میری یہی ضروریات ہیں۔

لاہور پہنچ کر اشفاق حسین نے مجھے فون کیا۔ بولا۔ یار دلی میں تو کھانے کا انتظام منتظرین کریں گے لیکن سفر میں ہم کیا کھائیں گے۔

میں نے کہا۔ ہاں یار۔ اس کا کوئی انتظام کرنا چاہئے۔

اشفاق حسین نے جواب دیا۔ "کیا میں یہاں سے کھانے بنا کر ساتھ لے چلوں۔

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے لے چلو۔"

"تم کوئی انتظام نہ کرنا"۔ اس نے تاکید کی۔

"ٹھیک ہے"۔ میں نے بات سوچے بچے بغیر کہہ دیا۔

اس وقت باب بندوختی بسوں میں بیٹھے ہوئے زائر بند کے بارڈر سے خریدے

ہوئے پکڑے اور آلو پھولے کھا رہے تھے تو اشفاق حسین نے فاحشہ لگا کر مجھ پر ڈالی اور بولا۔ کھانے نکالوں۔

یہ سن کر دفعتاً مجھے شدت کی بھوک لگ گئی۔ میں نے کہا۔ "وائے ہو۔"

بولا۔ "کیسے نہ لاتا۔"

میں نے کہا۔ "تو نکالو۔"

اس نے تے ہوئے آلو یوں نکال کر میرے سامنے رکھ دیے جیسے مرغ پکاؤ ہو۔

میں نے جو نوالہ منہ میں ڈالا تو میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ نہ ان آلوؤں میں ٹھک تھا نہ مرغ اور وہ کبھی میں نہیں چک پانی میں تے ہوئے تھے۔ چونکہ اشفاق حسین بلند پریش کے اندھے کی وجہ سے کبھی سے بھی پریشان نہ کرتا تھا۔ میرا تو کھاؤ ہو گیا۔

اس وقت میں زندگی میں پہلی مرتبہ روٹی روٹی کے ساتھ کھا رہا تھا۔ سالن کے ساتھ نہیں۔ اس سے تو پکڑے ہی کہیں اچھے تھے۔

صاحبو! کیا آپ نے کبھی اشفاق کی مدد کھائی ہے۔ نہیں کھائی تو آپ اسے نہیں سمجھ سکیں گے۔ اس وقت میں روٹی نہیں اشفاق کی مدد کھا رہا تھا۔

پھر جو اتفاقاً میں نے ہندوستانی کسٹم ہاؤس کی طرف دیکھا تو کیا دیکھا ہوں کہ ہاؤس کے برآمدے میں ایک لمبا میز بچھا ہے جس پر کھانے کی چیزیں چنی ہوئی ہیں۔ اور ہمارے لیڈر جن کرام مسلمانوں کی حیثیت سے ہندی اہل کاروں کے ساتھ ہونے لگے ازارے ہیں۔

یہ دیکھ کر میرے منہ کا نوالہ اور بھی بد مزہ ہو گیا۔ ہاتھ کی روٹی چھان بورے میں بدل گئی۔

میری نظروں میں ماحول بھی بدلتا گیا۔

میرہ دھڑل کی دھجیاں اڑ گئیں۔ اشفاق بے معنی لفظ بن گیا۔ فریج ریفریجیشن کی

(FRENCH REVOLUTION) کی ابتدا کچھ ایسے ہی ہوئی ہو گی۔

جب بھی میں امرتسر سے ٹالے کی طرف جاتا تو راستے میں کتھونگل، دیکھ کر حسرت سے میری ہنسی نکل جاتی کیا بیسودہ نام ہے۔ ایک دفعہ جب میں ریل گاڑی میں ٹالے سے امرتسر آ رہا تھا تو کتھونگل کے سٹیشن پر میں نے اپنے ایک ہمراہی سے کہا۔ کیا آپ نے اس سٹیشن کے نام پر غور کیا ہے کبھی۔ کتنا سمل نام ہے کتھونگل۔

اُسے میں دوسری طرف سے ایک کسان بولا۔ ”بیو جی سٹیشن کا نام تو بالکل ٹھیک ہے جی۔ سٹیشن کے اس طرف جو گھاؤں ہے اس کا نام ہے کتھونور سٹیشن کے اس طرح جو گھاؤں ہے اس کا نام ہے ننگل۔ سرکار نے دونوں گھاؤں کے بیچ میں سٹیشن بنادیا۔ کتھونگل نام رکھ دیا کہ کتھو والے بھی برقی ننگل والے بھی برقی۔

اس روز گویا میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا۔ پھر کئی ایک سٹیشنوں کے نام واضح ہو گئے۔ مثلاً چھانگاما نکا۔ راجہ ساسی۔ ہنچھو کی ملیاں۔

مجھے یاد ہے میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ آدمی رات کے وقت گاڑی ایک سٹیشن پر رکی۔ جس کا نام تھا ہنچھو کی ملیاں۔ اس زمانے میں قلیوں کی ڈیوٹی تھی کہ رات کے وقت جب گاڑی رکے تو سٹیشن کا نام بار بار بلند بولتے رہیں۔

گاڑی رکی تو قلی چلایا۔ ہنچھو کی ملیاں۔ یہ سن کر میرا ایک ساتھی ہڑبڑا کے جاگ اٹھا۔ حبیب میں ہاتھ داخل کر دوئی نکالی اور کٹھکی سے سر نکال کر چلایا۔ ابھی دو آسنے کی دے جاؤ۔

میں نے کہا۔ ”جب آپ کیا خرید رہے ہیں؟“

”ہنچھو کی ملیاں“۔ وہ بولا۔

”بھائی میرے! ہنچھو کی ملیاں تو سٹیشن کا نام ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بپوس ہو کر بولا۔ ”میں سمجھا کسی پھل کا نام ہے۔ میں نے کہا چلو یا

نیا پھل ہے جکھ لو۔“

دور اٹاری دو روپہ درختوں کی لوٹ سے ہمیں یوں جھانک رہی تھی جیسے گھاؤں کی کوئی ”بکی کڑی“ کوٹھے پر چڑھ کر بغیرے سے جھانک رہی ہو۔

امرتسر

پھر دفعتاً سڑک پر امرتسر کے مضافات شروع ہو گئے۔ ریلے لائن کی طرف
چھوٹے چھوٹے کارخانے دوسری جانب گمروندے۔
”امرتسر۔ امرتسر“ بس میں ڈائریں کی ذمہ لیں گونگی۔
امرتسر میں نے یوں محسوس کیا جیسے میرے دل کی دف پر ضرب پڑی ہو۔

کھجور میں تختلی

سانے اے حید کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چوار اڑ رہی تھی۔ واقعی
اے حید امرتسر ہے۔ امرتسر کے کی سب سے بڑی پہچان اس کی آنکھیں ہیں۔ جب
امرتسر کے کی آنکھیں جھپٹم ہوتی ہیں تو گرد و نواح میں گویا رنگ پچکاری چل جاتی ہے جس
طرح عید الفتح تھا۔

بب عید الفتح مسکراتا تھا تو گھنیاں کے کھڑے کے جنگلوں میں بیٹھی گویوں کی سدا
بن غصن پڑ جاتی تھی۔ نالغ اتر جاتی۔ کھڑ کھڑ ختم ہو جاتی۔ ٹھٹھے ملل بن جاتے۔ مطلوب طالب بن
جاتیں۔

عید الفتح کھڑا گھنیاں کا دھوا تھا۔ اس کی رنگ پچکاری نے سدا کے کھڑے کو ہلکا
رکھا تھا۔

ان دنوں امرتسر کے زیادہ تر لوگ کشمیری تھے۔ پتہ نہیں یہ کشمیری کب کشمیر چھوڑ

کر امرتسر میں آجسے تھے۔ اور پھر امرتسر پہنچے بن گئے تھے۔ ان میں حسن تھا۔ دلچسپی تھی۔ سخاوت تھی۔ دلیری تھی۔ چمک تھی۔ خلوص تھا۔ وہ جدبائی تھے۔ غصیل تھے۔ دل پریمک تھے۔ بے نیاز تھے۔ اچھا کھاتے تھے۔ پسنے میں ہانگے تھے۔ کپڑے کے فقیر نہ تھے۔ عیاش تھے۔ دہے تھے لیکن ان کے اندر مسلمان یوں ٹھک کر گزرا ہوا تھا جیسے کھجور میں کھلی گڑی ہوئی ہے۔

تقسیم کے وقت جب انہیں احساس ہوا کہ کرائے کے بلوائی مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں تو وہ حق کے کھڑے ہو گئے۔ ہاں ہم مریں گے لیکن چار ہار کو مار کر مریں گے۔ اگر وہ چاہتے تو آسانی سے اپنی جانیں بچا سکتے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ امرتسر ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اسے چھوڑ کر جانا لازم ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ بلوائیوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے۔ طاقت ہے لیکن وہ اڑ گئے۔ اس لئے نہیں کہ دشمن نے امرتسر کو لٹکا رہا بلکہ اس لئے کہ دشمن نے مسلمانوں کو لٹکا رہا اور ان کا ایمان تھا کہ مسلمان بھاگتے نہیں۔ مرنے سے لڑ کر مرنے سے۔ اسی بات پر انہوں نے سزا کھول لیا۔ لڑے اور مر گئے۔

عبدالحق کی بیٹے پر گولی لگی تھی۔ سامنے کھڑے ہو کر کسی کو عبدالحق پر گولی چلانے کی ہمت نہ تھی۔ چمپ کر کہیں گاہ سے گولی چلائی تھی۔
”وہ خالصہ کالج۔“ بس میں کوئی بولا۔

میں چونک اٹھا۔ ہاں سامنے خالصہ کالج تھا۔ پروفیسر رام سائے کالج کے گیٹ میں کھڑا مجھے روک کر رہا تھا۔ پروفیسر رام سائے ہفتے میں ایک بار ہلے بندو بھا کالج میں آکر بیگھر دیا کرتا تھا۔

رام سائے ان لوگوں میں سے تھا جو علم کے دیوانے ہوتے ہیں۔ پڑھ پڑھ کر بھر ہو جاتے ہیں۔ پھر دفعتاً سے ایک چنگاری بھرتی ہے۔ ہر روز روزہ ہو کر پھیل جاتا ہے۔ روح چمکنے لگتی ہے۔ پھر احساس ہوتا ہے کہ بھڑن جانا تو مقصود نہیں تھا۔ کتاب تو منزل نہیں۔ زندگی منزل ہے۔ پروفیسر رام سائے فلسفے کے پروفیسر تھے۔ ان کا بیگھر کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔

نہیں اس کی محبت

۱۹۴۷ء کی بات ہے جب میں امرتسر میں ہندو بھا کالج میں زیر تعلیم تھا۔ ان دنوں

میں کبھی باغ سے پرے ایک دور ان کو غلطی میں رہتا تھا جسے آسموں والی کو غلطی کہتے تھے۔ یہ جگہ
بندو سہا کالج کا ہوٹل تھی۔ کالج شہر کے مین سٹریٹ میں واقع تھا۔ ہوٹل امرتسر سے سیلوں
دور کبھی باغ سے پرے تھا۔

امرتسر میرے لئے ایک متحرک شہر تھا۔ چونکہ وہاں میری اولیٰں محبوبہ رہتی تھی۔
نمین راج کی محبوبہ ایک بیوہ ہوتی ہے۔ ایک وحشیانہ تصویر۔ وہ جسم نہیں ہوتی۔ ان دنوں
میں اس شہر اور راتیں تصویر کو سینے پر لگائے سارے امرتسر میں پادریہ پھیل کر پھرتا
تھا۔

میں نے محبوبہ کو اٹالے میں صرف ایک پار دیکھا تھا اور اس کے بارے میں صرف دو
ایک باتیں جانتا تھا کہ وہ سوئی کی بسن ہے اور اس کا پیار کا نام تانی ہے اور وہ امرتسر میں رہتی
ہے اور یہ بھی کہ وہ جتنی سفید ہے گھائی اور گوری۔ اس کی آنکھیں کالی سیلہ ہیں۔ اس کے
بال ٹھنکھریالے ہیں۔ مسکراتی ہے تو اس کی گالوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کے ہونٹ
ہاں مڑے رہتے ہیں جیسے ابھی ابھی لطیفہ سن کر بیٹھی ہو۔

کئی ایک سینے میں امرتسر کی پادریہ پھیل کر آ رہا۔ ہر کھڑکی کو دیکھ کر امید بندھ جاتی کہ
ابھی جن اٹالے کو کوئی کسے گی۔ میری طرف دیکھو میں تانی ہوں سوئی کی بسن۔ ہاں میں ہی
ہوں تانی۔ میں اور پھر آنکھیں بھپکا کر شرمنا شروع کر دے گی۔

امرتسر میں بڑا حسن تھا۔ بڑا رنگ تھا۔ بڑی چمک تھی۔ میں وہاں ایک سال گھومتا پھرتا
رہا۔ مجھے اس تصویر نے بھالایا تو میں نے سینے پر ٹھکار کھی تھی۔ اس بیوے نے بھالایا تو مجھ پر
مسلا تھا۔

اب میں نے جانا ہے کہ نمین راج محبت کتنی بڑی رحمت ہوتی ہے۔

سو کے کہتے:

موتریں دک گئیں۔ ہم امرتسر کے دیوے شیشن کے سامنے ریٹ ہاؤس کے
دروازے پر کھڑے تھے۔ اشفاق حسین مجھے کہنیاں مار رہا تھا۔ چلو سلمان اٹھاؤ۔
اترو۔

لیڈر صاحب اپنے مخصوص مشقتانہ انداز میں اعلان کر رہے تھے۔ آپ چند کھٹے
یہاں آرام فرمائیں گے۔ اپنا سلمان خلعت سے اندر لیں۔

ریسٹ ہاؤس کے سامنے پلاٹ میں ایک خیمہ لگا ہوا تھا جس میں چار بیٹے مثل بچے چل
رہے تھے۔ نیچے دری بھی ہوئی تھی۔ نیچے کے دروازے پر ایک ٹب پانی سے بھرا ہوا تھا
جس میں برف ڈالی جا رہی تھی۔
ابھی ہم نیچے میں بیٹھے ہی تھے کہ ایک سرگوشی چلنے لگی ”سو کے کتنے سو کے
کتنے“

یہ سرگوشی دراصل داتا کے دربار میں ہی چل پڑی تھی۔ دربار کے ہرونی صحن میں
جب ہم لیڈروں کی آمد کے منتظر بیٹھے تھے تو سو کے کتنے کی سرگوشی ابھری تھی۔
اسلام آباد سے روانہ ہونے سے پہلے ایک صاحب نے کہا تھا۔ روپیہ کیس لور نہ
بدلوانا۔ ہر قسم میں بدلوانا۔ وہاں اچھا ریٹ ملے گا۔

۔ واگہ میں بھی یہی سرگوشی ابھری تھی۔ ”سو کے اسی“۔ تب ہلدے پاسپورٹوں
کا معاملہ ہو رہا تھا تو چند ایک زائر وکانوں کی طرف اٹھ بھاگے تھے۔ ”سو کے

اب پھر سے وہی سرگوشی ابھری تھی۔

”سو کے بچا سی مل رہے ہیں“

”کہاں سے مل رہے ہیں“

”ریسٹ ہاؤس سے باہر“

”باہر کہاں“

”بہنی باہر نکلو تو“

”باہر نکل کر کہاں ڈھونڈیں“

”بھائی صاحب پیاسا کنویں کو ڈھونڈتا ہے۔ کوں پیاسے کو نہیں ڈھونڈتا“۔ ہم

دونوں ریسٹ ہاؤس سے باہر شیٹن کی پورج کے قریب پہنچے تو ایک سگہ نوبوان آگیا۔ بولا۔

”بچا سی لینے ہیں تو لے لو“

”اور جو زیادہ لینے ہوں تو“؟ ایک زائر بولا۔

”تو لے جا کر لو۔“ سکھ نے کہا۔ ”کوئی مقامی تھوڑی ہے۔ میرے پاس تو سبزو سوکے بچاسی ہیں۔“

ہم نے روپے بدلوائے۔

اس وقت ہم امرتسر کے شیشن کی پور ٹیکو میں کھڑے تھے۔ وہی پور ٹیکو۔ وہی ڈیوڑھی۔ وہی بنگ کی کھڑکیاں۔ ۳۵ سال میں کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ سامنے تھرو گلاس کا مسافر خانہ تھا جہاں لوہے کے جنگلوں میں بیٹھ کر میں اکثر بنالے والی گاڑی کا انتظار کیا کرتا تھا۔

امرتسر کا شیشن باہر سے بالکل وہی شیشن تھا جس سے میں ہرے طور پر واقف تھا۔

سانپ کی کیریں

ہم نے دو پلیٹ فارم خریدے اور اندر داخل ہو گئے۔ دروازے میں بیٹھا ہوا ریلوے باجو اسی طرح اونگھ رہا تھا۔ اندر قلی اسی طرح اوپر سے اوپر چل پھر رہے تھے۔ ہوں جیسے بچے ڈھیلے ہو چکے ہوں۔ سڑاؤں پر بیٹھے ہوئے سٹریٹ لائٹس لوگ رہے تھے چائے والا اسی طرح ہاتھ میں کیتلی اٹھائے چائے انڈیل رہا تھا۔ وہی ویٹنگ روومز۔ وہی ریفرشمنٹ روومز وہی پارسل آفس۔ دفعتاً میری نگاہ سامنے اٹھ گئی۔

سامنے سائینک پر بنالے جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ میں یہ بھول گیا کہ زائر ہوں۔ دلی جانے کے لئے گاڑی کا انتظار ہوں۔ بھول گیا کہ میرے ساتھ اشفاق حسین ہے۔ میرا جی چلا کہ دوڑ کر گاڑی کو پکڑ لوں۔ چلتی گاڑی میں سوار ہو جوں اور پھر وہی دیر کا۔ وہی کھونٹنگل۔ وہی جیتی پور۔ وہی بنال۔ وہی شیشن کے باہر کھڑے بمبو کاٹ۔ وہی منڈی۔ وہی قلی دروازہ اور شہر کے ارد گرد بنی ہوئی چار دیواری۔

اشفاق حسین ہنسا ”تمہیں یاد ہے“۔ وہ بولا۔

”کیا“۔ میں نے پوچھا۔

”جب ہم آٹھ گورداسپور میں رہتے تھے۔ تم میں اور جانی“۔

”ہاں۔ سب باتیں میری آنکھوں کے سامنے ہیں کوم رہی تھیں جیسے کل کی بات“

یاد ہے جب ۱۹۳۲ء میں پہلی مرتبہ گورداسپور میں تم میرے گھر آئے تھے۔
ہاں یاد ہے۔

”تم نے کہا تھا۔ میں طلبہ سیکھتا چاہتا ہوں اور میں نے تمہیں ٹائٹل کے لئے کہا تھا
طلبہ سیکھتا ہے تو پہلے جوڑی خرید کر لگو۔ اور اگلے روز رات کے دس بجے تم نے آکر میرا
دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور جب میں نے دیکھا تھا کہ تم نے ہاتھ میں جوڑی اٹھا رکھی ہے تو میں
حیران رہ گیا تھا۔ یہ کیسا آدمی ہے جو جوڑی خرید کر لے آیا ہے۔ انا جنوں۔“
”ہاں یاد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اگلے روز میں صبح سویرے گاڑی میں بیٹھ کر
یہاں امرتسر آگیا تھا اور یہاں سے جوڑی خرید کر رات کو واپس گورداسپور پہنچا تھا۔ پتہ ہے
جوڑی ۳۰ روپے کی تھی اور ان دنوں میری تنخواہ کل ۳۵ روپے تھی۔
وہ قصبہ مار کا بنسا۔“ کیا دن تھے۔

اسی گاڑی میں بیٹھ کر میں گورداسپور پہنچا تھا۔ یہ جو سامنے سائیڈنگ میں کھڑی
ہے۔ جب بھی یہ اسی وقت چلتی تھی۔ اسی پلیٹ فارم سے۔“

گاڑی میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بے فکر، مطمئن، بے پروا۔ عورتیں بچے اٹھائے
انہیں ہسلارہی تھیں۔ کھڑکیوں میں لٹکتے ہوئے بچوں کو ڈانٹ رہی تھیں۔ بالکل اسی سربال
میں جس طرح سے ہینتیس سال پہلے ڈانٹا کرتی تھیں۔ انہیں خود نمائی کا خیال نہ تھا۔ دیکھتی
تھیں۔ لیکن دیکھنے کی خواہش نہ تھی۔

مجھے ایسے لگا جیسے وقت کا وحاراک گیا ہو۔ ہینتیس سال سے رکاوٹ ابوجیسے تبدیلی
رتی DEVELOPMENT سب منہ زبانی باتیں ہوں۔

میرا جی چاہتا تھا کہ پلیٹ فارم پر دھمال ڈیڑوں اور چلا چلا کر گھوڑوں
”لو جانے والے رے وہیں ہے میرا گاڑی“

میرا جی چاہتا تھا کہ ہر اے میں داخل ہو کر ایک ایک مسافر کو گلے سے لگائوں تو اور
جا رہا ہے نا۔ جدھر کی مٹ کی خشبو ابھی تک میرے آگے میں بھی ہوئی ہے۔
زندگی بھر میں نے اپنی جہم بھری سے کبھی اس قدر پیار محسوس نہ کیا تھا۔ میں نے
کبھی اس مٹی کی خشبو کو اپنے تن بدن میں رچی بس نہ جانا تھا جتنا ۳۵ سال کی جدائی کے بعد

آج میں اس سائیڈنگ پر گاڑی کے سامنے کھڑے ہو کر محسوس کر رہا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ واقعات اہم نہیں لگتے۔ یادیں انہیں اہم بنا دیتی ہیں۔ سانپ گزر جاتے ہیں لیکن نگہیں نہیں ہٹتیں۔

اشفاق حسین نے مجھے ہازو سے پکڑ لیا۔ ”آؤ بیٹھ جائیں“۔ وہ بولا اور اس نے مجھے تھمیت کر ایک بیچ پر بٹھا دیا۔ ”میں تھک گیا ہوں“۔ وہ بولا۔

”گورو اسپور یاد آ رہا ہو گا“۔ میں نے کہا۔

”ہاں گورو اسپور یاد آ رہا ہے۔ کتنی بمیلنگ یاد ہے۔“

”بمیلنگ“۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں۔ تمہیں پتہ نہیں تم تو نوکری چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میں اس وقت گورو اسپور سے نکلا تھا بپ کمر کمر سے دھوس نکل رہا تھا۔ سڑکوں پر ٹون بھا ہوا تھا۔ خوف زدہ عورتیں اور بچے چل رہے تھے۔ لوگوں کو اتنی مصلحت نہیں دی جا رہی تھی کہ وہ ریفریجری کیپ تک پہنچ سکیں۔

دفعتاً پنڈت کوٹ جانے والی گاڑی نے کوک ہادی اور وہ استہ استہ رینگنے لگی۔ رینگتی رہی رینگتی۔ اور امرتسر کالیٹ فارم خالی رہ گیا۔ خالی اور دیرین۔ دور گاڑی کی سسکیاں لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور اجڑے ہوئے پلیٹ فارم پر دو بٹالے اور گورو اسپور کے دیوانے تین تھاپٹے تھے۔

نو آبجکشن

جب ہم دونوں شیشن سے باہر نکلے تو پورنگیو کے پاس بڑی روٹی تھی۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ ۳۵ سال قبل تو وہاں صرف چند ایک بہو کات اور ٹانگے کھڑے نظر آتے تھے۔ اب ٹانگے بھی تھے۔ ٹیکسیاں بھی، موز اور سائیکل رکشا بھی۔

میں اس وقت لیڈر صاحب تشریف لے آئے۔ ان کے چہرے پر بشارت کا دھبہ غلاف چڑھا ہوا تھا۔ سب معمول بڑے اخلاق سے ملے۔ آٹھیس چکا کر بولے۔ ”دیکھا ہم نے سارے اٹھاسی روپے وصول کئے“۔

ایک ساعت کے لئے ہم بھٹا گئے۔ بات سمجھ میں نہ آئی۔ پھر انہوں نے خود ہی

وضاحت کی کہنے لگے۔ ”اگر آپ نے روپے بدلے ہیں تو سامنے چوک میں چلے جائیے۔ وہاں ایک سردار صاحب کی دوکان ہے۔ مٹی اکھیچھینز کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ وہ سو پاکستانی کے ساڑھے اٹھاسی ہندوستانی دیں گے۔“

”شکریہ جناب۔ ہم نے تو سب بدل لئے۔“ میں نے کہا۔

”ہلری گاڑی کب جائے گی۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”رات کو ساڑھے نو بجے۔“ وہ بولے۔ ”ابھی بہت دیر ہے۔“

”اگر قابل اعتراض نہ ہو تو ہم امرتسر کا ٹیک پکڑ لگالیں۔“ میں نے پوچھا۔

”بالکل بالکل۔“ وہ بولے۔ ”سیکورٹی نے اجازت دے دی ہے ڈائریز چاہیں

تو وہ محکمہ پھر سکتے ہیں۔ بس وقت کا خیال رکھئے۔ نو سے پہلے شیش پر پہنچ جائیے۔ باقی نو آجکشن۔“

ہم نے ہانک کر کیا اور اس میں بیٹھ کر ہل بازار کا پکڑ لگانے چل پڑے۔

سامنے ریلوے کا اور برج تھا۔

وہی پل جس سے گزر کر میں روڈ کالج جایا کرتا تھا۔ آسموں کی کوٹھی سے کالج تک

چار پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ لیکن وہ فاصلہ بدلے لئے ہمارے کلفت نہ تھا۔ پھر یہ مشکل بھی دور ہو گئی۔

پرنسپل میرے ابا کے دوست تھے۔ انہوں نے والد صاحب کو لکھا کہ پور ڈنگ کالج

سے بہت دور ہے۔ پیدل آنے جانے میں لڑکے کا وقت ضائع ہوتا ہے اس لئے بہتر ہو گا کہ

آپ اسے ایک سائیکل خرید دیں۔ اس پر والد صاحب نے مجھے ایک سائیکل خرید دیا تھا۔

نیا نیا سائیکل ملا تو سائیکل چلانے کی خوشی اس قدر طاری ہوئی کہ سب کافیتھیں دور ہو گئیں۔

سائیکل پر میں سدے امرتسر میں گھومتا پھرتا تھا۔ ہر بند کھڑکی کی طرف اس امید پر

دیکھتا کہ ابھی وہ کھلے کی اور جین کی لوٹ سے ایک جھمکم چرا بھانگے گا۔ ہاں میں ہی ہوں۔

میں تانی ہوں صوفی کی بہن۔ وہی جیسے تو نے ابا لے میں دیکھا تھا۔ پھر وہ شرابا کر کھڑکی سے

پچھے ہٹ جائے گی اور زندگی میں اس شہر نکلن سے بدل آ جائے گی۔

”یہ ہے جی ہال دروازہ“۔ تاکے والے سمجھنے لگا۔ ”لیکن اب اسے کاندھی گیٹ کہتے ہیں۔ بازار کا وہی نام ہے ہال بازار۔ صرف دروازے کا نام بدل گیا ہے۔“

میرے روز وہی ہال گیٹ تھا جسے میں امرتسر گیٹ سمجھا کرتا تھا۔ ہال گیٹ میں داخل ہو کر مجھے سکون سا مل جاتا کہ میں امرتسر میں آ پہنچا ہوں۔ اور دل پر اک ایسا اطمینان سا طاری ہو جاتا جیسے بچہ ماں کی گود میں محسوس کرتا ہے۔ ہال بازار وہی ہال بازار تھا وہی دکانیں وہی کھلی سڑک وہی گسٹا کھی وہی بھیڑ۔ لیکن یہ بھیڑ وہ بھیڑ نہ تھی۔ اس بھیڑ میں ایک فراغت تھی ایک رنگینی تھی ایک بے نیازی۔ اس بھیڑ میں وہ رنگینی نہ تھی۔ لوگ خرید و فروخت کی دھن میں گئے ہوئے تھے۔ سیر و تفریح کا انداز نہ تھا۔ شمل لگانے والی چال نہ تھی۔

ہال بازار کمرشل ہو گیا تھا۔ لیکن امرتسر تو ہیٹھ سے کمرشل تھا۔ بہت بڑی منڈی تھی۔ کپڑے کی منڈی۔ زیورات کی منڈی۔ اجناس کی منڈی۔ جزیل مرچ بھنسی کی منڈی۔ پتہ نہیں کیا بھیڑ تھا کہ ان دنوں کمرشل ہونے کے باوجود وہ کمرشل محسوس نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ بات نہ تھی۔ وہ احساس فراغت نہ تھا۔ آنکھوں میں رنگین چمک نہ تھی۔ چالوں میں وہ لٹک نہ تھی۔

”یہ ہے مدراج گھنٹیاں داکٹر“۔ تاکے والے نے کہا۔ میرا دل کچھل کر منہ میں آ گیا۔

راگ کی مینڈھ

گھنٹیا کا کٹڑہ تو امرتسر کا دل تھا۔ اب اتنی رنگینی، اتنی لے، اتنی مٹھاس، اتنی سرچسپہ امرتسر راگ ہو اور گھنٹیا کا کٹڑہ راگ میں لگی ہوئی مینڈھ ہو۔ حالانکہ اس زمانے میں گھنٹیاں کا امیرے لئے ہر جہت تھا۔ ٹیپو تھا۔

اس زمانے میں میں اس عمر میں تھا جب بے پردہ عورت لاجول پڑھنے کے لائق تھے

ہوتی ہے۔ ایک ناپاک مصنوع موضوع۔ زندگی کا ایک ایسا پہلو جس پر جلی قلم سے "مت" لکھا ہوتا ہے۔ خبردار قسم کا مت۔

اس دور کے نین فتح میں زندگی کے دو پہلو ہوا کرتے تھے۔

ایک کرو۔ ضرور کرو۔ لانا کرو۔ ورنہ۔۔۔

اور دوسرا مت کرو۔ خبردار ورنہ۔۔۔

نین ایگز کے لئے کٹڑا گھنیاں پر جلی حروف میں مت لکھا ہوا تھا۔ مت مگرو۔

مت دیکھو۔ مت سنو۔ مت مت مت۔

کٹڑا گھنیاں طوائفوں کا کٹڑا تھا۔ لہجی ذات کی طوائفوں کا۔ ان کے انداز میں ایک وقار تھا ایک بے نیازی تھی۔ ان کے چہلوں میں مشرقی تمدن کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ طوائفیں تھیں جن کے ہاں بادشاہ اور راجے مہاراجے اپنے بچوں کو تہذیب اور اخلاق سیکھنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ ان کے پاس شائستگی تھی، حسن تھا، لے تھی، رنگ تھا، راگ تھا۔

جب میں کٹڑے سے مگروا کرتا تھا تو میری گردن جھک جاتی تھی۔ وہ مت جو بچپن سے مجھ پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ اس کا بوجھ اس قدر بڑھ جاتا کہ گردن نہ اٹھتی لیکن میرے کان کھل جاتے یوں جیسے ریکارڈر کا ٹین کھل جاتا ہے تاکہ وہ ساری دل آویز آوازیں سمیٹ کر اپنے دل کا دامن بھروا۔

کٹڑے سے مگرتے ہوئے میری تمام حیات جاگ اٹھتی۔ اس وقت میرے دل میں صرف ایک خواہش ابھرتی کہ کاش میں گردن اٹھا کر ایک نظر اوپر دیکھ سکوں۔

جب میں کٹڑے سے مگروا تو مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے سبھی دوکاندار اور دلوگیر مجھ پر نظریں پکڑے بیٹھے ہیں۔ وہ حیران ہیں، خشکیں ہیں کہ یہ ادھر سے کیوں گزرا رہا ہے، کیوں۔ اس پر مجھے پالینے آ جاتا۔

وہ تو شکر ہے کہ کٹڑے کے عین درمیان میں ایک سینما ہال بنا ہوا تھا۔ اگر وہ ہال نہ ہوتا تو شاید میں کٹڑے سے گزرنے کی بھی جرأت نہ کرتا۔

مگرتے ہوئے خود کو قتل دینے کے لئے اندر سے آوازیں اٹھتی رہیں۔ میں تو سینما دیکھنے جا رہا ہوں۔ میں تو فلم دیکھنے میں... کٹڑے سے تو نہیں گزرا رہا۔

یہ وہی کھڑا تھا جس کے مقب میں پچاس سال پہلے ایک کھڑی کھلی تھی اور اس کھڑی سے ایک مجسمہ پڑے نے جمائک کر کہا۔ یہ میں ہوں۔ میں تانی صوفی کی بہن۔ تو جب بھی اوسر سے گزرتا ہے اوپر دیکھتا ہی نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے کھڑی بند کر دی تھی۔

یوں نین منج بہت کے خواب کی تعبیر ہو گئی تھی۔
 مانگے والے نے کھڑا گھنٹیاں کے موڑ پر ناٹکاروک لیا۔ میں نے کھڑے کی طرف نگاہ دوڑائی۔

چوبدے سب بند پڑے تھے۔ بازار میں لوگ چل پھر رہے تھے۔ اس کے باوجود بازار دیہان تھا۔ نہ وہ رنگ تھا نہ رس تھا۔ وہ ایک عام سا بازار تھا۔
 موڑ پر خود اسے حید کھڑا تھا۔ اس کی گردن لٹکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں رنگ پکھاری کی پھول کی بجائے آسمو تھے۔

”دیکھا“۔ اسے حید نے کہا۔ ”خاندوں نے کیا کر دیا۔ سب اجڑا کر رکھ دیا۔ اب یہاں نہ رنگ ہے نہ رنگ پکھاریاں ہیں۔ امرتسر کی بوتل میں وہ شوں نہیں رہی۔“

مانگے والا پھر چل پڑا۔ بولا۔ ”باو جی ہزارہ ہوا تو امرتسر کے ڈپٹی کمشنر نے کھڑے کی سب گانے دانوں کو حکم دیا کہ وہ کھڑے خالی کر دیں۔ یہ دربار صاحب کھشہ ہے۔ اسے ایک پاک صاف شر ہونا چاہئے۔ یہاں طوائفوں کا بازار نہیں ہو گا۔ اب کھڑے کے چوبدوں میں گھر والیاں رہتی ہیں۔“

وہ بھی تو گھر والیاں تھیں۔ میں نے سوچا۔ وہ گھر والیوں سے بھی زیادہ گھر والیاں تھیں۔ انہیں پتہ تھا کہ گھر والی کسے کہتے ہیں۔

میرے سامنے ممتاز بیگم آکھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آسمو تھے۔ بولی۔ ”دیکھ لو۔ کوئی بھی طوائف کو نہیں سمجھتا۔ کوئی سمجھتا ہے کہ کھڑا ہی ہے۔ دوسروں کو کھڑا بنا کر من سے کیلاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کھڑا ہے جس سے تلاش بین گھڑی دو گھڑی دل ہلانے کے لئے کھیل لیتے ہیں۔ کسی کو پتہ نہیں طوائف نے عورت کو اپنی کٹی میں پاندھ رکھا ہے۔ گھر والی بننے کی آرزو اس کے اندر یوں بھری ہوتی ہے جیسے مالٹے میں رس بھرا ہوتا

ہے۔ اوپر سے دیکھو تو سخت چھلکا کاڑ تو شرابور ہو جاتو۔

ہئے۔۔۔ گھر والی ہوتی

ممتاز بیگم عبدالحق کے عشق میں دھندہ چھوڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے حواری سناٹے نوکر چاکر سب اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ چوہدرے میں وہ تن تھارہ گئی تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد عبدالحق کی راہ دیکھنا تھا۔ انتظار۔ انتظار۔ انتظار اور عبدالحق طبعاً اتنا بے نیاز تھا کہ یہ جانتے ہوئے کہ وہ بیٹی اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ چار چار دن اور ہر کارِ غریب نہیں کرتا تھا۔

میں نے ممتاز بیگم سے پوچھا۔ ”تو نے دھنداکیں چھوڑ دیا۔“

”جی نہیں چاہتا۔“ وہ بولی۔

”کیا جی چاہتا ہے تیرا۔“

”میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس کی گھر والی بن جاؤں۔ اس کا انتظار کروں۔ اس کے لئے ہانڈی پکاؤں۔ اس کی جراثیں دھوؤں۔ جب وہ تھکا ہوا گھر آئے تو اس کے بوٹ انکروں۔ پاؤں دباؤں۔“

”حیرت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”طوائف گھر والی بننا چاہتی ہے۔“

”تم طوائف کو نہیں جانتے۔“ وہ ہنسی۔ ”یہ جتنی بھی طوائفیں کٹڑے میں بیٹھی

ہیں۔ ان سب کے دلوں میں یہی آرزو ہے کہ کسی اپنے چلتو کے مرد کی گھر والی بن جائیں۔“

”وہ تو شہزادیاں ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ تو سب کے دلوں پر راج کرتی

ہیں۔“

”اونسوں۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔ ”راج ایک کے دل پر ہوتا ہے سب کے دلوں

پر نہیں۔ اور ایک کے دل پر راج کرنے کے لئے اس ایک کی ہانڈی بننا پڑتا ہے۔“ اس کی

آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان آنسوؤں نے مجھے چپ کرا دیا۔ اور ہم دونوں دیر تک

چپ چاپ بیٹھے رہے۔

”ایک بات پوچھوں۔“ میں نے کہا۔

"پوچھ۔ پوچھتا جا۔ میں جواب دیتی جاؤں۔ بے میری کتنی آرزو ہے کہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ وہ بھی جب بھی آتا ہے تو اپنی کتاب لے۔ میری نہیں پوچھتا۔ پوچھ تو چپ کیوں ہو گیا۔"

"میں پوچھنا چاہتا تھا کہ تو بن ضمن کر کیوں نہیں رہتی۔ اتنے میلے کپڑے پہنے دینی ہے۔"

"بست بن ضمن لیا۔ بن ضمن کر موبسما بنا ہوتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ میرا جی کرتا ہے میرے منہ پر توڑے کی کلک لگی ہو۔ ہاتھ کام کاج کی وجہ سے لت پت ہوں۔ جگہ جگہ ایساں جلیاں لگی ہوں۔ ہانک ہی گھر والی نظر آؤں۔"

"آئی ہے۔ ہانک ہی آئی ہے تو۔" میں نے کہا۔

"ج۔" خوشی سے اس کے منہ پر سرخی جھلکی۔

"ہاں تجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تو چوہا ہے کی ہے۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ والاندہ انداز سے اس نے ہاتھوں کے متعدد پٹائے۔ فرحت کی اور پھر ایک پوڑی بنا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں کتنی خوش ہوں۔" وہ بولی۔ "پر تو میرا دل تو نہیں رکھ رہا۔"

"سیں۔" میں نے کہا۔ "پر میں خوش نہیں۔" "کیوں۔" وہ بولی۔

"یہ سب کب تک چلے گا۔" میں نے پوچھا۔

"نہ نہ نہ۔۔۔ یہ بات نہ کر۔" وہ بولی۔ "جب تک چلے گا چلے گا۔"

"پھر۔۔۔ میں نے پوچھا۔

"چپ۔ مت بول۔ پھر نہیں سہا کرتے۔ جو میں پھر کے چکر میں آگئی تو یہ

سلی روشنی رنگ رس ختم ہو جائے گا۔ اندھیرا چھا جائے گا۔"

"وہ حیرا ہو جائے گا کیا۔" میں نے بات کا رخ بدلا۔

کون۔

عبداللہ۔

"صرف ایک دن کے لئے بھی میرا ہو جائے تو بس میرے لئے یہی بہت

ہے۔"

میرے سینے میں ایک ٹھیس لگی۔

اس نے آہ بھری۔ بولی۔ ”ایک ہفتہ، ایک دن، ایک گھنٹہ، ایک گھڑی کے لئے وہ مجھ میں کھل جائے جیسے شکر پانی میں کھل جاتی ہے۔ پھر نہ پانی رہتا ہے نہ شکر۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اشفاق حسین نے مجھے کھنی ماری۔ ”کہاں ہے تو؟“ وہ بولا۔ ”دیکھتا کیوں نہیں تو؟“

”کیا دیکھوں؟“ میں نے کہا۔ ”کچھ دیکھنے کو ہے کیا؟“

”یہ اتنے سارے لوگ جو چل پھر رہے ہیں۔“

”یہ سب کاہے ہیں۔ اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ بڑی ہیں۔ انسان اس وقت باہر نکلتا ہے جب کام ختم ہو جاتا ہے۔ ان دنوں بازاروں میں انسان گھومتے پھرتے تھے۔ اب کای ہیں۔ لونوں۔ یہ وہ امرتسر نہیں۔“

اشفاق حسین بولا۔ ”ہاں یار! یہاں کسی عورت کی خشبو نہیں آئی۔“

پدمنی

”ارے؟“ میں چونکا۔ ”واقعی نہیں آئی؟“

”کیا امرتسر کی عورتیں باہر نہیں نکلتیں؟“

”نکلتی ہیں۔ کیوں نہیں نکلتیں۔ ہاں بازار میں میں نے چار ایک دیکھی تھیں۔“

”ج؟“ وہ بولا۔ ”میں نے تو نہیں دیکھیں۔“

”عورتیں تو تھیں لیکن ان میں خشبو نہیں تھی۔ اس لئے وہ گنزد گئیں اور ہمیں بہت ہی نہیں چاہا۔“

ہمارے زمانے میں امرتسر عورت کی خشبو سے یوں بھرا رہتا تھا جیسے گرمیوں میں پھل منڈی آسوں کی خشبو سے بھری رہتی ہے۔

اس زمانے میں امرتسر حسن سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں کشمیری آباد تھے۔

بے لک کشمیر میں رنگ ہوتا ہے، روپ ہوتا ہے، طہ و نعل ہوتے ہیں، مگر حسن

نہیں ہوتا۔ رنگ روپ اور خود غفل میں جب تک ذہن شامل نہ ہو حسن نہیں بنتا۔ کشمیری کو کشمیر سے نکال کر ہنابل میں لے آؤ۔ ہنابل کی ہوا میں اسے سکھائے۔ پھر ہنابل کے پانی کے چھینٹے دو تو ایک عجیب سا ضمیر اٹھتا ہے حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ صرف عورتوں کی بات نہیں کشمیری مرد بچے، بوڑھے سبھی امرتسر میں آکر حسین بن گئے تھے۔ مردوں کی آنکھوں سے رنگ کی پھوار اڑنے لگی تھی۔ بوڑھوں کے چہرے نورانی ہو گئے تھے۔ بچے معصومیت کے حسن سے لدہمند گئے تھے۔ کشمیریوں میں شعور پیدا ہو گیا کہ وہ حسین ہیں۔ حسن کا شعور پیدا ہو جائے تو پھر دیکھتے ہی دیکھتے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔

پھر لائیں چھیں مثالی ہند کی مثالی ہندو قوم اپنے حسن کی وجہ سے مشہور ہے۔ لائیں بڑی کوئل ہوتی ہیں۔ ان کے حسن میں معصومیت ہوتی ہے۔ دھیمپن ہوتا ہے۔ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ چمک نہیں ہوتی۔ بھڑک نہیں ہوتی۔ یہ سب ہندو روایات کی وجہ سے ہے۔ رحمت بہت اور خوراک کی وجہ سے ہے۔

ہندو قوم ایک قدیم قوم ہے۔ ہندو کردار میں بڑے مثبت عناصر ہیں۔ ان میں قتل ہے، شفا ہے، جگڑ ہے۔ رکھ رکھاؤ ہے۔ خود داری ہے۔ سبھی کچھ ہے بس وہ ایک مثنوی وصف کی وجہ سے مہک گیا۔ ہندو کی ہڈی میں اونچ نیچ ایسی رس بس گئی کہ نکالے سے نہیں نکلتی۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے۔ ہندو بڑی خود دار قوم ہے۔ ان کے پلڑے عورت کو آنکھ اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ جیسی تو ہندو عورت جھکی جھکی آنکھوں والا حسن رکھتی ہے۔ لالچ بھرا حسن۔

ہندو عورت میں حسن تو عام ہوتا ہے لیکن عورت کم کم ہوتی ہے۔ حسن اور چیز ہے عورت اور چیز۔

اس عظیم حقیقت کو سب سے پہلے چنڈت کو کانے محسوس کیا تھا۔ صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اپنے کام شاستر میں اس کی وضاحت بھی کر دی۔

چنڈت کو کاکتے ہیں کہ سب سے زیادہ حسین عورت پدمنی ہوتی ہے۔ لہذا جب بھی شادی کرو۔ پدمنی سے کرو۔

پتہ نہیں کہ ایسا کیوں ہے مگر ایسا ہے کہ عورت پنشنی حسین ہوگی اتنی ہی اس میں

عورت کم کم ہوگی۔ بھٹی عورت زیادہ ہوگی لہذا ہی حسن کم کم ہو گا۔

عورت میں مانگ ہے۔ وہ سراسر مطالبہ ہی مطالبہ ہے۔ اتنا مطالبہ کہ اسے پورا کرنے کی مرد میں قوت ہی نہیں۔

حسینہ میں مطالبہ کم ہے ممتاز زیادہ۔

حسینہ ایک خوشگوار اثر پیدا کرتی ہے۔ عورت آگ لگا دیتی ہے، جیسی ہندی میں اسے باری کہتے ہیں۔

آج کی دنیا میں پچھلی جنس جنس نہیں باری جنس جنس ہے۔ پچھلی سے یہ خوشبو نہیں آتی۔ وہ یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ رک جاؤ۔ دیکھو میری طرف دیکھو۔ دیکھو میں باری ہوں۔ دیکھو اور سکو۔

بشریسانی

دفترا آگے دلا چلا۔ ”مدارج یہ چوک فرید ہے۔“

”چوک فرید“ — میں چوکا۔

”اونٹوں۔ یہ تو چوک فرید نہیں۔ یہاں تو سناٹا چھایا ہوا ہے۔ نہ وہ نعرہ مستان

ہے۔ نہ وہ لٹکار ہے۔ نہ وہ غنڈہ بازی ہے۔ نہ کوئی شعر پڑھ رہا ہے نہ بابیا گنگنارہا ہے۔ یہ تو کوئی شریف آباد گنگا ہے۔“

چوک فرید میں بشر کو نے سے لگا کھڑا تھا۔ ہاتھ دپے ہی جیسے وہ بچپن برس پہلے کھڑا ہوا تھا۔ شرابا شرابا، لچایا لچایا، ڈر ڈر، سہا سہا۔

بشر میرا ہم جماعت تھا۔ اونچا۔ لمبا گورا چٹا۔ حسین۔

حسن نے اس کی ذہنی حرام کر رکھی تھی۔

چوک فرید کی ہر لڑکی دل و جان سے اس پر فدا تھی۔ پتہ نہیں بشر کی کوئی خصوصیت انہیں بھاگتی تھی۔ اس لئے کہ وہ اونچا لمبا تھا۔ گورا چٹا تھا یا اس لئے کہ وہ بات بات پر شرابا چاتا تھا۔

چوک کی ہر لڑکی کی خواہش تھی کہ وہ صبح سویرے اس کا منہ دیکھے اور سلام کرے۔

یہ بات بشر کے لئے سہان روح تھی۔ کالج میں میں بشر کا واحد دوست تھا۔ اس لئے وہ اپنی

جملہ مصیبتوں کا روٹا میرے سامنے روڈ کر رہا تھا۔ آج سلطان نے مجھے چہ سلام کہے۔ آج ہمارے
نے مجھے فلائنگ کس پھینکا۔ آج صبحی نے دور سے ہاپس پھیلا کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ ہائے
اب کیا ہو گا۔ ضرور کسی نے دیکھ لیا ہو گا۔

بڑی دہلیات لڑکیاں ہیں جو ایسی بیوہ حرکتیں کرتی ہیں۔ میں منہ دہانی اس سے
بھردی کرتا اور دل ہی دل میں آپس بھرتا۔ کاش کوئی مجھے بھی سلام کرتی۔ کوئی
فلائنگ کس میری طرف بھیجتی۔

پھر وہ دن بھی تھا جب بٹرنے گھنٹیاں کے کٹڑے کی سینا میں مشاعرہ کروا دیا تھا۔
بٹرنے خود شاعر تھا۔ بٹرنے کی مجلس کرتا تھا۔ اس مشاعرہ میں ساغر سیمائی آیا تھا۔

تو پھر اس قدر چٹپٹ، جون اور پھر ان جنک اس میں ذرا جھجک نہ تھی۔ سینا کے
مقابل کے چوہے والی نگاہی طوائف کو دیکھ کر میں مست ہو گیا جیسے ساپ بین پر ہوتا
ہے۔ ہاں چھوڑ کر سینا کے صدر دروازے کی میز چھوڑ کر آبیض اور ترنم سے گاہنی کو شعر
سنانے لگا۔

نظر کو ہے عادت تھا، جہاں ہو، جیسے ہو، جس طرح ہو

کوئی یہ حسن ازل سے کہہ دے کہ جلوہ آرا ہو جس طرح ہو

نہیں نہیں یہ تو بیک فریڈ نہیں ہے یہ تو بیک مستقیم ہے۔ یہاں کوئی میر می بیک نہیں
ہے۔ سب سیدھی۔ سیدھی تنگ۔ نہ کوئی نعرہ لگا رہا ہے۔ نہ مٹنے کا بول لگا رہا ہے۔ نہ رات
چلتی کو چھیڑ رہا ہے۔ نہ سوچے پر ٹکڑے رہا ہے۔ نہ بڑھک رہا رہا ہے۔ نہ آوازہ کس رہا ہے۔
نہیں یہ چوک فریڈ نہیں ہو سکتا۔

اسی چوک فریڈ میں پہلی بار میں اُس ڈرے ڈرے ہمارے سے ملا تھا۔ جسم صاف
سترا، لباس بالکل۔ کڑھی ملل کا کرتا۔ ننھے کی شلووار، لڑتے ہاں، بڑی بڑی آنکھیں، ذہین
تیزادب۔

ان دنوں وہ روسی کہانیوں کے ترجمے کرنے میں مصروف تھا۔

میں نے کہا۔ "یہ کیا کر رہا ہے تو؟"

تنگ کر پولا۔ "ترجمہ"

"ترجمہ کیوں؟"

"ترجمہ کیوں نہیں"۔ اس کی پیشانی پر تیوری پڑ گئی۔

"طبع زاد کیوں نہیں"۔ میں نے کہا۔

"نہیں ابھی نہیں"۔

"کیوں نہیں"۔

"ہاں نہیں"۔

"وجہ"۔

"ابھی برتن نہیں بھرا"۔

"کون سا برتن"

"پہلے برتن بھرتا ہے پھر چمکتا ہے"۔ اس نے پیٹک کے بڑے بڑے شیشوں سے مجھے گھورا۔

"کتنی دیر سے تو برتن بھر رہا ہے"۔ میں نے پوچھا۔

"برتن جو بڑا ہے"۔

وہ گورا چٹا سا سا برتن سعادت حسن قصابو بھر کر مٹوین گیا اور پھینکے اڑانے لگا۔

جب آنگا دو بارہ اور پرچ پر پہنچا تو اشفاق حسین نے مجھے کھٹی ماری۔ "دیکھو" وہ بولا۔ "بھائی"

پل کے دنگل کے ساتھ ساتھ ایک پٹنی سٹری سٹری چاری تھی۔ اس کی آنکھیں ہلکی ہلکی تھیں۔ سفید رنگ پر لالچ کی سرخی بھللا دی تھی۔

اسر تر میں وہ واحد حسینہ تھی جسے ہم نے دیکھا۔ مڑ مڑ کر دیکھا۔ بار بار دیکھا۔ لیکن اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔

اشفاق حسین منگلتے لگا۔

"ماٹھے پر ہڈی آنکھ میں جاو"

شیشوں پر پہنچے تو آگے والا سکھ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مدار لچ کوئی اور سیوا۔ اس وقت اس میں ہندو کا بھڑقا اور سکھ کا غلوں تھا۔ میرا جی پاؤں پر ہندو کر اسے گلے سے لگا لوں لیکن مجھ میں جرات نہ پڑی۔ ہر حال ہم آگے والے سے یوں جدا ہونے

جیسے سالہا سال اٹھنے رہنے کے بعد بچھڑ رہے ہوں۔

پتہ نہیں لیا کیوں ہوتا ہے، مگر ایسا ہوتا ہے، اکثر ہوتا ہے۔ ایک شخص کے ساتھ آپ گھنٹوں بلکہ دنوں رہتے ہیں اور جدا ہوتے وقت کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے کچھ فرق نہ پڑا ہو۔ ایک شخص کے ساتھ آپ چند گز یاں اکٹھی گزارتے ہیں اور جدا ہوتے وقت اور بعد میں بھی دنوں احساس جدائی سے جھپکتے رہتے ہیں۔ اس وقت شام ہو چکی تھی۔ سوال یہ تھا کہ کیا کھائیں، کھان کھائیں۔

ہم میں سے — مگر نہیں

ابھی اس مسئلے پر سوچ ہی رہے تھے کہ ریٹ ہاؤس سے بلاوا آگیا۔ آؤ آؤ اپنے حصے کی رقم وصول کر لو۔

”رقم — کون سی رقم“ — میں نے پوچھا۔ ”رقم تو ہم لے چکے“۔

اشفاق حسین ہنسا۔ ”یار ہمیں فلان انکس پیج دینے کی ذمہ داری جی آفس پر ہے

۱۰۰ روپے کی جو رقم ہم نے جمع کرائی تھی اس میں سے وہ ہمیں ہندی کرنسی بھی تو دیں گے۔“

جب ہم ریٹ ہاؤس میں داخل ہوئے تو خیمے کے مقابل میں ایک پلاٹ میں جملہ لیڈروں بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے رجسٹر کھول رکھا تھا۔ اس کے روبرو زائرین کی قطار لگی ہوئی تھی۔

”یہ لوگ خیمے میں کیوں نہیں بیٹھے“ — میں نے پوچھا۔

”خیمے میں زائرین کے درمیان میں بیٹھیں کیا“ — اشفاق حسین نے کہا۔ ”یہ

کیسے ہو سکتا ہے۔ —“

”کیوں نہیں ہو سکتا“۔

”کیا وہ ہم میں سے نہیں ہیں“۔

”بھئی وہ لیڈر ہیں“۔ وہ ہنسا۔

اشفاق جی کھتا تھا۔ وہ ہم میں سے ہونے کے باوجود ہم میں سے نہیں تھے۔

جب وانا کے دربار میں زائرین کو پار پر سائے گئے تھے تو انہیں وہ پار نہیں پر سائے گئے

تھے جو باقی زائرین کے گھوں میں ڈالے گئے تھے۔ ان کے ہر خصوصی تھے۔
جب دستار بندی ہوئی تھی تو لیڈر ان کرام کی دستاریں خصوصی تھیں۔
جب ہم لاہور سے واپس کی طرف ہوں میں روانہ ہوئے تھے تو ان کے لئے خصوصی
وٹمن کا انتظام تھا حالانکہ ہوں میں بہت سی جنگیں خلی تھیں۔

جب ہم ہندوستانی بارڈر سے روانہ ہونے والے تھے اور ہماری آنتیں بھوک کے
مارے قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں تو وہ ہمارے سامنے ہندوستانی اہلکاروں کے ساتھ کھڑے
ہونے لچ کھارہے تھے۔

جب ہم نے امرتسر کے شیشن پر بسٹ ہاؤس کے نیچے میں اڑا بھایا تھا تو انہوں نے
نیچے سے دو دھڑکے سامنے پلاٹ میں ڈیرا بھالیا تھا۔ حالانکہ وہاں الگ جینے میں بظاہر کوئی اختیار
نہ تھا۔ پھر بھی وہ ہم میں نہیں بیٹھے تھے۔

پتہ نہیں اس علیحدگی کی کیا وجہ تھی۔ ہر حال ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے زائرین کے
اس جتنے میں دو قومیں موجود تھیں۔ ایک زائر دوسرے لیڈر۔ اللہ جسے چاہے عزت
وے۔

چوگا

"نمبر ۳۰۳" رقم ہانٹنے والے لیڈر کی آواز آئی۔ ارد گرد کھڑے ساتھیوں نے
اسے دہرایا۔ ایک صاحب بولے "چالیس نمبریں میں ہیں"۔
"یہ کھڑے ہیں"۔ دوسرے زائر چلانے اور میری طرف اشارہ کیا۔ پھر مجھ سے
بولے۔ "آپ چالیس نمبر ہیں نا"۔

"میں"۔ میں نے چونک کر کہا۔ "میں کیا نمبر ہوں"۔
"نمبر یاد رکھئے، اس میں سولت رہتی ہے"۔ لیڈر اپنے معمول کے مطابق پتہ
افلاط سے بولے۔

"جی میں یاد رکھوں گا۔ دراصل میں نے نہ تو کبھی پولیس میں نوکری کی ہے نہ
جیل میں رہا ہوں، اس لئے نمبر سے ہاؤس نہیں ہوا"۔

خزانچی لیڈر نے ایک سو روپے کا بھدلی ٹوٹ میرے ہاتھ میں چھما دیا اور دستخط

کرنے کے لئے رجسٹر آگے بڑھا دیا۔

اشفاق حسین کا نمبر ۳۱ تھا۔ میرے بعد وہ رقم لینے کے لئے آگے بڑھا۔ دائرین میں چہرے گونیاں ہو رہی تھیں۔

"یہ کیا۔ سو روپیہ دے کر مل دیا۔"

"نہیں نہیں ابھی غور دیں گے۔"

"ڈھائی سو دیں گے ڈھائی سو۔"

"کب دیں گے قسطوں میں دیں گے کیا۔"

"ہائل ہائل۔ بڑے بوڑھے بچوں کو تھوڑا تھوڑا دیتے ہیں تاکہ ایک دم سدا کا بی کر لڑا نہ دیں۔"

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔

چھوٹی ڈاڑھی

بیارے بچہ مبر کرو۔ مبر کرو۔ ضرور ملے گا۔ تھوڑا تھوڑا ملے گا۔ جیسے چہ کا ہوتا ہے۔

اگلی قسط دلی میں ملے گی۔ ایک نوٹوں کی آدمی بڑی بے تکلفی سے دائرین کے جھرم میں آداخل ہوا۔

میں نے اسے غور سے سے دیکھا۔ یہ ہم میں سے نہیں ہے۔

وہ ایک دھڑا پٹا نوٹوں تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی۔ لمبا نہ۔ بے جھجک انداز۔

بے تکلف گفتگو۔ بے چین۔ ابھی یہاں قہقہاں وہاں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ہر بات کا علم تھا۔

میں نے اشفاق حسین کو کبھی ماری۔ "بیارے یہ شخص کون ہے۔"

"پتہ نہیں" وہ بولا۔

"یہ ہم میں سے ہے کیا؟"

"اہلے ساتھ تو نہیں آیا۔"

"لیکن اس وقت تو یہ ہم میں سے دیکھتا ہے۔"

"ہاں" وہ بولا "اس کا بیگ خیمے میں پڑا ہے۔"

"شاید لیڈران کرام میں سے ہو۔"

"اوسوں۔ لیڈروں میں سے ہوتا تو کیا زائرین کے خیمے میں بیہل کرتا۔"

"چلو بھٹو ہو گا کوئی۔" میں نے کہا۔

رقم وصول کرنے کے بعد پھر وہی سوال ابھرا۔ کیا کھائیں کدیں کھائیں۔

"میں تو ابھی کسی مسلمان کی دکان سے کھوں گا۔" اشفاق حسین نے کہا۔

"ارے تم تو ہندو بن گئے۔"

"کیوں" وہ بولا۔

"تقسیم سے پہلے مسلمان نے بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ ہندو دکان ہے کہ مسلمان کی دوکان ہے۔ مسلمان نے بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ ہندو پانی ہے یا مسلمان پانی ہے لیکن ہندو ہمیشہ یہی سوچتا تھا چاہے کتنی بھی پیاس لگی ہوتی وہ ہندو پانی کا انتظار کرتا تھا۔ مسلمان کی دوکان سے کھانے پینے کی کوئی چیز لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو مسلمان کر پانے سے بھی سودا نہیں خریدتا تھا۔"

"تم جو بھی چاہے کو لیکن میں تو مسلمان کی دوکان سے کھوں گا۔" اشفاق حسین

بولا۔

"یہاں مسلمان ہوٹل کدیں" میں نے کہا۔

دفتر بھانڈیوں سے وہی پھوٹی واڑھی والا نوجوان نکل آیا۔ بولا مسلمان کا ہوٹل ہے۔

"یہاں امرتسر میں؟"

"ہاں یہاں امرتسر میں۔ ریلوے سٹیشن کے سامنے وہ جو سامنا چوک ہے نا۔ وہاں سے ہمیں ہاتھ مز جاؤ۔ دائیں طرف چڑھی دکان۔"

"دال مل جائے گی وہاں۔" اشفاق حسین نے پوچھا۔

"دال ہی ملے گی۔ گوشت بھی ہوتا ہے۔ نہ ہونے کے برابر۔" پھوٹی واڑھی

والا بولا۔

"کیا مطلب" میں نے پوچھا۔

"بولی توڑ سکو تو کھا لو۔" وہ ہنساکر کیپ کی طرف چلا گیا۔

"دام" میں نے کہا۔ "عجب آدمی ہے یہ۔ ہم میں سے نہیں پھر بھی ہم میں سے ہے۔ لیڈروں میں سے ہمیں پھر بھی لیڈروں سے گالڑ می چھنتی ہے۔ انٹریشن انٹر نہیں پھر بھی مطلوبات کا پلندہ ہے۔"

ابھی ہم ہوٹل کی طرف جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وہ پھر سے واپس آ گیا۔
"کیوں واپس آ گئے" میں نے پوچھا۔

وہ مسکرایا۔ "ہاں۔ وہ آدمی جو ریٹ ہاؤس کے دروازے میں کھڑا ہے نا۔ اسے دیکھ کر واپس آ گیا۔ وہ مجھ سے لیس ہو جائے گا۔ جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ وہ ہر کسی سے لیس ہو جاتا ہے۔ آپ سے ہو۔ تو اسیلا رکھیں۔"

"کیوں۔" میں نے پوچھا۔

"سی۔ آئی ڈی کا ہے۔"

"ارے۔ اسے یہ بھی پتہ ہے کہ کون کیا ہے۔"

ریٹ ہاؤس میں کھڑے آدمی سے ڈرنے کی بجائے مجھے چھوٹی داڑھی والے
نوجوان سے خوف آنے لگا۔ پتہ ہمیں یہ کس کا آدمی ہے۔

"آئیے کھانا کھانے چلیں۔" اشتاق حسین بولا۔

میرا دل ڈوب گیا۔ کہیں یہ ساتھ نہ چل پڑے۔

"ہمیں نہیں شکر یہ۔" وہ بولا میں ذرا اپلیٹ قدم پر جاؤں گا۔

"چلو چلیں۔" اشتاق حسین نے کہا۔

میرا دل پھر سے ڈوب گیا۔

پک بک

صاحبو میرا غلامانہ مشورہ ہے کہ کبھی کسی تیار کے ساتھ پک تک پر نہ جانا۔

پک تک کے متعلق ہر کسی کا اپنا نظریہ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کار میں پک تک سیٹ پر

جالتے ہیں۔ وہاں کسی اونچے ہوٹل میں قیام کرتے ہیں۔ اور پھر برآمدے میں بیٹھ کر

اداسی فراغت اور شوکتِ نفس سے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں۔

شاید اس لئے کہ میں چھوٹا آدمی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پٹنگ میں کار اور بڑا ہونٹ نہیں چلتے۔ پیدل کے بغیر پٹنگ نہیں ہوتی۔ اچلے کپڑوں کے بغیر پیدل نہیں ہوتا۔
 حسیلا اٹھا رکھا ہو۔ کپڑے استری سے بے نیاز ہوں۔ ایسے کہ جہاں جی چاہا زمین پر گھاس پر
 بیٹھ گئے۔ یہ غم نہ ہو کہ لباس میلا ہو جائے گا۔ لباس میلانہ ہو جانے کا احساس ہو تو پک تک
 نہیں ہو سکتی۔

پھر یہ بھی ہے کہ میرے ذہن میں پک تک کو کھانے سے بہت تعلق ہے۔ ہونٹ کی
 میز پر پٹنی کی رکابیوں میں نہیں۔ پٹنے پھرتے کھانے سے۔ خیزری میز والے سے خریدو۔
 چھابڑی والے سے خریدو۔ کھوکھے سے خریدو۔ اور بلا تکلف کھاتے جاؤ۔ پٹنے پھرتے کھاؤ۔
 کھڑے کھڑے کھاؤ۔ زمین پر بیٹھ کر کھاؤ۔

کسیں بھی کھاؤ مگر کھاؤ ضرور۔ کھڑے یاں کھاؤ۔ ان چھلا سیب کھاؤ۔ ریحڑیاں
 کھاؤ۔ مونگ پھلی کھاؤ۔ آکس کریم چائو۔ لفافے سے نکال کر کھاب کھاؤ۔ چائٹ کھاؤ۔
 چنے کھاؤ۔ بکڑے کھاؤ۔ بھول جاؤ کہ لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ بھول جاؤ کہ تھذیب
 سے کھانا کھا ہوتا ہے۔ یوں سمجھو کہ تم ایک لائق و دق صحرائیں ہو۔ اکیلے آوارہ۔ تم نے
 سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ کوئی تمہیں دیکھ نہیں رہا۔ تم سب کو دیکھ رہے ہو۔

بے شک ہند کاڑپ ایک مقصد کے لئے تھا۔ ہم ہومیو پتھی کی کتابیں خریدنے جا
 رہے تھے۔ بے شک ہم نے زائچہ کاروپ و حار رکھا تھا۔ بے شک قدم قدم پر لب دیکھ
 کر جب کا نیل آتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود ہند کا وہ سڑایک پک تک تھا۔

پٹنگ میں دو باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ ایک احساس فراغت دوسرے دیکھنے کو بہت
 کچھ۔ یہ دیکھو وہ دیکھو۔ ادھر دیکھو۔ ادھر دیکھو۔ دیکھتے جاؤ۔

اس ٹپ میں دونوں باتیں موجود تھیں۔ دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ ہند کی ہر چیز ہند
 دامن تمام لیتی تھی۔ دیکھو میری طرف دیکھو ساتھ احساس فراغت تھا۔ اس کے علاوہ ایک
 ساختی بھی تھا۔ پرانا ساختی لیکن اس کی بیماری نے سب ملیا سیٹ کر رکھا تھا۔ منہ بند چلتے
 جاؤ۔ خالی پیٹ دیکھو۔ خالی پیٹ دیکھنا صحت کے لئے مضر ہوتا ہے۔

ام بی بی ایس

وقت یہ تھی کہ میرا ساتھی پتہ نہ بھی ہوتا تو بھی مجھے منہ بند ہی رہنا پڑتا۔ اس لئے کہ اشرفی سینین پیدائشی طور پر ایک ام بی بی ایس ہے۔

یا اللہ کوئی ام بی بی ایس ساتھی نہ بنے۔

یہ نہ کھلا مگھا خراب ہو جائے گا۔

یہ نہ کھلا کھانسی لگ جائے گی۔

لوحوں یہ کھا جاتا پڑا ہے۔

لوگ کہتے ہیں وہ شخص جس نے جراثیم دریافت کئے بہت بڑا آدمی تھا۔ میں کہتا ہوں اس شخص نے نئی نوع انسان پر بڑا ظلم کیا۔ انہیں جراثیم کا احساس دلایا۔ جراثیم نے اتنی پتھریاں پیدا نہیں کیں جتنی جراثیم کے احساس نے پیدا کیں۔

بے شک دنیا میں بڑی بڑی مسلک پتھریاں ہیں لیکن پتہ ہے ان سب سے بڑی پتھری کون سی ہے۔ ان سب سے بڑی پتھری یہ ہے کہ آپ ہر وقت صحت کا احساس سینے سے لگائے رکھیں۔ انگریزی میں اس پتھری کو ہیلتھ کنسرن کہتے ہیں۔

تقسیم کے بعد جب میں ایئر فورس میں تھا اور ہم ہونے والے انسروں کی قضیت کا تجزیہ کیا کرتے تھے تو ڈاکٹر لطیف اور ڈاکٹر ثناء اللہ نے مجھے بلا کر کہا تھا کہ امیدواروں کا رد و شک فٹ لینے وقت اس ہلت کا خاص خیال رکھنا کہ کوئی ہیلتھ کنسرن کا مریض ایئر فورس میں داخل نہ ہو جائے۔ ایئر فورس میں باقی سب ذہنی انجینئرز ہوتے ہیں۔ ہیلتھ کنسرن نہیں چلتی۔ ڈاکٹر لطیف اور ثناء اللہ ام بی بی ایس ڈاکٹر نہ تھے بلکہ بی ایچ ڈی اور ڈی ایس سی ڈاکٹر تھے۔

میرا ساتھی اشفاق حسین صرف ایم بی بی ایس زاویہ نظر کا مالک نہ تھا۔ بد قسمتی سے وہ بیشتر پتھریوں سے واقف تھا۔ بیشتر سے زیادہ ایلیو جھک دو انیوں سے واقف تھا۔ تمام پرہیزوں اور احتیاطوں سے واقف تھا۔ اور جراثیم سے تو اس قدر واقف تھا جیسے بچپن سے ان کے ساتھ کھیل کھیل کر بڑا ہوا ہو۔ اس کے علاوہ اشفاق کے ہارے میں اس کے خیالات بہت وسیع و عریض تھے۔ لہذا انگوٹھے پھرتے ہوئے کھانے پینے کو اچھا نہیں جانتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہند کا یہ ٹپ میرے لئے پک نہ بن سکا۔ کھانا خارج از امکان ہو گیا۔ صرف دیکھنا ہی دیکھنا باقی رہ گیا۔

اسرتر میں مسلمان کا وہ ہو نکل ایک پہلی سی ٹھک سی دو کھان تھی۔ پتہ نہیں دال کیسی
 تھی۔ گوشت واقعی ”توز سکو تو کھالو“ قسم کا تھا لیکن اس وقت میں اس قدر بھوکا تھا کہ میں
 نے کھانے کی بجائے ٹھکانا شروع کر دیا۔



فرنیئر میل

جب مجھے پتہ چلا کہ ہم فرنیئر میل سے دلی جا رہے ہیں۔ تو میں اس قدر مشتعل ہوا کہ مجھے پسینہ آگیا۔

اوسے تو ہم فرنیئر میل سے سفر کر رہے ہیں۔

میری زندگی میں فرنیئر میل کی حیثیت بیٹھ ایسے دی جیسے دہلی کے لئے سیلا ہو۔ بالکل ایسے جیسے گوجرانوالے کے ارد گرد کے دور دراز گاؤں والوں کے لئے چوسا کھج کے کیلے کی ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے ۱۹۳۲ء میں ٹریننگ کرنے کے بعد میری پہلی تعیناتی خانے وال میں ہوئی تھی۔

وہ خانے وال یہ خانے وال نہ تھا۔ جو آج دکھائی دیتا ہے۔ ان دنوں ابھی نمر نہیں چلی تھی۔ سبزے کا نام نشان نہ تھا۔ ریت ہی ریت، ریت ہی ریت۔

زمین کی جگہ ریت کے ٹیلے تھے۔ جو روزِ فطرت بدلتے رہتے تھے۔ قصبہ خود ریت کا ٹیلا تھا جہاں ہر جگہ ریت ہی ریت تھی۔ ہوا میں ریت، سڑکوں پر ریت، گھروں میں ریت، لالچوں میں ریت، کھانے میں ریت، منہ میں ریت، آنکھوں میں ریت۔

زمین کی جگہ ریت کے ٹیلے تھے۔ جو روزِ فطرت بدلتے رہتے تھے۔ قصبہ خود ریت کا ٹیلا تھا جہاں ہر جگہ ریت ہی ریت تھی۔

طوفان رنگ و بو

وہ مدرسہ جہاں میں پڑھا تھا۔ ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب تھا ریلوے ٹائم ٹیبل بنانے والوں نے ہم پر یہ احسان کر رکھا تھا کہ فریئر میل کی آمد کا وقت تفریح میں پڑتا تھا۔

جوئی ریس کی گھنٹی بجتی دو ایک ٹیچر تفریح کے لئے سٹیشن کی طرف اٹھ بھاگتے۔

پلیٹ فلام خریدنے کی ضرورت نہ تھی چونکہ ریلوے کے باؤڈس کے بچے خالیوال کے اکلوتے مدرسے گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ سٹیشن پر پہنچ کر ہم اطمینان کا سانس لیتے کہ ابھی فریئر میل نہیں آئی ساتھ ہی فکر دامن گیر ہو جاتا کہ کہیں زیادہ لیٹ نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تفریح تفریح کے بغیر ہی گزر جائے۔

ان دنوں خانے وال کا سٹیشن بہت بڑا سٹیشن تھا۔ بھٹا بڑا تھا اتنا ہی دیر ان۔ خانے وال خلی سٹیشن ہی سٹیشن تھا۔ پیچھے قصبہ برائے نام تھا لیکن سٹیشن بھٹا بڑا تھا۔ اتنا ہی دیر ان تھا۔ اڑتی ریت میں باؤ بھوت بنے پھرتے۔ قلی منہ پر صاف ہاتھ بھرتے۔ مسافر تو کبھی کبھار نظر آتے تھے۔ پلیٹ فلام آہیں بھرتا رہتا۔ ہوا سیٹیاں ملتی۔ باہول وحند آلود۔

جب دور سے فریئر میل کی کوک سنائی دیتی تو ہم یوں اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ جسے آج کل کے نوجوان کو کوک کی بوتل مل گئی ہو۔ پھر ایک جیٹ سنیڈ ٹرین زوں سے سٹیشن میں داخل ہو جاتی جیسے شیا لے اندھیرے میں سے روشنی کی کرن نکلتی آئے۔ اس پر ہمارے دل دھک دھک کرنے لگتے اور ہم دوجان دار اٹھ کر ٹرین پہنچی کرنے لگتے۔

چمرے ہی چمرے۔ گورے چمرے۔ چمکے چمرے۔ کتابی چمرے۔ گول چمرے۔ ٹمکیں چمرے، جسم چمرے۔ آنکھیں ہی آنکھیں۔ شرابی آنکھیں۔ ڈولتی آنکھیں۔ بجلی بجلی آنکھیں۔ چار آنکھیں۔ مرغیلی شکم دیکھتی پھیپھڑی آنکھیں۔

دفعتاً اس ریلے سحرا میں ایک طوفان رنگ و بو اٹھ اٹھا پناں لینے لگا۔

ہم ان نظاروں کو بھوکے نظروں سے یوں سمیٹتے تھے جیسے بکری درختوں کے پتوں کو لٹک کر سینٹی ہے تاکہ فرصت میں جھلک کر سکے۔

خالیوال میں ہمارے دو ہی مشاغل تھے۔ فریئر میل کی بھل چٹیاں پھر جھلکی ہی

ہنگامی۔

جب ہم امرتسر شیشن میں داخل ہوئے تو پلینٹ فارم پر سواریاں بیٹھی تھیں۔ میں نے غور سے ان کا جائزہ لیا۔ لوسوں۔ یہ فرنیر میل کی سواریاں تھیں ہو سکتی ہیں۔ یہ تو کسی لوکل کی سواریاں نظر آرہی ہیں۔ کسی پرائیج لائن کی۔

پھر جب گاڑی پلینٹ فارم میں داخل ہوئی تو اس کی چال دیکھ کر ہی مجھ پر اوس چڑھ گئی۔ لوسوں۔ یہ فرنیر میل تھیں۔ وہ تو مورنی کی طرح چلا کرتی تھی اور یہ۔ یہ تو یوں چمک چمک چلی آرہی ہے جیسے بال گاڑی ہو۔ پھر اس کا رنگ بھی تو سفید تھیں۔ ارے یہ تو بالکل ہی ڈب کھڑی ہے اور پھر سواریاں اتنی صحت مند سواریاں نہ دھان پان نہ نخرانہ نہ زناکت۔ صحت تو بڑی ان افریکنو چیز ہے۔

بومیوں

اسنے میں ہمارے لیڈر صاحب آگئے۔ السلام علیکم انہوں نے گرم جوشی میں کہا۔ سب لوگ آگئے کیا۔ لوسوں۔ ابھی آپ سوار نہ ہوں۔ ہم نے دو بومیوں راج رو کرانی ہیں۔ وہ عام بومیوں تھیں۔ بلکہ سلیپر ہیں تاکہ آپ آرام سے سو سکیں۔ ذرا ٹھہریے ابھی بومیوں نکلیں گی۔

پہلی بوگی گئی تو تمام زائر اس کی طرف لپکے۔ اشفاق حسین نے میری آستین پکڑ لی۔ "لوسوں" وہ بولا۔ "اس میں بے صبروں کو جانے دو۔ ہم دوسری بوگی میں بیٹھیں گے۔"

میں رک گیا اور بوگی کو دیکھنے لگا۔ بوگی کا رنگ نہ کریم تھا نہ برادھن۔ چہ تھیں کیا رنگ تھا۔ میں لگتا تھا جیسے پیٹ کی جگہ ڈنگ لگایا ہوا ہو۔

یہ بوگی فرنیر میل کو نکار ہے جس کیا۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں فرنیر میل کا اہان ہے۔ فرنیر میل تو رنگ روپ کی گاڑی ہے۔ اس میں ڈنگ کیسے لگ سکتا ہے۔

زائرین سلطان اٹھائے بوگی پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ لیڈر اپنی شیریں آواز میں ہدایات جاری کر رہے تھے۔ "حضرات بہتر ہو تاکہ آپ اپنے اپنے گروپ بنالیں تاکہ سفر

میں آسانی ہو۔

ہم نے آپ کے آرام کے لئے عام بوگیاں ریررو ضیں کرائیں بلکہ سلیپر ریررو کرائے ہیں تاکہ آپ سفر میں آرام سے سو سکیں۔

”شاباش۔ آرام سے اطمینان سے سوار ہوں۔ بہت جگہ ہے۔ وقت بھی کافی ہے شاباش۔“

لیڈر کے قریب ہی انڈین سیکورٹی کا ایک گروپ کھڑا غور سے ڈائریں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس گروپ میں چند ایک آدمی دروی میں لمبوس تھے۔ ان کے چروں پر سنجیدگی اور انکمپٹ کی سلٹیں پڑی ہوئی تھیں۔
دوسری بوگی لگی تو ہم اس میں داخل ہو گئے۔ ہمیں کھڑکی کے نیچے کی دو سیٹیں مل گئیں۔ ہم نے ان پر سلمان رکھ لیا۔

بوگی کی کھڑکی پر ہمیں کس نوعیت کی تھی۔ بے حد مٹی اور ڈاک۔ غصہ نام کو نہ تھی۔ ہر رنگ بھدے تھتے۔ بالکل ہی ننگے۔ لوہ کوئی گدی نہ تھی۔
بوگی کی ایک سمت لمبی غلام گردش تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ چلنے پھرنے کے لئے ایک کارڈار تھا۔ ہر آدمی قسم کا کارڈار۔ دوسری طرف کوپے قسم کے کمرے۔ چھوٹے چھوٹے کمرے۔ کمرے اور ہر آدمی کے درمیان دیوار نہ تھی۔

کوپے میں آئے سامنے دو لمبی سیٹیں بنی ہوئی تھیں۔ ہر سیٹ غلام تھیں آدمیوں کے لئے تھی۔ سیٹوں کے اوپر ایک دو دو تھتے ٹولڈ کئے ہوئے تھے۔ جنہیں کھولنے پر کل چھ مسافر آرام سے سو سکتے تھے۔

”دوویہ دیکھو“ اشفاق حسین نے مجھ سے کہا۔ ”ہم نے کوپے کے اطراف میں دو دو تھتے ڈاکر سونے کی جگہوں کو ڈیوڑھا کر دیا ہے۔“
”ڈیوڑھا نہیں دگنا۔“ میں نے اپنی سیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ہماری سیٹ کوپے کے اندر نہیں تھی بلکہ باہر کارڈار میں کھڑکی کے نیچے تھی۔ کھڑکی کے نیچے بیٹھنے کی دو سیٹیں تھیں لیکن دونوں طرف سے تھتے گرا دو تو وہ سونے کی لمبی سیٹ بن جاتی تھی۔ پھر اس سیٹ کے لوہ ایک تھتے بھی تھا۔

سونے کی چھ جگہیں کوپے کے اندر اور دو جگہیں کارڈار میں۔ یعنی ایک ڈسبے میں

آٹھ سلیپر۔

جیل گاڑی

"دلو کیا دماغ لڑایا ہے۔" اشفاق حسین نے کہا۔ "ہمارے کوپے میں سونے کی صرف چار جگہیں ہوتی ہیں۔ لیکن یاد۔۔۔ دو رک گیا۔۔۔" یہ کوپے اتنے بھدے اور اداس کیوں ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے یہ جیل کی گاڑی ہو۔"

کوپے کے اندر بیٹھے ہوئے زائر ققبہ مل کر رہے اور یہ جو کھڑکیوں پر لوہے کی بیخیں لگی ہوئی ہیں ذرا انہیں بھی تو دیکھو۔

"مرے" میں نے حیرت سے اپنی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ واقعی کھڑکی پر لوہے کی بیخیں لگی ہوئی تھیں۔ فریم پر بیس کھڑکی پر۔ کھڑکی کے راستے اندر داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ نہ ہی سامان اندر آ سکتا تھا۔ "عجیب بات ہے" اشفاق حسین بولا "آخر بیخیں لگانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"کھڑکی سے چائے کا پیالہ پکڑنا بھی ممکن نہیں" کسی نے کہا۔

"شاید یہ واقعی جیل گاڑی ہو۔"

"فی الحال تو زائرین کی ہے۔" ایک نے ققبہ دگایا۔

"زائرین پر تو اچھا امپریٹن ڈالنا چاہئے تھا۔"

"شاید یہ بیخیں سیکورٹی کے لئے ہوں۔"

"بندوق کی گولی تو سرجل اندر آ سکتی ہے۔"

ہر کوئی کچھ نا کچھ کہہ رہا تھا۔

"ارے۔" کچھ دیر کے بعد اشفاق حسین چلا یا۔ "سارے کوپے میں صرف ایک

پچھا ہے۔"

"واقعی۔ صرف ایک ہے۔"

"کم از کم دو ہوتے ایک کارخ اور ایک کارخ اور صر۔"

"آپ کو گری لگتی ہے۔" ایک زائر نے کہا "تو چلے کارخ اپنی طرف کر

لیجئے۔"

اس پر چھوٹی دازمی والا نوجوان نہ جانے کدھر سے نکل آیا۔ "لوٹو لو" وہ بولا۔
 "یہ چٹھے گھومتے نہیں۔ میرا مطلب ہے ریو الونگ نہیں۔"
 "نہ گھومیں مگر سوزے تو جاسکتے ہوں گے۔ بس منہ سوزا لو۔"
 "مڑتے بھی نہیں" چھوٹی دازمی والا بولا۔ "ٹھسٹ ہیں۔ ہند میں پیڈ سٹلر بھی
 ریو الونگ نہیں ہوتے۔ بس کھڑے کھڑے چلتے رہتے ہیں۔"
 "آپ کہاں کے ہیں" ایک مستر ڈائر نے چھوٹی دازمی والے سے پوچھا۔
 "ہمارے ساتھ تو نہیں آئے" دوسرا بولا۔
 "ساتھ نہیں آیا لیکن ساتھ جارہا ہوں۔" چھوٹی دازمی والے نے کہا۔
 "ہم میں سے نہیں ہیں۔" پہلا بولا "لیکن ہم میں سے ہیں یہی نا۔"
 "بالکل بالکل" چھوٹی دازمی والا ہنسا اور پھرتی سے آگے نکل گیا۔

گفتی

چھوٹی دازمی والے کے جانے کے بعد اس کی بات چلی نکلی۔ ہر کوئی اپنی رائے
 دینے لگا۔

"یہ کمال کا آدمی ہے ہمارے ساتھ نہیں آیا لیکن ہمارے ساتھ جارہا ہے۔"
 "ایسے تو بہت سے ہیں جو ہمارے ساتھ نہیں آئے لیکن ہمارے ساتھ جارہے ہیں
 مثلاً پولیس کے ہیں۔ سیکوریٹی کے ہیں۔"
 "کیا یہ بھی سیکوریٹی کا ہے۔"
 "کیا پتہ۔"

"یہاں سیکورٹیاں بھی تو ہوتی ہیں۔ ممکن ہے پاکستانی سیکوریٹی بھی ہو۔"
 "پھر تو ہم بڑے اہم لوگ ہیں۔" اختلافی صیغہ ہنسا۔ "جن کی خبر رکھنے کے لے
 اتنے سارے لوگ جھینم ہیں۔"

"خاصوش۔" ایک ڈائر بولا۔ "گنتی ہو رہی ہے۔"
 "گنتی کیسی گنتی۔"
 "ہماری گنتی۔"

”وہی جو یہاں امرتسر کے سٹیشن پر باہر پور ٹیکو میں بڑے اہتمام سے لگی ہوئی ہے۔“

”نہیں۔ میں نے توجہ نہیں کی۔“
 ”وہ ایسی تصویر نہیں جو توجہ کرو تو نظر آئے۔ وہ تو آتے جاتے کے منہ پر تھینہ لڑتی ہے۔“

”کہاں لگی ہوئی ہے وہ۔“

”بنگلہ دفتر کے مقابل۔“

”کیسی تصویر ہے؟“

”ایک آدمی کی تصویر ہے۔ ٹائیس بھی تنگی، دھڑ بھی بچا، صرف ایک لنگوٹی پہن رکھی ہے۔“

”مساٹا گاندھی کی ہوگی۔“

”اوسوں — یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ اگر تصویر لگائی ہی تھی تو مساٹا گاندھی کی لگاتے۔“

”تصویر ہے کس کی؟“ میں نے پوچھا۔

”جس کا مسک مساٹا گاندھی سے بالکل متضاد تھا۔ تصویر سے تنگہ کی بھڑاس نکل رہی تھی۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔ تنگ دھڑ تنگ منہ۔ ہاتھ میں کھلاڑا۔ وہ تصویر بندہ بھڑائی کی تصویر ہے۔ بندہ کو چانتے ہو۔“

”وقتاً مجھے یاد آیا —“ ہاں بندہ —“

”میرے روبرو بنالے کامفتیاں محلہ از سر نو اکھڑا ہوا۔“

ہمارے محلے میں دو محلہ تیں بہت پرانی تھیں جو صفیوں کے جدا ہند نے بنائی تھیں۔ ایک کو رنگ محل کہتے تھے دوسری کو شیش محل۔ رنگ محل میں بھر بھی کچھ کچھ رنگ باقی تھا۔ شیش محل میں کوئی شیش نہ تھا۔

شیش محل کے نیچے بہت بڑا احاطہ خانہ بنا ہوا تھا۔ اتنا بڑا جس میں پچاس ساٹھ آدمی

آسانی سے رہائش کر سکتے تھے۔ ایک دروازہ محلے میں کھلتا تھا۔ جو چور دروازہ تھا۔ باہر سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ دروازہ ہے۔ دوسرا دروازہ بازار میں کھلتا تھا۔ وہ کنواں دروازہ تھا۔ یعنی دروازے کے عین بیچ میں ایک کنواں بنا ہوا تھا جو آدھا باہر تھا آدھا اندر تھا خالے میں تھا۔ باہر سے یوں معلوم ہوتا جیسے کنویں کے پیچھے دیوار ہو۔

اس وسیع و عریض تر خالے میں ایک مسجد بنی ہوئی تھی۔ پانی کا ذخیرہ کرنے کے لئے ایک تالاب۔ جب ہم بچے تھے تو اکثر تر خالے میں جا کر اسے غور سے دیکھتے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شیش محل کے نیچے ایسا بڑا تر خالہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر ہمیں محلے کی بڑی بزرگیاں بتا کر کہیں کہ جب بندہ بیرونی شہر پر حملہ کیا کرتا تھا تو سارے مفتی محلے کے بڑے بچے جوان عورتیں اس تر خالے میں چھپ چاہا کرتے تھے۔

”بندہ کون تھا“ ہم پوچھتے۔

”تھا تو ڈاکو پر مسلمانوں کا بہت بھری تھا۔“

”اسے سرکار کچھ نہیں کہتی تھی۔“

”سرکار تو خود اس سے ڈرتی تھی۔ سپاہی بھاگ چلتے اور وہ کئی کئی دن شہر پر برا حملہ رہتا اور ہم دس دس پندرہ پندرہ دن تر خالے میں چھپے رہتے تھے۔ اتنی وحشت تھی بندے کی۔“

”وہ تو مسلمانوں کا بھری تھا۔“ میں نے اشتقاق سے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”ڈاکو تھا اور مسلمانوں کا بھری تھا۔“

”کیا تمہیں یقین ہے وہ تصویر بندے کی تھی۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”وہ تو یوں شیش پر منگلی ہوئی ہے جیسے کسی پیشکش بیرونی

ہو۔“

”اچھا مجھے بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔“

”بندہ تو خود کو سیکور کہتا ہے۔“ اشتقاق ضمیمین نے کہا۔

”ہاں کہتا تو ہے۔“

”پتہ نہیں۔“

”یہاں اسنے سارے غلام بڑا کر دیکھتے ہوں گے۔ وہ کیا کہتے ہوں گے۔“

”بٹاؤ یار۔“ میں نے کہا۔ ”جو مرضی ہے کئے۔ جو مرضی ہے کرے۔ ہند
 بہت بڑا ملک ہے۔ بہت بڑی قوم ہے۔ دنیا کی تیسری طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔
 جو طاقتور ہوتے ہیں ان پر اخلاق عائد نہیں ہوتا۔ نیکی، شرافت، اخلاق، ضمیر، غریب ملکوں
 کے زیور ہیں۔“

گازی چمکا چمک چلے جا رہی تھی۔
 باہر گھٹا ٹوپ اندھا میرا تھا۔
 ہوا جھل رہی تھی۔

میں نے اپنے پاؤں نوپے کی پٹنوں کے ساتھ لٹا رکھے تھے۔ پاؤں کو مضطرب ہوا لگ
 رہی تھی جس کی وجہ سے میں کوپے کے چنگے سے بے نیاز تھا۔

بیوا کلا لالہ جی

اس وقت مجھے صرف ایک دکھ لگا ہوا تھا۔ کاش کہ یہ گازی صبح کے وقت امرتسر سے
 روانہ ہوتی۔ امرتسر سے اہالے تک تمام علاقوں سے شہروں کی یادیں میرے دل میں
 چٹکیں بھر رہی تھیں۔ ہر علاقے کا رنگ اور خوشبو میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ ہر چھوٹے
 سے چھوٹے شیشوں میں یادوں کے آسمان پر تکرے کی طرح ٹٹنار رہا تھا۔
 غلامیہ یہ کیا کیا کہ مجھے رات کی گازی میں سوار کر دیا۔ اگر بتیس سال بعد میں اہمالے
 پہلے علاقوں کو ایک نظر دیکھ لیتا تو تمہارا کیا مجھڑ جاتا۔

یہاں ماہی کا علاقہ تھا۔ دوا بے کا علاقہ تھا۔ پرے ماہو تھا۔
 ماہیما پنجاب کا دل تھا۔

پنجاب کے جانے پہچانے لوگ گیت ”لئے“ کا وہ بول میرے کانوں میں گونجنے

لگا۔

لئے۔ فی ماہی دی بند بوتلے، کیا خوبصورت تشبیہ تھی۔

یہ وہ علاقہ تھا جہاں شہامت و لبرٹی اور بہادری سب سے عظیم وصف تھے۔

جہاں صحت مندی حسن سمجھی جاتی تھی۔ جہاں مسکین عورت وہ تھی جس کے کمال
 میں خون کی سرفی جھلکتی تھی۔ جو ہنس پڑ لیتی تو چہرہ لانی مشکل ہو جاتی۔ جو شربتی تھی۔ بساقتی

تھی، آنکھیں جھکا لیتی تھی لیکن ہر بات پر نہیں۔ ہر کسی کے سامنے نہیں۔ صرف وہاں جہاں رضامندی اسے مجبور کر دیتی۔

مجھے موگا کا ہسپتال یاد آگیا۔ لائیں یاد آگئی۔

موگا کا ہسپتال آنکھوں کے علاج کے لئے سدرے پنڈپ میں مشہور تھا۔ وہاں کے ڈاکٹر لالہ ہرجن داس بہت بڑے سیوک تھے۔ ان کی زندگی کا مقصد عوام کی خدمت کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی اس کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اتفاق سے میرا ماسوں زاد بھائی ڈاکٹر لالہ علی موگا میں تعینات ہو گیا۔

ان دنوں میں لالہ علی سے ملنے موگا گیا ہوا تھا۔ لالہ کا کوارٹر ہسپتال کے احاطے میں ہی تھا۔ وہ صبح ڈیوٹی پر گیا تو میرا خیال تھا کہ جلد فارغ ہو کر گھر آ جائے گا۔ دوپہر کو اس نے ایک کپاؤنڈر کے ہاتھ کھلوا بھیجا کہ میں کھانے پر نہ آ سکوں گا۔

شام کو وہ پانچ بجے کے قریب گھر آیا تو میں پچھلے جھاڑو اس کے پیچھے پڑ گیا۔
 ”واہ“ میں نے کہا ”یہ عجیب نوکری ہے کہ صبح کے گئے اب آئے ہو۔“

وہ جسنے لگا۔ ”یہ لاڈلہ لالہ ہرجن داس نہ خود آرام کرتا ہے، نہ مجھے کرنے دیتا ہے۔ وہ نوکری نہیں کر رہا، خدمت خلق کر رہا ہے۔ کوئی بھی کیس آئے کسی وقت بھی آئے۔ دن ہو یا رات، شرط یہ ہے کہ فوری فوری کا ہو، لالہ جی ہسپتال میں حاضر ہو جاتے ہیں۔“

ابھی ہم آدھ گھنٹہ اگلے بیٹھے ہی تھے کہ باہر شور مچ گیا وہ باڈر میں بیسوش پڑی ہے۔

”اس کی حالت ابھی نہیں۔“

”کازی بھجھو گاڑی بھجھو۔“

لائیں:

لائیں ماٹھے کی ایک نو جوان بیٹی تھی جو موگا سے پچاس ساٹھ میل دور کھیرا بھڈوں میں رہتی تھی، جہاں نہ سڑک تھی نہ پگ ڈھڈی۔ صرف جھاڑیاں اور ریت۔

جوانی ٹوٹ کر آئی تھی۔ ایسی جوانی جو صرف غریبوں، محنت کشوں اور آدمی و آسافش سے محروم کمزور زندگی گزارنے والے لوگوں پر آتی ہے۔ وہ حسین تھی لیکن اس کا

حسن منڈب علاقوں جیسا حسن نہ تھا۔ وہ صحت کا حسن تھا، جوانی کا حسن تھا۔ وہ اسم باسٹی تھی۔ جیتی جاگتی لاث تھی۔ شاید اسی لئے اس کا نام لاثیں تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے پنجاب کے اس لوگ گیت کے بول کا منسوم سمجھ میں آیا تھا۔

”سلنے دی لاث درگی“

جب وہ جوان ہوئی تو مجھے کے کئی مردوں نے پیغام کیے۔ یہاں تک کہ ماں باپ فرج ہو کر رہ گئے۔

لاثیں نے سب رو کر دیئے۔
علاقے کے جوان خلد کھا کر بیٹھے رہے۔

پھر جب لاثیں نے دور کے علاقے کے بھرا کو پسند کر لیا تو کھوس والے فیصے سے بھوت بن گئے اور ایک دن صبح نو بجے کے قریب جب وہ پانی بھرنے چاری تھی تو ایک چاہنے والے نے یہ کہہ کر کہ لاثیں تو میری نہیں ہوگی تو میرا کی بھی نہیں ہوگی، اس کے بیٹ میں چمرا بھونک دیا۔

لاثیں نے اپنے کئے ہوئے بیٹ کو ہاتھ میں پکڑا اور موگا کی طرف اٹھ بھاگی۔ اگر موگے پہنچ گئی تو میرا کو دیکھ لوں گی نہیں تو۔۔۔
وہ صبح نو بجے سے بھاگتی رہی بھاگتی رہی۔
وہ شام پانچ بجے وہ موگا کے قصبے میں داخل ہو گئی۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے پر ایسا ہوتا ہے کہ حزل پر پہنچ کر بہت جوں و سے جاتی ہے۔ موگا کے بازار کی پہلی دکان کے سامنے پہنچ کر اس نے ”بھرا“ کا نعرہ لگایا اور پھر بازار کے درمیان میں ڈھیر ہو گئی۔

جب لاثیں کو ہسپتال میں لائے تو وہ بھرپور ہوش میں آجی تھی۔ میں نے اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اگرچہ اس کے جسم سے سدا خون نکل چکا تھا۔ چہرہ ہلکی کی طرح تھا، پھر بھی اس کی آنکھیں لاثیں مار رہی تھی۔ چہرہ یوں دھندلے سے بھرا ہوا تھا جیسے کسی شزاوی کا

میز پر پڑے ہوئے وہ ڈاکٹر لالہ ہرجن داس سے کہہ رہی تھی۔ دیکھ ڈاکٹر لالہ مجھے شیش نہ سنگھانا۔ بیہوش نہ کرنا۔ جو میں بے ہوش ہو گئی تو پھر میرے کو کیسے دیکھ سکو گی۔ تو اسی طرح تروپے لگا دے۔ اور نہ ڈاکٹر لالہ حوصلہ کر۔ جلدی تروپے لگا۔ جلدی۔ میرے پاس مصلحت نہیں۔ پر میں نے میرے سے ملنا ہے۔ وہ آئے گا ضرور آئے گا۔ ایک بار میں اس کے موٹے پر سر رکھ دوں پھر جو ہوتا ہے ہو جائے۔ لگا تروپے جلدی کر۔ اور لالہ جی اس کے رو بردیوں سر جھکائے کھڑے تھے جیسے بچہ سر جھکائے کھڑا ہوتا ہے۔ پھر آپریشن روم میں دونوں ڈاکٹر کپاٹکھڑ۔ نرس اور میں کھڑے تھے۔ لالہ جی نے مجھے وہاں رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ انہوں نے لالہ کی استریاں سب باہر نکالی ہوئی تھیں اور وہ ادویات سے انہیں دھر رہے تھے۔ اور لالہ کی کلی آنکھوں سے شرعہ دیکھ رہی تھی۔ خون اور جسم کے اعضاء دیکھ کر میرا سراپکا رانے کا طبیعت ماتش کرنے لگی اور میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ جب ڈاکٹر لالہ گھر آیا تو میں نے پوچھا۔ ”بولو لالہ کی بولو۔“

البتہ بولا ”آپریشن ہو گیا۔“

”ٹھیک ٹھاک۔“

”ہاں“ وہ بولا۔ ”لیکن“

”لیکن کیا؟“

”مشکل ہے کہ وہ بچے۔“

”کیوں“ میں ٹھسے میں غرایا۔

”خون بہت نکل چکا ہے۔ صبح نو بجے سے شام تک۔“

”اوسوں مشکل ہے۔“

اس رات سونا ممکن نہ تھا۔ میرے لئے تو لینا بھی مشکل تھا۔ ایک اضطراب تھا۔

ایک بے چینی۔ یوں جیسے لالہ میری ہو۔

پھر صبح سویرے ایک ہتکڑا کوئی جیسے دھمی شیر و حمارتا ہے۔ لالہ۔

یہ ہتکڑا صرف ہسپتال میں ہی نہیں ملدے سو گا میں سٹائی دی۔ میزوں پر پڑے

ہوئے لگاں جل رنگ کی طرح بچے۔ سب لوگ جاگ اٹھے۔

لائیں چابکلی تھی۔ اور بھراڑ ملی شیر کی طرح اس کے سرہانے دباڑ رہا تھا۔

بجٹو

ہائیں۔ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے میں چو نکلا۔ یہ کیا باہر گھپ اندھیرے میں لائیں روشن تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ روشن لائیں جس چیز سے سامنے آئی تھیں۔ اسی چیز سے غائب ہو گئیں۔

یہ کیا شے تھی جو گھور اندھیرے میں لائیں کی طرح روشن تھی۔ کیا یہ شیش کی روشنی تھی۔ اونہوں۔ چھوٹے شیش تو تمام گل پڑے تھے۔ کیا یہ بجٹو تھے۔

دلہنا پھر لائیں چمکیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ لائیں بہت چیز تھیں اور سامنے دور شیش کے مقام پر ہٹ کر تھیں۔

تیسری بار جب وہ سامنے آئیں تو گرد و پیش کچھ کچھ نظر آئے۔ وہ گاؤں یاڑیوں کے کچے گرد و نڈے تھے جن کی چھتوں پر بجلی کی یڑیں لگی ہوئی تھیں۔

خوب بست خوب۔ میں لے سوچا۔ بند نے گاؤں گاؤں بجلی پھینا رکھی ہے۔ اور سکموں نے سیکورٹی کے لئے چھتوں پر بڑی بڑی یڑیں لگا رکھی ہیں۔

اب ہم دواپے کے علاقے سے گزر رہے تھے۔ جب میں در سے میں پڑھا کرتا تھا تو جنرالیہ کی کتاب میں دواپوں کا ذکر آتا تھا۔ دواپہ وہ علاقہ ہوتا ہے جو دو دریاؤں سے گھرا ہوا ہو۔ یہ دواپہ۔ دواپہ بہت چاندھر کے نام سے مشہور تھا جو جیاس اور ستلج کے درمیان کے علاقے میں واقع تھا۔

دواپہ

مجھے دواپے والوں سے بڑا لگا تھا۔ ان میں ایک مٹھاس تھی ایک رواداری تھی۔ ان کے لباس بڑے سادہ ہوتے۔ انداز میں ظاہر نہ ہوتا۔ ان کی میں اغواٹ کے چھلکے کی طرح سخت نہ تھی بلکہ آلو کے چھلکے جیسی نرم نرم تھی۔ ان میں نہیں نہ تھی۔ نمائش نہ تھی دکھانا نہ تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں چاندھر دیکھوں اور کچھ زمین تو ریل کا شیشن ہی سی۔ مجھے چاندھر کا گڑ بہت پسند تھا۔ اور پھر وہاں کے لوگ۔ ان کی بولی میں روپیے میں اسی گڑ

کی چاشنی تھی۔

جہانہ مردو ابے کا دل تھا۔ وہی ساوگی، وہی بے تکلفی، وہی خلوص، وہی قربت، پتہ نہیں یہ ملائے کے پانی کا اثر تھا یا ہوا کا۔

پھر پھلور تھا۔ پھلور کے شیشین کو میں بڑے اہتمام سے دیکھا کرتا تھا صرف اس لئے کہ اس پر جھٹ پڑی ہوئی تھی۔ جب گاڑی شیشین میں داخل ہوتی تو یوں لگتا جیسے کسی لمبے چوڑے بند ہال میں داخل ہو گئے ہوں۔

جب گاڑی پھلور سے چلتی تو میں کھڑکی سے لنگ لنگ کر دیکھا کرتا کہ کب پھلور کا قلعہ آئے۔ قلعے میں ان دونوں تھانے داروں کی تربیت ہوا کرتی تھی۔ تھانے دار میرے لئے ان دونوں بھی بہت بڑا عمدہ ہوتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر سے بھی بڑا۔ ایک اونچا لمبا مرد۔ ہارمب چرا۔ گھوڑی پیشانی ٹک سے بھری ہوئی آنکھیں اور مردوزی ہوئی مونچھیں۔ مجھے تھانے دار سے ڈر آتا تھا۔ ساتھ ہی وہ میرے لئے بڑا جلاب توجہ عمدہ دار تھا۔ تھانے دار سے ڈر تو مجھے اب بھی آتا ہے لیکن اب وہ جلاب توجہ نہیں رہا۔ اب مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ ڈر اور ترس۔

میراجی چاہتا تھا میں جہانہ مردو دیکھوں۔ وہاں کا گڑ کھٹوں۔ وہاں کی شدہ بولی سنوں۔ جہانہ مردو سے بات کروں۔ ان کے پاس بیٹھوں۔

لاہور کے نور بابا کا کرتے تھے پڑ مٹی تو ایک ہی ہوتی ہے۔ پھر بھی مٹی مٹی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جہانہ مردو مٹی میں اتنی مٹھاس تھی جیسے شکر میں ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگ مٹھاس سے چپ چاپ کرتے تھے۔ وہاں کی سبزیوں میں تلخی نہیں ہوتی تھی۔ ظالم اتنے بیٹھے تھے کہ گود افوج انہیں دبی سیب سمجھ کر کھایا کرتے تھے۔ لاہور میں ہنڈیا میں چنگی بھر مرچ ڈالو تو کھاتے ہوئے سی سی کرو۔ جہانہ مردو میں ہنڈیا میں دو چنگی مرچ ڈالو تو بھی سامان بیٹھاسی رہتا تھا۔

میراجی چاہتا تھا میں پھلور کا شیشین دیکھوں کیا۔ اب بھی اس پر وہی جھٹ قائم ہے۔ کیا اب بھی ایسا لگتا ہے جیسے گاڑی شیشین کی جگہ ہال کمرے میں داخل ہو گئی ہو۔ کیا پھلور کا قلعہ اب بھی موجود ہے۔ کیا اس میں اب بھی تھانے دار رہتے ہیں جن کی مونچھیں اسی طرح مردوزی ہوئی ہیں۔

ایک دن میں نے نور بابا سے پوچھا ”باباجی تقسیم سے پہلے آپ دواپے میں رہتے تھے کیا۔“

”ہاں چتر۔“ وہ بولے۔

”تقسیم کے بعد لاہور آئے تھے کیا۔“

”ہاں چتر۔“ وہ بولے۔

”کیا گاڑی میں آئے تھے۔“

”پیدل۔ اکیلے۔“

”میں پتر بہت بڑا تھا تھا۔ ساتھ ہمارے مرید تھے۔“

”کتنی دیر میں پہنچے۔“

”میدن سے زیادہ ہی لگ گیا تھا۔“

”سڑک پر رکاوٹیں ہوں گی نا۔“

”میں پتر کھیتوں جھاڑیوں اور رکھوں سے آئے تھے۔“

”وہ کیسے باباجی۔“

”پتر ساری رات چلتے تھے۔ سارا دن چھپے رہتے تھے۔ روزم پر حملے ہوتے تھے۔

رات کے اندھیرے میں ہم شہیدوں کو دفنانے لگاڑ شدادہ کرتے پھر پل پڑتے۔“

”ایک میڈن حملے ہوتے رہے باباجی۔“

”ہاں چتر۔“

”کتنے شہید ہوئے باباجی۔“

”جب چلے تو بڑوں کے قریب تھے۔ جب پہنچے تو سو سے کم تھے۔“

یہ تھے دواپے کے لوگ خود مر گئے۔ اپنے مرشد کو پاکستان پہنچا گئے۔

دودھیا جوڑا

لودھیانے اور انبالے میں میں نے آنکھ کے کئی ایک سلی گزراے تھے۔

انبالے میں میں جوانی کی اولیں بیداری سے شامسا ہوا تھا۔ کیا اب بھی وہاں چھپے کا

میلہ ہوتا ہے۔ چھپے کا وہ میلہ جس نے پہلی مرتبہ میرے بے نام، بے منزل جذبات کو ہوا

دی تھی۔ مجھ میں ایک ان جانی بے چینی پیدا کی تھی۔ پھر اس آوارہ بے چینی کو ایک رخ مل گیا تھا۔ ایک بڑا ایک منزل۔

یہ بدعا دو گورے چنے پاؤں تھے جو میں تھکے پڑے رہتے تھے جیسے جوتوں کی دوکان میں شوکیں میں پڑا ہوا ہو۔ پاؤں کا یہ جوڑا ہارے چوہدے کے مقابل کے گھری جھٹ پر دھوپ میں پڑا رہتا تھا۔ میں کالج سے واپسی پر سیدھا کھٹے پر پہنچتا کہ اس دو دھوپا جوڑے کو دیکھوں۔

کئی ایک چلتے میں اس دو دھوپا جوڑے کو دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا۔ اس جوڑے کی مالک مجھے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ میں اس دو دھوپا جوڑے میں جو بڑی غلاست سے تھک گیا دھرا رہتا تھا اس قدر کھو گیا کہ مجھے مالک کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ ان دنوں انہلہ چھلانی میں میں ہیں میسوریل کالج میں پڑھتا تھا۔ کیا اب بھی بی ڈی پی ایم کالج اسی اصطبل میں واقع ہے، جس میں وہ ان دنوں چل رہا تھا۔ کیا اب بھی شمر کے لڑکے صبح سویرے کالج میں پڑھنے کے لئے چھلانی جاتے ہیں۔ کیا اسی طرح سائیکلوں کا ایک جلوس نکلتا ہے جیسا ان دنوں نکلا کرتا تھا۔

اسی اہالے میں میں نے پہلی مرتبہ اپنی ٹین ایج محبوبہ کو بے بی شو میں دیکھا تھا۔ گورا چٹا مسکراتا چہرہ۔ حاکم آنکھیں اور گھنگھڑ والے بال۔ صوفی کی بسن تانی۔ یوں میری ٹین ایج کو۔ پاؤں کے جوڑے سے چل کر چہرے تک آجینگی تھی۔ اور میں نے اسے اپنے سینے پر لٹکا لیا تھا۔ اور پھر امرتسر میں جا کر اس کی تلاش میں سرگرداں پھرنا برہا تھا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ اہالے شمر کے شیشن کو جی بھر کر دیکھوں۔ گاڑی فراسے بھرتی جا رہی تھی۔ باہر نہ چاند مر تھا نہ پھلور تھا نہ انہلہ تھا۔ صرف گھپ اندھیرا۔ گاڑی حاند میرا۔

شیشن آتے تو تھے لیکن آتے ہی چل پڑتے۔ گاڑی رکھتے ہی پھر چل پڑتی اور ہلدی ہوگی کا جھڑپہ کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ لازماً شیشن کے دیر ان جیسے پر رکھتی۔ ایسی جگہ جہاں شیشن کے نام کا کوئی بورڈ نہ لگا ہوتا۔ مشکل یہ تھی کہ میں کڑی سے سر نکال کر باہر نکل کر شیشن کو اچھی طرح دیکھ بھی تو نہ سکتا تھا۔ کڑی پر لوہے کی سیخیں جو لگی تھیں۔

کئی بار میرا جی چاہا کہ بھاگ کر دروازہ کھولوں اور پلیٹ فارم پر اتر جاؤں۔ مصیبت یہ تھی کہ ہوگی کا دروازہ بہت دور تھا اور دروازے پر ہندی سپاہی دروی پہنے ہندوؤں ہاتھ میں لئے بیضا تھا۔

امرد کوپے میں چار دائرہ سر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے شاید باتوں میں محو تھے یا تاش کی بازی ہو رہی تھی۔

نیند میں چھپھڑا

دوسرے کوپے میں لیڈر صاحبان پڑے تھے۔ سردار لیڈر جن کے چہرے پر وجاہت کی مرگلی ہوئی تھی پیشانی پر دھاری جھریاں تھیں۔ دائرہ مصیبت کو نورانی جمال بخش رہی تھی، سلجبرہ چاقو بنے ہوئے پڑے تھے۔ گویا ان کی مصیبت سے ساری مانع اثر ہو چکی تھی۔ استری ٹوٹ چکی تھی ان کی "میں" کی ریلوئی سے کڑا کا ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی پلاسٹک کے گڈے کا امرد کا ٹاٹا ٹاٹا گیا ہو اور اعضا بکھرے پڑے ہوں۔

پتہ نہیں کس بزرگ نے کہا تھا لڑائی بھی کیا چیز ہے جو بڑے چھوٹے اونچے نیچے سب کو عام دربار میں لا کھڑا کرتی ہے۔

نیند بھی کیا چیز ہے جو شخصیت کے امتیازات کی پھونک نکل کر اسے چھپھڑا بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اس وقت سردار لیڈر کے چہرے کی وجاہت ختم ہو چکی تھی۔ پیشانی پر دھاری جھریاں صاف ہو چکی تھیں۔ اور وہ یوں پڑے تھے جیسے پٹینو پٹینو سے چپس غائب ہو گیا ہو اور صرف پٹینو ہی پٹینو باقی رہ گیا ہو۔

اس وقت ان سے لیڈری کی مانع اثری ہوئی تھی۔ عالم دین کی کلفی گری ہوئی تھی۔ مرلا مستقیم دکھانے کے ذمہ کار و غن اتر ا ہوا تھا۔ سب نیچے کھڑیاں اتر گئے تھے۔ باقی انسان رہ گیا تھا۔ بے بس۔ بے کس انسان۔

پہلی مرتبہ میں نے اپنے دل میں ان کے لئے ہمدردی کی ایک دھمک دیا۔ اس سے پہلے جب بھی میں انہیں دیکھتا تھا مرحوب ہو جاتا تھا۔ اس کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ دیکھنے والا مرحوب ہو جاتا۔ میں نے بھی محسوس نہ کیا تاکہ مرحوبیت کی اس شوگر کو تنگ کے

مجھے ایک عاجز، مسکین، قابل ترس انسان پڑا ہے۔

اس سے اگلے کوپے میں بندی پولیس تھی۔ ایک سپاہی ہاتھ میں بندوق تھا سے سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ کوپے کے اندر دو ایک افسر سادہ کپڑوں میں سیٹوں پر چاقو بٹے ہوئے پڑے تھے۔ نیند میں افسری کی چمک دکھ مانہ پڑی تھی نہیں غروب ہو چکی تھی۔ مجھے سے عاجز بے بس انسان نکل آیا تھا۔

بندی پولیس کا بھی وہی حال تھا۔ اٹل کمر سو رہے تھے۔ سپاہی اونگھ رہا تھا۔

بے نام شنیشن

دفعتاً گاڑی رک گئی۔ میرا دل اچھل کر گلے میں آ اٹکا۔ شنیشن آیا ہے میں نے سوچا۔ پتہ نہیں کون سا شنیشن ہے۔ چلو اندھیرے میں علاقہ نہیں دیکھ سکتا تو شنیشن ہی دیکھ لوں۔ پلیٹ فارم ہی سی۔ شاید پھلور ہے۔ بٹے یہ کبکھٹ سیخیں جو کھڑکی پر لگی ہوئی ہیں، نہ ہوتیں تو کھڑکی سے سر باہر نکل کر دیکھتا۔ شنیشن کے پورٹریٹ لائٹنیوں پر کہیں نا کہیں شنیشن کا نام تو لکھا ہو گا۔

لائٹنیں تو ختم ہو گئیں۔ وہ تو بے نام کی بات بجلی کا دور نہیں آیا تھا۔ جب ہر شنیشن پر ایک لمپ روم ہوا کرتا تھا۔ سر شام ہی ایک قلی لمپوں کو صاف کرتا۔ شنیشن کی لائٹنیوں کے دیئے باہر نکالتا، ان میں جل بھرتا، چیل کھڑتا۔ باہر کے شنیشن کو کپڑے سے صاف کرتا۔ اس زمانے میں باہر کے شنیشن پر شنیشن کا نام لکھا ہوتا تھا۔ جب اندر روشنی ہوتی تو شنیشن کا نام بڑی وضاحت سے نظر آتا تھا۔ شنیشن کا نام جتنا ہوتا تو کسی حق کو دیکھ لیتے۔ اب وہ بات نہ تھی۔ بتیل تو تھیں لیکن لائٹنیں نہ تھیں۔ باہر کے شنیشن نہ تھے۔ نام نہ تھے۔ نام کے منحنے تو صرف دو ہوتے ہیں ایک شنیشن کے شروع ہونے پر زمین میں گڑا ہوتا ہے دوسرا ختم ہونے پر۔ نام کیسے دیکھوں۔ میں مایوس ہو گیا۔

پھر دفعتاً مجھے خیال آیا کہ شنیشن کے مین گیٹ پر بھی تو نام لکھا ہوتا ہے۔

مین گیٹ پیچھے رہ گیا تھا چونکہ ہلدی بو گیاں فرخیر میل کے آگے لگی ہوئی تھیں قلی بھی شنیشن کا نام نہیں پکار رہے تھے۔ پرانے زمانے میں قلیوں کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ رات کے وقت جب گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوتی تو وہ بلند آواز میں شنیشن کا نام

پکارتے تاکہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو پتہ چل جائے کہ کونسا شیشن آیا ہے۔ اور منزل کتنی دور ہے۔

گاڑی چل پڑی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چلو شیشن پر پتہ نہیں چلا تو نہ سسی شیشن سے باہر نکلتے ہوئے تو نام کا بورڈ آئے گا اور پتہ پتلے گا کہ کون سا شیشن تھا۔ چاندھر تھا کہ پھلور تھا کہ لودھیانہ تھا۔

بورڈ بورڈ بورڈ — میں بورڈ کی تاک میں بیٹھا تھا۔ ارے یہ کیا بورڈ پر پتہ نہیں کیا چھو کی لمپیاں بٹائی ہوئی تھیں۔ ٹیم نہیں تھا نہ انگریزی میں نہ اردو میں — لوفہ۔ یہ ہندی ہوگی۔ — مہراج یہ کیا غضب کیا کہ اردو کو بالکل ہی تباہ دیا۔ اگر بورڈ کے کسی کونے میں اردو میں شیشن کا نام لکھ دیجے تو مجھے پتہ چل جاتا۔ مجھے کتنی خوشی ہوتی۔ پرانی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ سوکھے ہوئے پھول پھر سے تازہ ہو جاتے آپ کا کیا بگڑ جاتا مہراج۔

کس کی اردو

مہراج یہ کیا کیا آپ نے کہ اردو کا "بی" مار کر رکھ دیا۔ آپ نے سمجھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے لہذا اس کا نام نشان نہ رہے۔
نہ مہراج اردو مسلمانوں کی زبان تو نہ تھی۔ مسلمانوں کی ہوتی تو سندھ کی زبان ہوتی، ملتان کی زبان ہوتی۔

مسلمانوں کی زبان تو قدر سی تھی مہراج۔ جو سطوں کے دور میں بھی رائج تھی۔ اردو کو تو اس لئے رائج کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا فہم سے جو قدرتی بندھن تھا اسے کاٹ دیا جائے۔ تاکہ وہ ہند کو اپنا دلہن سمجھیں اور بددلی رنگ کو تباہ دیں۔
ظاہر ہے کہ رابطہ کاٹنے کا کام سراسیمہ دینے میں مسلمانوں کا فائدہ تو نہ تھا۔ ہندوؤں کا فائدہ تھا یا مغربی حکمرانوں کا فائدہ ہو سکتا تھا۔ پھر مسلمان اردو کو کیسے رائج کر سکتے تھے۔

مہراج آپ تو بڑے سمجھداریں۔ سوچ سمجھ ہندو قوم کی عظمت کا ایک نشان ہے۔ آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ چلنے بسنے لیتا ہوں کہ اردو مسلمانوں

کی زبان ہے لیکن یہ بھی تو سوچئے کیا زبان کاٹنے سے مسلمان کٹ جائے گا۔ اتفاقاً یہ بھی تو اچھا نہیں سدا ج۔ آپ کی قوم میں صبر ہے، عقل ہے، برداشت ہے۔ لیکن مسلمان کا نام آتے ہی یہ سب اوصاف کیوں معدوم ہو جاتے ہیں۔

گازی زمانے بھرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

شیشوں کی طرح باہر بھی گھپ اندر میرا تھا۔ شہروں کے نام پر تعصب کا پروہ پڑا تھا جو میری یادوں کا گلی گھونٹ رہا تھا۔ میں اپنی سیٹ پر لیٹا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا کہ ان شہروں کو پہچان نہ سکا جن کی خوشبو سونگھنے کے لئے میں بے قرار تھا۔

امید ہی سداے فساد کی جڑ ہے۔ امید بے قراری کو چمکائے رکھتی ہے۔ کروٹیں بدلنے کی صورت قائم رکھتی ہے۔ امید بڑی ظالم ہے ناامیدی کتنی ہمدرد ہے یوں جیسے لوری ہو تھپک تھپک کر سلا رہی ہے۔

آہستہ آہستہ وسعت کے گہروں کو چھتوں پر جلتی ہوئی تڑپیں دھندلانے لگیں۔ دھندلاتی گئیں اور پھر نیند کا سیاہ بارل چھا گیا۔

سفر:

جب میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ کوپے کے زائرین سب ہسٹریٹ رہے ہیں۔ سلمان اکٹھا کر رہے ہیں۔

دوسرے کوپے میں لیڈر صاحب بیٹھے آنکھیں مل رہے تھے۔ وہ اپنی بکھری ہوئی شخصیت کو اکٹھا کر رہے تھے۔ وازمی پر ہاتھ پھیر رہے تھے تاکہ وہ اپنی فلام میں آجائیں۔ پویشانی سلا رہے تھے کہ وقار کے سلوٹ پھر سے پڑ جائیں اور وہ ویسے ہی معزز دیکھے لگیں۔

آخری کوپے میں بھارتی پولیس افسر اور سیکورٹی والے ہانڈیاں باندھ رہے تھے۔ پھرے دار سپاہی لوگ لوگھ کر لب جلق و چوبند بیٹھا تھا۔ لیکن اس کی پگڑی پر نیند اور اوگھ کے آثار ابھی تک موجود تھے۔ گازی کے باہر ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں ولی کے سفر صاف نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے گہروں سے۔ چھتوں پر چھپی ہوئی چار پائیاں۔ چار پائیوں پر بیٹھے ہوئے، کھانستے ہوئے بوڑھے، انگریزیاں لیتی ہوئی نوجوان

لڑکیاں اور مکانات سے کچھ فاصلے پر بھاڑیوں میں رفع حاجت کے لئے بیٹھے ہوئے لوگ۔

یہ مناظر ریل کی لائنوں پر اور ایمر پور فوں کے گرد و نواح میں ہر بڑے شہر سے پہلے نظر آتے ہیں۔ چاہے وہ دہلی ہو کر اچھی ہو یا لاہور ہو۔ یوں سیاحوں کو پہلے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ عوام کا رہن سن کیسا ہے لیکن ہم ہیں کہ اس تفصیل کو بالکل بھولے رہتے ہیں۔ باہر سے آنے والے ڈمکنیئر یہ کا بڑے اہتمام سے استقبال کرتے ہیں۔ انہیں ترقی یافتہ علاقوں میں لئے پھرتے ہیں۔ جالی شٹن ہوٹلوں میں فصراتے ہیں۔ ان کو شہر کے عوامی علاقوں سے دور رکھتے ہیں تاکہ وہ عوامی رہن سن سے واقف نہ ہوں۔

ہم یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ ریلوے سٹیشن یا ایمر پورٹ پر پہنچنے سے پہلے وہ ہمارے سلمز کا نظارہ کر چکے ہیں۔

پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا جب ہم ہروانی دزخہ کو فخر سے اپنا عوامی رہن سن دکھانے کا اہتمام کریں گے اور اپنے تھون پر شرمساری محسوس نہ کریں گے۔ گاڑی جتنا کے پل پر پہنچ چکی تھی۔

تمام ڈائری اپنا اپنا سلمان اٹھائے کھڑے تھے۔ لیڈر صاحب کی شخصیت پارے طور پر بھال ہو چکی تھی۔ بھارتی پولیس مونڈھ پ تاؤ دے رہی تھی۔ سفید کپڑوں میں ملبوس سیکورٹی کا ایک جانب چوری چوری چپکے چپکے ہلدی گنتی میں مصروف تھا۔ گاڑی دہلی کے پلیٹ فارم میں داخل ہو چکی تھی۔



دلی

جب ہم دلی کے پلیٹ فارم پر اتر رہے تھے تو ہماری بوگیوں کے سامنے سات آٹھ افراد کا ایک گروپ کھڑا تھا بھارہ لوگ یوں کھڑے تھے جیسے ہم سے لا تعلق ہوں۔ لیکن جتنا لا تعلق ہونے کی کوشش کرتے اتنا ہی تعلق واضح ہو جاتا۔ ان میں سے ایک آدمی ہماری گفتنی کر رہا تھا۔

بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ باز بار گفتنی کا مطلب کیا تھا۔ کیا ہم میں سے کسی کے کھو جانے کا ڈر تھا یا یہ خوف دامن گیر تھا کہ ہم میں سے کوئی چلے دے کر بھاگ نہ جائے۔

خوف کی دیوار

ایک بات واضح تھی کہ کوئی خوف یا خطرہ ضرور محال تھا۔ یا تو وہ ہمارے لئے خوف زدہ تھے اور یا ہم سے خوف زدہ تھے۔

ہند اور پاکستان کے درمیان خوف کی ایک دیوار کھڑی ہے۔۔ کیوں۔۔ پتہ نہیں کیوں۔

پاکستان کو ابھی طرح علم ہے کہ ہند ایک بہت بڑی طاقت ہے جو اگرچہ بڑی طاقتوں میں شمار نہیں ہوتی پھر بھی بڑی طاقت ہے اور دنیا کی تیسری بڑی طاقت بننے کے لئے بے چین ہے۔

اگر پاکستان ہند سے خوف زدہ رہے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ مسلمان حقیقت پسند قوم نہیں ہیں۔ ناسیدی کے گھپ اندھیرے میں بھی مسلمان امید کا ایک چمورٹا سا دیا جلائے رکھنے کا شوقین ہے۔ اسی وجہ سے وہ خطرے کی بو سونگھنے کا انداز نہیں۔ خطرے کی بو آئے بھی تو وہ ناک سکڑ لیتا ہے۔

مسلمان انہی طور پر بے پرواہ ہے، بے نیاز ہے SO WHAT ہے۔ وہ دیکھتا ہے۔ پھر بھی نہیں سمجھتا۔ جانتا ہے پھر بھی نہیں مانتا۔ مسلمان کی سرشت میں WANTING TO BELIEVE کے ذمیر گھے ہوئے ہیں۔

اگر مسلمان ایمان نہ ہوتا جیسا کہ وہ ہے تو تقسیم کے المیہ کو کبھی نہ بھولتا۔ انشتم کی چنگاری کو سینے سے لگائے رکھتا اور یہودی کی طرح موقع کا منتظر رہتا۔ لیکن وہ تقسیم کے واقعہ کو بھول چکا ہے۔ صرف بھولای نہیں بخش چکا ہے۔ ہٹلر چمورٹو۔ دفع کر دو۔ مجھے یاد ہے جب تقسیم کے بعد پہلی مرتبہ سکھ ہتھاکرنے پاکستان میں آئے تھے تو مسلمانوں کا جی پھٹا تھا کہ انہیں کھلے سے لگائیں۔ گمر لے جا کر حلوہ پوری کھائیں ہنگامہ کریں۔ حال احوال پوچھیں۔

اس معاملے میں سکھ بھی مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ بھی جذباتی ہے۔ جذبہ اس کا اوزھنا پھوٹا ہے۔ سکھ مسلمان کی طرح سوچتا نہیں۔ دو اور دو چار نہیں گنتا۔ جب سکھ پہلی مرتبہ ہتھاکرنے آیا تھا تو پاکستان میں یوں گھوٹا پھرتا تھا جیسے اپنے دیس کی ٹکلیوں میں شمل لگا رہا ہو۔ سکھ مسلمان سے خائف نہیں۔ پھر یہ خوف کی دیوار کیسی جو ہند اور پاکستان کے درمیان کھڑی ہے۔

رہا ہند۔ تو ہندو ایک حقیقت پسند قوم ہے۔ ہندو کو علم ہے کہ وہ ایک طاقتور قوم ہے اور اسے پاکستان سے کوئی خطرہ نہیں۔ پھر یہ خوف کی دیوار کیوں۔ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں ہر چند ماہ کے بعد ہند کے اخبارات جلی حروف میں سرخیوں چھاپ دیتے ہیں کہ پاکستان ہند پر حملہ آور ہونے والا ہے۔ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ہند کے اخبار نویس اسحق میں سمجھ رہے ہیں۔ ہم سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ پھر وہ ایسی سرخیوں کیوں چھاپتے ہیں۔ مدراج کیا بات آپ کی سمجھ میں آتی ہے۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتی۔ یہ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ ڈر خوف جو کشمیر اور پنجاب کا پھیلا یا ہوا ہو۔ یہ تو

حقیقت ہے کہ ہند میں جو تعظیوں اور نجومیوں کا زور رہا ہے لیکن آج کل ہندو نسل میں تو وہ ضعیف لامتناہی نہیں جو پرانی نسل میں ہوتی تھی آج کی نسل تو روشن خیال ہے۔ پھر یہ خوف کی دیوار کیوں۔

اس انڈیا میں ہم پلٹ فارم سے نکل کر سٹیشن سے باہر پہنچ چکے تھے۔ باہر آتے جاتے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ہم سب ایک جتنے کی صورت میں کھڑے تھے۔ اوپر ہندو سیکورٹی کے اہل کار تھے۔ اوپر وردی میں لمبوس پولیس تھی۔ ہمارے سینوں پر بے لگے ہوئے تھے جن پر پاکستانی زائر لکھا ہوا تھا۔ آنے والوں کو پتہ تھا کہ ہم پاکستانی زائر ہیں۔ اس کے باوجود کوئی راہ گیر ہمیں لاگ یا لگاؤ کی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ کسی کی پیشانی پر اعلیٰ نہیں تھے۔ کسی کے انداز میں نفرت یا خوف نہ تھا۔ وہ ہمیں کوئی الجھن بھی نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ یوں دیکھ رہے تھے جیسے انہوں کو دیکھتے ہیں۔ کئی ایک کے دلوں کا جذبہ چرے پر ابھر آیا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ پاس آئیں۔ حال پوچھیں۔ اور کہیں "کوئی سیوا سدا رہے"۔

نہیں یہ جذبہ دکھاوے کا نہ تھا۔ یہ رام رام منہ میں نہ تھا بلکہ دل سے ابھر رہا تھا۔ ہند کے عوام میں تو کوئی خطرے کا احساس نہیں۔ خوف کا شائبہ نہیں۔ پھر یہ خوف کی دیوار کیوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

جب زائرین کی ہمیں چلتے والی فہم اس وقت بھی ہماری سمجھتی ہو رہی تھی۔ اتنی بار ہماری سمجھتی ہو چکی تھی کہ زائرین نے اس کا ٹوش لینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ گنو بھر گنو۔ گنتے رہو۔

زائرین کی ہمیں چل پڑیں۔ آگے آگے سیکورٹی دیں تھی شاید پیچھے بھی ہو۔ دونوں ہوں کے اندر بھی سیکورٹی کے آدمی موجود تھے۔

اصلی لڑکی

ہاں تو یہ وہ دلی ہے۔ میں نے سوچا وہ دلی۔ مجھے جیتے ہوئے دن یاد آ گئے۔ پہلی مرتبہ جب ہم دلی گئے تھے تو میں چھٹی ساتویں میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں میرے والد راجک میں متعین تھے۔ دلی میں ماموں رہتے تھے۔ ماموں نے بلایا تھا۔ اٹکا بڑا شہر دیکھ کر میں گھبرا

گیا تھا۔ چوڑی چوڑی سڑکیں۔ بڑی بڑی عمارتیں۔ کچا کچھ بھرے بازار۔

پھر ماموں نے ہمیں دلی کی جگہیں دیکھنے کے لئے بھیج دیا تھا۔ سداون ہم جگہیں دیکھتے رہے۔ قلعہ کی لاٹ۔ ہاہوں کا مقبرہ۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا حوزہ۔ جنرل منتر۔ دھوپ گھڑی۔ شہلی مسجد۔ لال قلعہ۔

ان جگہوں کو دیکھ کر میں دلی شہر کی عظمت کو بھول گیا۔ وہ سڑکیں۔ بازار۔ جھرم۔ دکانیں سب میرے ذہن میں مدغم پڑ گئے۔ زندگی میں پہلی بار میری نگاہوں میں مغلوں کی عظمت ابھری۔ ابھرتی چلی گئی۔ ہند کے مسلمان بادشاہ جو میرے لئے صرف تاریخ کی کتابوں میں جیتے تھے۔ کتابوں سے باہر نکل آئے اور ساری دلی پر چھا گئے۔ یا اللہ یہ کیا انسان تھے یا جن جو دلی کے گرد و نواح میں اپنے نقش چھوڑ گئے۔

شام کے وقت ماموں کا بڑا بیٹا بشارت علی مجھے انگلی لگا کر باہر لے گیا بولا آؤ تمہیں دلی دکھاؤں۔

دلی تو میں نے دیکھ لی۔ وہ کیا بتا رہا ہے۔ مقبرے ہیں۔ قلعے میں مسجدیں ہیں۔ وہ ہنسا۔ بولا ”اسحق دلی حوزہ اور مقبرے نہیں ہیں۔ دلی تو ایک جیتی جاگتی شے ہے۔“

ماموں مہارک علی صراط مستقیم آ رہی تھے۔ ان کے صرف تین کام تھے۔ ڈاک خانے میں نوکری کرتے تھے۔ گھر میں نمائیں پڑھتے اور مسلسل اپنی بیوی کی ڈانٹ ڈپٹ سنتے اور اسے پی جانے کی کوشش میں لگے رہتے۔ شاید اسی وجہ سے ان کی صورت نورانی ہو گئی تھی جو گھر میں چراغ کی طرح غمگین رہتی۔ اس چراغ کے نیچے گھپ اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں بشارت جو ان ہوا تھا اور اس کی جوانی میں مستی کا رنگ ابھرا تھا۔ بشارت گورا چٹا تھا۔ ذہن میں رنگ پتھری چلتی تھی۔ آنکھوں سے پھوار لڑتی تھی۔

بشارت مجھے سیٹھوں کے تھیمز میں لے گیا۔

اس زمانے میں ہند میں تھیمز اپنے معراج پر تھا۔ تھیمز کی دنیا پر آغا حشر کی حکومت تھی۔ چست مکالے۔ چلت دھنیں۔ حسین سیلیوں کے جہرمت میں پٹاخے کی فلول پر چٹم وزن میں بدلے والے سین کچے راگ میں رہے ہوئے تھے۔

ساری دلی حسیں پر ہزار جان سے قربان تھی۔

سقا سداون ملکیں بھر بھر کر تھک جاتا تاکہ رات کو حسیں کا ٹکٹ خرید سکے۔ مزدور حسیں کا ٹکٹ خریدنے کے لئے محنت مزدوری حاصل کرنے کے لئے جان کی پادری لگا دیتے۔ دلی کے ہانگے سداون کہیں سے رقم ہتھیانے کی فکر میں لگے رہتے کہ حسیں کا ٹکٹ نہ ہو جائے۔

حسیں کو کچھ کر میں بھوت رہ گیا۔ مظلوم کی ساری عظمت ذہن سے نکل گئی۔ کھیل کی ہیروئن پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔

ہیروئن کی پہلی ہنستی پر بشارت نے مجھے کہنی ہدی۔ اس لڑکی کو دیکھتا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر تو پہلے ہی میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ مزید دیکھنے کی ہمت نہ رہی تھی۔ بشارت کی بات کتنی مصلح تھی جیسے اس لڑکی کو نہ دیکھنا اپنے بس کی بات ہو۔ وہ ایسی نہ تھی جسے لوگ دیکھتے ہیں وہ تو ایسی تھی جو دکھتی تھی۔ خود بخود دکھتی تھی پتھر اور دیکھنے نہ دیتی تھی۔ صرف آنکھوں سے نہیں جسم کا رول رواں اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا۔

حسیں ختم ہوا تو بشارت بولا۔ ”وہ لڑکی تم نے دیکھی تھی نا۔“

”ہاں۔۔۔ میں نے کہا۔ وہ سب لڑکیوں سے بہت کر تھی۔“

وہ ہنسا۔ بولا۔ ”اس حسیں میں تو ایک ہی لڑکی اصلی ہے۔“

”اور باقی جو اتنی ساری حسیں“ میں نے پوچھا۔

”وہ سب نقل ہیں۔“

”نقلی“ مجھے بات سمجھ میں نہ آئی۔

”باقی سب لڑکے ہیں“ وہ ہنسا۔ ”لڑکی کا روپ دھارنا ہوا ہے۔“

اس زمانے میں حسیں میں کوئی لڑکی کام کرنے پر تیار نہ ہوتی۔ ان دنوں زمانہ ڈب ڈب ہوتا تھا۔ بڑی شدت سے الگ ہوتا تھا۔ عورت یا تو گھر کی صورت میں بندھی ہوتی یا لے لے چڑے پردوں میں مدفون ہوتی۔ ہائیکے بکسی میں خیمے کی طرح چھپی چھپی ہوتی۔

بشارت نے مجھے پھر کہنی ہدی۔ بولا۔ ”یہ لڑکی پادری لڑکی ہے۔“

”وہ کیا ہوتی ہے پادری لڑکی۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ جو بہت حسین ہوتی ہے۔ بہت طرح دلا ہوتی ہے جس کے بال اوپر سے لے

کر پاؤں تک لے ہوتے ہیں۔ ”

”ہاں ہاں — اس کے ہاں بہت لمبے تھے ” میں نے کہا۔

”ایک بہت بتاؤں تمہیں ” وہ بولا۔

”بتاؤ۔ ”

”یہ پارسی لڑکی مجھ پر عاشق ہے۔ ”

میں نے حیرت سے بشارت کی طرف دیکھا۔ میری نگاہ میں اس کی عظمت بڑھ گئی
بڑھتی گئی بڑھتی گئی۔ اس کی شخصیت ابھری۔ ابھرتی گئی۔ ابھرتی گئی۔ اس کا قد اونچا اور
اونچا ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ اس کے شانے چابع مسجد کے چناروں کو چھونے لگے اور ساری دلی
مظلیہ جگہوں سمیت سٹ کر بشارت کے قدموں کی خاک بن کر رہ گئی۔

کیسورے پیدر دی

پھر مجھے وہ دن یاد آگیا جب میں آخری مرتبہ دلی گیا تھا۔ میرے دائیں ہاتھ ن م
راشد آکھڑا ہوا پائیں ہاتھ معلوات حسن منٹو۔ دونوں کے ہاتھوں میں گلاس تھے۔ دونوں
کے ہاں بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہونٹ ملی رہے تھے۔
منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

ان دونوں ن م راشد اور منٹو دونوں ہی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔

میں راشد کے بلاوے پر دلی گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک انوکھے موضوع پر ناک دینے
کے لئے بلا دیا گیا تھا۔ عنوان تھا ضریوں میں شاعری۔ میں نے بہت سی ضریوں کے بول
سمشاش کئے تھے۔ شاعری کا تو خیر مجھے پتہ نہ تھا۔ البتہ ان ضریوں میں کوک شاستر اور کام
شاستر سے بھی بڑی بڑی ہنسی چائیاں گھونگٹ نکالے جیسی تھیں۔ مجھے علم نہ تھا کہ جس
وقت میں ریڈیو پر تقریر کر رہا تھا، چلوڑی کی بڑی بڑی خواہشیں ریڈیو سے کان لگائے جیسی
تھیں۔

اتفاق سے جس دوست کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا اس کا چلوڑی بازار میں آنا جانا تھا۔

اسی راستہ وہ مجھے ہادی ہادی کئی ایک چھپاروں پر لے گیا۔ جو خفیہ میرا تعارف کرتا پائی جی
انھہ کر کھڑی ہو جاتی اور چڑھتا کر منگلتی۔ پہلی بولی:

”کاشفِری میں کون جتن کر کھولوں۔“

دوسری بولی

”لو گھٹ گھٹ جلی جتنا کو“

”سرے جاکر بھلدی“

تیسری بولی

”آئے سورے بھور بھلوا“

چوتھی نے کہا

”ہاٹ چلت سورے بھری سرور ڈاری رے

کیسورے بیدردی بتواری

”ہے“ وہ بولیں۔ ”خالی بول سنو دیئے جو ہمیں بلوا بھیجتے تو بولوں میں جان پڑ

جاتی۔

اگلی شام میں راشد کے ہاں مدعو تھا۔ منو آ گیا۔ دونوں پیتے رہے۔ جب وقت

ہو گئے تو آپس میں بحث چھڑ گئی۔ پھر لڑ پڑے۔ دونوں کے ماتھوں پر تھریاں پڑ گئیں۔

منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ منو گھونسا چلاتا تو مجھے لگا راشد مکالمات تو وہ بھی مجھے لگتا۔

جب مدد کہا کھا کر میں سوچ گیا تو اٹھ بھاگا۔ اس رات میں بھوکا سو یا۔

دفعتاً بس نے بریک ماری۔ پیٹے چلاؤں چلاؤں چھینے۔ میں اپنے خیالات

سے چم لگا۔

زائرین قبضہ مدد کر رہے تھے۔ بس کے سامنے ایک معصوم سا کتا کھڑا رہا

تھا۔

گلیور اور پونے

زائرین مذاق اڑا رہے تھے، قبضے نگار رہے تھے، ایک دوسرے کو ہچکڑ رہے تھے جیسے سکول کے

بچے آدمی پھنسی پر ہوں۔ ان کی توجہ گرد و پیش پر نہ تھی۔ نگاہیں ہڈار پر نہ تھیں۔ وہ دلی

کو دیکھ نہیں رہے تھے۔ صرف اسے محسوس کر رہے تھے۔ دلی کی فضا میں سانس لے رہے

تھے۔ متوجہ ہوئے بغیر دلی کے ہزار سے گزرنے کا لطف لے رہے تھے۔

پھر دفعتاً ایک دھماکہ ہوا۔ جیسے قمیض میں سٹیچ پر سے پردہ اٹھنے سے پہلے پٹاخہ چلتا ہے۔

گوٹا سٹیچ سے پردہ اٹھ گیا۔ تیرے دائیں ہاتھ ایک سرخ سی چیز ابھری۔ ابھرتی چلی گئی۔ اوپر۔ اور اوپر۔ اور اوپر حتیٰ کہ وہ ساری فضا پر چھا گئی۔ یوں جیسے کوئی زور اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں پر چھا گیا ہو۔ بھری بس۔ بس میں بیٹھے ہوئے تمام ڈاکٹر۔ سڑکیں سڑکوں پر چلتے ہوئے لوگ۔ عمارتیں سب دونوں میں بدل گئیں۔

میں نے گھبرا کر بائیں ہاتھ کی طرف توجہ کر لی۔ ارے یہ کیا دہی سرخ بیولہ بائیں ہاتھ آکھڑا ہوا۔ ڈر کر میں نے پھر سے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا۔ وہ ادھر بھی جوں کا توں کھڑا تھا۔ ادھر بھی ادھر بھی یا اللہ یہ کیا شے ہے۔ جس نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ہائی جیک کر لیا ہے۔ اونچے اونچے مینار بڑے بڑے گنبد۔ دیواریں ہی دیواریں۔ نیچے کرسی۔ اتنی اونچی کرسی۔ اس کے نیچے کھلونوں سے مکانات گھٹ مٹیے انسان رہتے ہوئے رکشے موٹریں۔

پھر اس سرخ بیولے نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور ایک دل پلا دینے والی آواز کو نچی۔ اللہ اکبر۔ ساری فضا کو بجنے لگی ہوا قرآنی۔

میں نے پہلے بھی چند ایک بار دلی کی جامع مسجد کو دیکھا تھا۔ ان دنوں وہ اتنی بڑی نہ تھی عظیم نہ تھی۔ صیب نہ تھی۔ تمام شر پر چھائی ہوئی نہ تھی۔

حاجی صاحب

بے شک ان دنوں وہ دلی کے پتھر کا مرکز تھی۔ دلی کے ہاتھ اس مرکز کے ارد گرد پھیرے لگایا کرتے تھے یوں جیسے دھن کے ارد گرد پھیرے لگائے جاتے ہیں۔ میں نے بھی کئی ایک بار اس کے ارد گرد پھیرے لگائے تھے۔ میں نے اس کے حسن کو محسوس کیا تھا۔ اس کی جاؤ بیت کو محسوس کیا تھا بیت کو نہیں۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب میں پہلی مرتبہ دلی کی جامع مسجد میں داخل ہوا تھا۔ میں نے تھکاپ کے کمرے پہنچ کر وضو کیا تھا۔ اور پھر حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے چلا ہوا ایک برآمدے تک پہنچا تھا۔ حاجی صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا میں ان کے روبرو بیٹھ گیا

تھا۔ پھر انہوں نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لئے تھے۔

اس وقت میں نے حاتی صاحب سے پوچھا تھا جناب اماں کے کہنے پر میں بیت کے لئے حاضر تو ہو گیا ہوں۔ لیکن کیا میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں۔

"پوچھئے۔" حاتی صاحب نے فرمایا۔

"جناب بیت کیا ہوتی ہے۔"

وہ مسکرا دیئے۔ "بولے یہ ایک رسم ہوتی ہے۔"

"خالی رسم ہے یا اس میں روح بھی ہے۔" میں نے پوچھا۔

ایک ساعت کے لئے وہ خاموش ہو گئے۔ پھر بولے "یہ تو روح سے بھری ہوئی

رسم ہے۔"

"اس کا مطلب کیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ خود کو میرے حوالے کر رہے ہیں۔"

"یعنی میں خود کو سپرد کر رہا ہوں۔"

"ہاں۔" انہوں نے سر ہلایا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ کھینچ لئے۔ "حاتی صاحب مجھ سے وہ طلب کیجئے جو میں

دے سکتا ہوں۔ ایسی چیز مانگئے جسے دینا میرے بس میں ہو۔ خود کو دوسرے کے حوالے کر

دینا میرے بس میں نہیں۔ حاتی صاحب میرے پاس صرف ایک "میں" ہی تو ہے۔ اسی پر

میں مان کر رہا ہوں، اسی کے سارے میں قائم ہوں۔ جی رہا ہوں۔ یہی میرا اوز حنا ہے۔

یہی پتھر حنا ہے۔ اسے میں آپ کے حوالے کیسے کر دوں۔ حاتی صاحب مجھ سے سدا ان مانگئے

کچھ میرے پاس بھی رہنے دیجئے۔"

حاتی صاحب خاموش ہو گئے۔ ان کی گردن یوں جھک گئی جیسے مراقبے میں پلے

گئے ہوں۔ دور۔۔۔ زمان و مکان سے دور۔۔۔ ماحول پر گہری خاموشی چھا گئی۔۔۔ جو جمل

خاموشی۔۔۔ صدیاں گزر گئیں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں بوڑھا ہو گیا۔ پھر حاتی صاحب نے سر

اٹھایا۔ بولے "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"بے شک رسم ادا کر لیجئے" میں نے کہا۔ "اماں کا کتنا پورا ہو جائے لیکن

بے روح کی رسم۔"

حاجی صاحب مسکرا دیے۔ انہوں نے میرے ساتھی سے جو مجھے اہل کے کہنے پر ان کی خدمت میں لے کر گیا تھا، رجوع کر کے کہا۔ ”یہ ٹھیک کہتے ہیں۔ انہیں فی الحال بیت کی ضرورت نہیں۔ آپ انہیں لے جائیے۔ اہل کی اہل سے کہئے ان کے بارے میں فکر نہ کریں۔ جس بات سے وہ ڈرتی ہیں وہ ہو کر رہے گی۔ اس کھٹالی سے گزرنا لازم ہے۔ ان کا مستقبل اچھا ہے۔ روشن لوگوں میں رہیں گے بڑی برکت ہوگی۔“

میں اٹھ بیٹھا۔ وہ مٹھنی ٹھنک جسے ہم حاجی صاحب کہتے تھے۔ جو ایک صحیف و نزار آدمی تھا جس کا سر روٹی کے بنے ہوئے گڈے کی طرح ہر وقت ہلتا رہتا تھا۔ جس کی آنکھیں روشن تھیں۔ اتنی روشن جیسے ساری شخصیت آنکھوں میں سم آئی ہو اور باقی جسم بے جان رہ گیا ہو۔ اس وقت وہ صحیف و نزار بڑا عامیری لگا ہوں میں ابھرا۔ ابھرتا چلا گیا حتیٰ کہ اس کا قدم جامع مسجد کے پتھر کے برابر ہو گیا۔

آج جامع مسجد اسی طرح ابھری تھی۔ جس طرح اس روز حاجی صاحب ابھرے تھے۔ اس طرف جامع مسجد اس طرف لال قلعہ۔ ان دونوں صیب و عظیم عملتوں کے نیچے دلی دب کر رہ گئی تھی۔

دلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کی عظمت کو محسوس کر کے مجھے یوں لگا جیسے دلی دبی مغلوں کی دلی ہو۔

قلعے سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ”بادب بالملاحظہ ہو شیدار علی خاں قاضی مرض و سما کے حضور مجدد ریہ ہونے کے لئے تشریف لارہے ہیں۔ بادب بالملاحظہ ہو شیدار۔“
مسجد کے پتھر اپنی کھرج آواز میں ایک ساتھ بولے۔ اللہ اکبر۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں چھلانگ مار کر بس سے باہر نکل چلوں اور چوک پر پولیس مین کی جگہ کھڑے ہو کر آتے جاتے لوگوں کو مخاطب ہو کر کہوں۔

نہ مہاراج

مہاراج یہ کیا کیا آپ نے۔۔ آپ تو اکٹڑ بھارت کے دیوانے ہیں۔ رام راجہ کے خواہاں ہیں۔ ہند کی پرانی عظمت کو از سر نو بیٹنے کے خواہشمند ہیں۔۔ یہ کیا کیا آپ نے کہ دلی کو ہند کی راج و حلی بنا لیا۔ اس دلی پر تو کبھی بھارت کی چھاپ نہیں لگ سکتی۔ یہ دلی تو پیش

مطلوب کی رہے گی۔ مسلمانوں کی دلی۔ اس عظیم مسجد کے مینار تو بیٹھ اللہ اکبر لاپتہ رہیں گے۔ اس لال قلعے سے تو بیٹھ بادشاہ ہوشیار کی آواز میں کو بجتی رہیں گی۔
مدراج آپ کو تو چاہئے تھا کہ اس مسجد اور قلعے کو کریں سے انھوں نے کسی عجیب گھر میں رکھا دیتے تاکہ یہ دلی آپ کی دلی بن سکتی۔

لیکن نہیں صرف جامع مسجد اور لال قلعے کی بات نہیں یہاں تو قدم قدم پر مسلمانوں کے نقش کھ پا سوہو ہیں۔ مقبرے ہیں، مینار ہیں، باغات ہیں، محرابیں ہیں، ڈیڑھیاں ہیں، آپ کیا کیا کچھ کریں سے انھوں نے عجیب گھر میں پھنکوائیں گے۔ یہ سانپ جو گزر گئے ہیں، اتنی لکیریں چھوڑ گئے ہیں کہ کبھی مٹائے نہ مٹ سکیں گی۔

خالی بادشاہوں کی بات نہیں یہ شہر تو ان ولیوں اور قطبوں کے مزاروں کا شہر

ہے۔

ان داناؤں کا شہر ہے جن کی دین محدود نہ تھی۔ جن کے دوار سے ہندو سکھ، بدھ، مسلمان سبھی جموں ہاں بھر بھر کر لے جاتے تھے۔ یہی لوگ ہند کے فاتح تھے مدراج۔ یہی وہ حکمران تھے جنہوں نے ہند کو فتح کیا۔ اپنے اسلامی کردار کی عظمت سے لوگوں کے من موہ لئے۔ دان پن کے دریا بہا دیے۔ لوہے کے فرق مٹا دیے۔ ہندویت نے جو ذات پات کی بھٹی سر پر سہار رکھی تھی اسے منی میں رول دیا۔

صرف دلی کی بات نہیں مدراج۔ انہوں نے سارے ہندوستان کا نقش بدل دیا۔ ایک اکیلے جھوڑی نے لاہور کی دانا کی گھری بنا دیا۔ ایک اکیلے غریب نواز نے امیر کو امیر شریف میں بدل دیا۔ ایک اکیلے فریڈ نے احمد حسن کو پاک پتن بنا دیا۔ ایک اکیلے درویش نے احمد پرست کو دلی میں بدل دیا۔

ان کے ہوتے ہوئے دلی کبھی آپ کی دلی نہیں بن سکے گی۔ یہ دلی انہی کی رہے گی جن کی پھلپ یہاں قدم قدم پر لگی ہوئی ہے۔

میں چوک میں کھڑا تقریر کر رہا تھا۔ میرے ارد گرد دلی کے ہاسیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان سب کے من کھلے ہوئے تھے۔ وہ سب حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

پھر پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔ ”اب یہ دلی ہماری ہے۔ یہ قلعہ۔ یہ مسجد

تہارے ہیں۔"

بے کار ہے بے کار ہے میرے دل سے آواز اٹھی۔ مانوسیت نے من کی آنکھوں پر پردے ڈال رکھے ہیں تاکہ ان کا دل نہ دکھے۔
مانوسیت کتنی بڑی رحمت ہے۔

بیوٹی اینڈریسٹ

میرے ایک دوست کی شادی ایک انتہائی حسین عورت سے ہو گئی۔ وہ روڈ
میرے پاس آیا۔ "بولامفتی میں کیا کروں میں تو مارا گیا۔"
میں نے پوچھا "کیوں کیا ہوا۔"
"بولامہری شادی ہو گئی ہے۔"
"اس میں مارا جانے کی کیا بات ہے۔"
"ہوا۔" ہے۔"
میں نے کہا "کیا۔"
"مہری بیوی اتنی حسین ہے اتنی حسین ہے کہ مجھ سے سہری نہیں
جاتی۔"

میں نے کہا "حسین بیوی مل گئی ہے تو تجھے تو خوش ہونا چاہئے۔"
"نہیں اس کا حسن نام حسن نہیں۔ بدن ایسا ہے جیسے گلابی شیشے کا بنا ہو۔
رنگ ایسا ہے جیسے سینہ حور اور میدے سے بنی ہو۔ انگ انگ رس سے بھرا ہے۔ حرکت
میں لے ہے۔ میں تو مارا گیا۔ اتنا حسن میں کیسے سہا سکوں گا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ میں
پاس جانا ہوں تو وہ میلی ہو جاتی ہے۔ میں شرمندہ ہو کر الگ ہو جاتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے
بیوٹی اینڈریسٹ مل بیٹھے ہوں۔"
دوسرے کے بعد مجھے اس سے ملنے کا پھر موقع ملا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جیسٹ خود بیوٹی
بنا بیٹھا ہے اور بیوٹی گھر کے کونے میں دھری رکھی ہے۔

بے شک مانوسیت بہت بڑی نعمت ہے۔ ورنہ یہ دو گلیور جو دل کے مرکز میں ہر
وقت کھڑے رہتے ہیں۔ ایک کلن پر ہاتھ رکھ کر لائیں دیتا رہتا ہے۔ دوسرا ہادب کے

آوازے لگا رہتا ہے۔ یہ دونوں ولی کو نا کلیل برداشت نہا دیتے۔
 نہ مہراج یہ شر آپ کی راج دھانی بننے کے کلیل نہیں اس نے آپ کو پوتا بنا رکھا
 ہے۔

دکان کی لگن

بھاری ہمیں بازار میں داخل ہو گئیں۔ دورویہ دکانیں ہی دکانیں تھیں۔ بڑی معتبر
 قسم کی دکانیں۔ ٹٹ پونہیہ دکانیں نہیں۔ ساری کی ساری دوکانیں منقل پڑی تھیں۔
 یا اللہ یہ کیا بات ہے ساڑھے آٹھ بجنے کو آئے ہیں ابھی تک کوئی دکان نہیں
 کھلی۔

ہندو ایک سرخیز قوم ہے۔ صبح پو پھٹنے وقت جاگ اٹھتا ہے۔ رنح حاجت سے فارغ
 ہو کر نماز ہے۔ روز کے روز۔ بند خسلخانے میں نہیں کھلے میدان میں۔ چاہے کتنی بھی
 سردی کیوں نہ ہو۔

گھر پر اس لئے نہیں نماز کہ ایک پختہ دو کالج کا قائل ہے۔ صبح سویرے تازہ ہوا میں
 خسل لگانے کا شوقین ہے۔ ساتھ خسل لگانے کا ساتھ داتن کرے گا۔ پھر باہر کسی کنویں پر
 دریا کنارے تلاب کنارے یا تل پر نمازے گا۔ رام نام کی جاپ کرے گا پھر گھر پہنچ کر کچھ
 کھانے پئے گا۔ اس کے بعد اس پر دکان کا بھوت سوار ہو جائے گا۔ دکان سے اسے محبت
 نہیں عشق ہے۔ اس لئے نہیں کہ دکان کھلی کا ذریعہ ہے۔ اگر ہندو کے نزدیک دکان
 کھلی کا ذریعہ ہو تو وہ بھی مسلمان کی طرح دو سو فی صد سے کم منافع کو منافع نہ سمجھے۔ نہیں
 ہندو منافع کا دیوانہ نہیں وہ گھنٹی کا پھاری ہے ایک روپیہ فی صد یا حد پانچ روپیہ فی صد منافع
 لے گا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ وہ سچ کہے سو بیٹھا ہو کا قائل ہے۔

میں نے زندگی میں کئی ہندو دیکھے ہیں جنہوں نے ایک سڑک کے کنارے ایک جھلی
 سی دوکان کھولی۔ وہی لالہ جی کی دوکان تھی وہی مکان۔ وہی گھر وہی باہر۔ ساوہ ساوہ
 رکھا۔ پکوڑے ریوڑیاں، پٹنے، تلی وال بس ایسی چیزیں۔ زندگی بھر وہیں بیٹھا رہا۔ وہی جھلی
 وہی سودا اور پھر ایک روز سنا کہ لالہ جی کا دہانت ہو گیا۔ اور جھلی سے لاکھ روپے برآمد
 ہوئے۔

ان دنوں کا لکھ پتی۔ آج کے کروڑ پتی کے برابر ہوتا تھا۔ واہ لالہ جی مہراج آپ کے صبر و تحمل اور محنت پر قربان جانیے۔ لکشمی کو پانے کے لئے اپنی ساری زندگی قربان کر دی۔

ہاں تو ہندو کو منافع کی نہیں دوکان کی نگین ہے لیکن یہ کیا ساڑھے آٹھ بیج گئے اور ایک بھی دوکان نہیں کھلی۔ شاید آج ٹانے کا دن ہو۔ میرے ذہن سے آواز آئی۔ ٹانے کا کا دن ہے تو پڑا ہو۔ ٹانہ تو بیچنے کا ہوتا ہے دوکان میں بیٹھنے کا تو نہیں۔ اگر باہر کا دروازہ کھولنا قانون کے خلاف ہو بے شک اسے بند کر دو۔ اس سے تو دوکان کا باہول اور بھی سچا ہو جاتا ہے لیکن بازار میں کوئی دوکان نہیں کھلی تھی۔ ہر دروازہ قفل تھا۔ ہائیں یہ کیا ہوا۔ کیا ہندو کے دل سے دوکان کی محبت ختم ہو گئی۔ کیا اس پورے تگن کا انت ہو گیا۔ کیا ہندو بدل گیا۔

نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہندو بھی نہیں بدل سکتا۔

بدھ مت

ہندو صدیاں بدھ مت کے تحت جیا۔ وہ بدھ مت جس نے سارے ایشیا کو بدل کر رکھ دیا۔ وہ بدھ مت جس نے باہر کے انسان کو مسح کر کے اندر کے انسان کو نکالا۔ جس نے امتیازات کو توڑ کر انسانیت کو مرکز بنایا۔ جس نے گردوار کو عظمت عطا کی۔ جس نے انسان کی تھکد و پسندی کا قلع قمع کیا۔ جس نے دھرم کو چھوڑ کر سچ کا بول بالا کر دیا۔ وہ بدھ مت جس نے سارے ایشیا کو بدل ڈالا۔ وہ بدھ مت ہندو کا ہال بیگانہ کر سکا۔ الٹا ہندو نے اس کے ماتھے پر لپٹا جگہ سجا دیا۔ اسے اپنے رنگ میں رنگ دیا اور پھر ہندومت میں جذب کر لیا۔ آج بھی وہ ایشیا کے کئی ایک ممالک میں موجود ہے لیکن ہندو اس کا چہ نہیں مانتا۔

پھر مسلمان آئے۔ سینکڑوں سال ہندو مسلمانوں کے تحت رہا۔ مسلمان بادشاہوں کا وزیر بنا۔ بڑے بڑے منصب حاصل کئے۔ مسلمانوں کے طور طریق میں رہن سہن کیا۔ لیکن اپنی جدا گانہ حیثیت قائم رکھی بلکہ مسلمان درباروں پر اپنا رنگ چڑھا دیا۔ پھر انگریز آیا۔ صدیوں ہندو انگریز کے تحت رہا۔ انگریز کا رنگ اپنایا لیکن باہر

سے اس کے رنگ میں ڈوبا نہیں۔ اپنی روایات کو سینے سے لگائے رکھا۔
 اور آج آزادی پالنے کے بعد۔ صدیوں کے بعد اپنا راج قائم کر لینے کے بعد کیا ہندو
 بدل گیا۔ کیا اس نے صبح سویرے جاگنا چھوڑ دیا۔ خضرت چھوڑ دیا۔ کیا اسے دوکان کا جنوں
 نہیں رہا۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔
 پھر یہ سادی دکانیں بند کیوں ہیں؟۔

ہو اور خوشیو

”حد ہو گئی یار۔“ ایک زازکی آواز نے مجھے چو لٹا دیا ”یہ دکانیں دیکھ رہے
 ہو۔ سائن بورڈوں کی قطاریں لگی ہوئی ہیں لیکن کسی ایک بورڈ پر اردو نہیں ہے۔“ میں
 نے بورڈوں کی طرف دیکھا۔ دونوں طرف بورڈوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔
 ارے یہ کیا۔۔۔ میں گھبرا گیا۔ سارے ہی بورڈ انگریزی میں تھے۔ یا اللہ یہ کیا امید
 ہے۔ میرا ذہن سن ہو گیا۔ اس لئے نہیں کہ کوئی بورڈ اردو میں نہ تھا بلکہ اس لئے کہ کوئی
 بورڈ ہندی میں نہ تھا۔ نہیں نہیں یہ ہند کا بازار نہیں ہو سکتا۔

ہند نے آزادی حاصل کرتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اردو کو اپنے ملک
 سے ویس لٹا دے دیا تھا۔ اس لئے کہ اسے اردو سے مسلمان کی بو آتی تھی۔ عربی رسم
 الخط کو ملک بدر کر دیا تھا چونکہ اس سے عرب کی بو آتی تھی لیکن کیا اسے انگریزی سے بو نہیں
 آتی۔ کیا انگریزی زبان سے غلامی کی بو نہیں آتی۔

ہمیں تو خیر انگریزی زبان سے خوشیو آتی ہے اور ہم اسے مطرب ہیل کی طرح لگائے
 پھرتے ہیں۔ صرف زبان ہی نہیں۔ لہجہ، لباس، رہن، سن ہارے لئے سٹیشن کا نشان
 ہیں۔ لیکن مصلحت آپ تو رام راجہ کے متوالے ہیں۔

سکاؤٹ کیمپ

ہمایوں کے مقبرے کے قریب ہمیں رک گئیں۔ ایک طرف مقبرہ تھا دوسری طرف ایک وسیع بلخ تھا۔ جو اب میدان کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ میدان کے چاروں طرف سے ملحق چار ایک کمرے تھے۔ یہ کمرے سیکوریٹی کی تحویل میں تھے۔ ان کمروں کے سامنے درختوں کی چھاؤں تھی ایک تھوڑا تھا جس پر سیکوریٹی کے لوگ کرسیاں بچھا کر بیٹھے رہتے تھے۔ سیکوریٹی کے ان کمروں میں سے ایک کمرہ لیڈران کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

تھینر ہال

سیکوریٹی کے اس ورگ کے سامنے وسیع و عریض میدان تھا جس میں دو سو قدم دور ٹین کاٹا ہوا ایک تھینر ہال تھا جو بچہ بازی ڈائریں کے لئے مخصوص تھا۔ تھینر ہال کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ تھا۔ اندر کی طرف ہال تھا۔ دوسری جانب سٹیج تھا۔ سٹیج کے بغل میں گرین روم تھا جس میں پولیس کی ایک ٹیم ٹھہر رہی تھی۔ ہال کے باہر ایک طرف چار فرسٹ فلیئر تھے جن میں ہر وقت پانی رواں رہتا۔

دوسری جانب زمین کھود کر لیٹرین بنائے ہوئے تھے جن کے نگر و پائس لگا کر پروے کے لئے جٹ پیٹ دیا گیا تھا۔

فسانہ نویس کے قریب ایک وسیع مزیلہ عمارت کے کھنڈر تھے جن پر شاہی چھاپ نہ تھی تاہم سروٹ کوارڈز تھے۔

اس سلسلے علاقے کو سکاؤٹ کمپ کما جاتا تھا جس میں ۸۹ زائرین کو پانچ دن قیام کرتا تھا۔

ہم کے لحاظ سے یہ سکاؤٹ کمپ تھا۔ دیکھنے میں مین کا بیٹا ہوا تھینر ہال تھا۔ تاخیر کے لحاظ سے ترکی حمام تھا۔

جب ہم تھینر ہال کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ہال میں چار پائیس کی چار قطاریں لگی ہوئی ہیں۔

جس طرح ہارکوں میں سپائیوں کی چار پائیس کی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ چار پائیس پر گدوں کے اوپر چاروں پر چھٹی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے پاس پینڈنٹ پچھلے کھڑے تھے جو گھومتے نہیں تھے خالی چلتے تھے۔ دیواروں میں چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں تھیں۔

سینچ خالی پڑی تھی۔ اوپر کاتھ کبڑ تھا۔ بھت میں چکاوڑ میں لٹک رہی تھیں۔ زائرین نے ہال میں داخل ہو کر اپنی اپنی چار پائی پر قبضہ جمالیا۔ اپنا اپنا سامان چار پائی کے قریب جمالیا۔

کچھ لوگ کوئت مٹانے کے لئے چار پائیس پر لیٹ گئے۔ کچھ تھکاوٹ دور کرنے کے لئے تھینر ہال سے ملحقہ فسانہ نویس کی طرف بھاگے۔ کچھ بیٹھ کر گپ شپ میں مصروف ہو گئے۔ کچھ برآمدے میں بیٹے ہوئے فی سٹل پر جا بیٹھے۔

اشفاق حسین اور میں دونوں ہی ازلی طور پر علیحدگی اور تھلکی کے بارے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہم نے ہال کے پرلے کونے میں سینچ کے مین قریب دو چار پائیس پر قبضہ جما لیا اور ہم دونوں لیٹ گئے۔

رموز خسرواں :

جب میں ریل گاڑی سے اترا تھا تو بالکل تازہ دم تھا۔ گاڑی میں چار پانچ کھٹے گمری

نہیں سوا تھا۔ موسم خوبگوار تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ میرا سلپہر کڑی کی سینوں کے ساتھ ساتھ تھا۔ میں نے اپنے پاؤں کڑی کی سینوں کے ساتھ لگا رکھے تھے تاکہ ہوا لگتی رہے۔

بسر حال جب میں ریلوے سٹیشن پر گاڑی سے اترتا تو تازہ دم تھا۔ لیکن جب میں سکاؤٹ کمپ ہال میں پہنچا تو تھکاوٹ سے چرچور تھا۔ مجھے میں نہیں آ رہا تھا کہ بس میں آدھ گھنٹے کے سفر نے یہ کلیتہت کیوں پیدا کر دی تھی۔ اور وہ بس ہند کے مشہور و معروف سرمایہ دار دادا کی کمپنی کی تھی۔ کھلی کھلی آرام وہ اور خوبصورت۔ اس میں سفر کرنا ہامٹ راحت تھا۔ پھر یہ تھکاوٹ کیسی۔ میں سوچنے لگا۔

دفعۃً میرے دائیں جانب جامع مسجد اور بائیں جانب لال قلعہ پھر ابھر آئے۔ نہیں نہیں میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سمجھ گیا بالکل سمجھ گیا۔ کوئی چیز آپ کو بڑا ہوا ہے۔ آپ کی شوکت نفس کو ہلال کر دے۔ آپ کی کلیتہت کے پر کاٹ دے تو یقیناً آپ میں تھکاوٹ پیدا ہوگی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ یا اللہ یہ دلی کے لوگ یہاں کیسے رہتے ہیں۔ کیا وہ تھکاوٹ محسوس نہیں کرتے۔

نشے کا کھانا ہے۔ خبردار ہیرو۔ درشپ کی عادت نہ ڈالو۔ تم کھڑے اور اپنا بیج ہو جاؤ گے۔

آسکر وائلڈ کا بیان ہے۔ بڑے آدمی کا بیٹا ہونا بالکل ایسے ہی ہے جیسے بڑے درخت کے سائے میں اگا ہوا چمڑا ہو۔ بیچارہ کبھی پھل پھول نہیں سکتا۔

تدریجی عملاتیں بے جان نہیں ہوتیں۔ ان میں ایک تاثر ہوتا ہے۔ یا تو اس شخصیت کا جس سے عملات منسوب ہو۔ یا اس ماحول کا جو اس عملات پر مسلط رہا۔ شفا لندن کے تدریجی قلعے لندن ٹاور میں جا کر دیکھئے۔ وہ اب تک قیدیوں کی سسکیوں اور مقتولوں کی چیخوں کے تہزات سے بھرا ہوا ہے۔ کسی کو ہمت نہیں کہ رات کو وہاں قیام کرے۔

کیا ان باتوں کا ہند کے سربراہوں کو احساس نہیں۔ میں نہیں یہ کہیے ہو سکتا ہے۔ وہ بڑے ذریعہ لوگ ہیں۔ وہ یقیناً مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ تو کیا انہوں نے جان بوجھ کر ایسے کر رکھا ہے۔ کیا اس میں کوئی سیاسی مصلحت ہے۔

بد قسمتی سے میں سیاہی نہیں ہوں۔ میں رموز خسرواں کو نہیں سمجھتا۔ نہ ہی میں ریویو شہری ہوں۔ اس لئے رموز خسرواں پر نکتہ چینی کا عادی نہیں۔

اگرچہ میں ان جان ہوں مجھے پتہ نہیں۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہند کی یہ سیاسی مصلحت صرف دو فائدے پہنچا سکتی ہے۔ ایک تو کھڑی رعایا ساز بکھر ہوتی ہے۔ دوسرے ان دے دے اثرات کو جب چاہو ہوا دے کر خوف یا غصے کی دیوار کھڑی کر لو۔

"چائے نہیں پیئیں گے آپ۔" ایک ڈاکٹر نے آکر مجھے چوٹا دیا۔

اے او:

"چائے۔ ہاں ہاں ضرور۔" میں اٹھ بیٹھا۔ شاید یہ تھکوت چائے نہ پینے کی وجہ سے ہو۔

"چلو ایک پیالہ چائے ہو جائے۔" میں نے اشفاق حسین سے بات کی۔

دوست! اس کے اندر کا ام بی بی ایس جاگ اٹھا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اوموں" وہ بولا۔ "آتے ہوئے میں نے ٹی شل کو دیکھا تھا۔ ان ہائی جیک۔ ڈرنٹی آئی ایم اے سک۔ مین۔ مجھے اچھے ناشتے کی ضرورت ہے۔ امڈا نہیں۔ میں اس کی تلخی برداشت نہیں کر سکتا۔ گزشتہ تین ماہ سے میں نے گوشت نہیں کھایا۔ ناشتے میں دہی۔ کھانے میں کدو جس میں نہ کھجی نہ نمک مرچ نہ ہو۔ یا بھوری ہو تو دال۔ ہمیں کھانے میں احتیاط برتنی چاہئے۔ پردیس میں بیمار بن گئے تو کیا کریں گے۔ اس لئے پیارے ابھی کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اٹھتے ہیں۔ بازار چلتے ہیں جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ صورت حال کیا ہے۔"

"اے او ام بی بی ایس کے بچے۔ چھوڑ ان احتیاطوں کو۔ زندگی احتیاط نہیں۔ روانی ہے۔ صحت احتیاط نہیں۔ احتیاط سے بے نیازی ہے۔ تو کس پتھر میں چڑا ہے۔ مجھے بھی محروم کر رہا ہے۔" غصے سے میں کھولنے لگا۔ لیکن میرا غصہ بے آواز تھا۔

"معقول بات ہے نا۔" اشفاق حسین نے پرچھا۔

"ہائل ہائل بہت معقول بات ہے۔" میں نے دانت نکال دیئے۔

"احتیاط لازم ہے نا" وہ بولا۔

”ظاہر ہے“ میں نے کہا اور اندر وانت چیں کر بے آواز بولا۔ ”بس کر بس کر۔
اب مجھے صحت پر لکچر نہ پلا۔“
”یہ لوگ کتنے احمق ہیں کہ جیسی کیسی چائے ہو سڑک سڑک ہلی جاتے ہیں۔“
اشفاق حسین کا ام بی بی ایس صبح میں آگیا۔
”ہانکل ہانکل احمق ہیں“۔ میں نے غصے میں جکواز بلند کیا۔ ”لیکن میں جی جو
سڑک سڑک پھرتے ہیں ان کی صحت تم سے کہیں اچھی ہے۔“
”اور پھر انہیں اپنی حفاظت کا احساس نہیں ہوتا“۔ وہ ہنسا۔
”احساس ہو تو تیری طرح تیار پڑے ہوں۔ یہ تو بے حس لوگ ہیں“۔ میں نے
جکواز بلند کیا۔

میٹائی بھینز

کچھ دیر بعد ہم دونوں ناشتے کی تلاش میں باہر نکلے تو باہر میدان میں دائریں کے ایک
گروپ نے ہمیں روک لیا۔ ایک صاحب بولے ”اوصوں باہر نہ جائیں۔“
اس لئے کہ لیڈر صاحب نے حکم چلایا کیا ہے کہ ہم سب مل کر درگاہ شریف
جلوس کی شکل میں جائیں گے۔
”لیڈر ان صاحب کو تو ہم نے دیکھا ہی نہیں“۔ اشفاق حسین بولا۔
”ہاں یار“۔ میں نے اشفاق حسین سے کہا۔ ”ہاں میں کوئی لیڈر تو نہیں دیکھا ہم
نے۔ سب دائریں دائر ہیں“۔
”ہاں میں تو بکریاں ہیں“ ایک صاحب چلائے۔ ”دکھو اے تو ادھر الگ کمرے
میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“
”وہ ادھر جتنے میں شامل کیوں نہیں ہوتے“ وہ سرا بولا۔
”جو جتنے میں شامل ہو جائیں تو پھر رہبری کیسے کریں“۔
”ہانکل درست راستہ دکھانے والے ہمیشہ الگ ہوتے ہیں۔ یہی دنیا کی ریت
ہے۔“
”لیکن وہ ہیں کہاں“۔ میں نے پوچھا۔

"اور ہریکوری کے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں ہیں۔ وہ سامنے ان کا کمرہ اینٹوں کا بنا ہوا ہے۔ نہیں کا نہیں۔"

"بس یہی ہماری ہر نصیبی ہے۔" ایک معزز زائر قریب آتے ہوئے بولے۔
 "ہمیں کوئی ایسا راہ دکھانے والا نصیب نہ ہوا تو ہم میں سے ہو۔"

"اوصوں۔" ایک صاحب چلائے۔ "ہم میں سے ہو نہیں بلکہ جو خود کو ہم میں سے کہے۔ الگ نہ جانے۔"

"وہ ہم میں سے الگ اس قدر اونچے بیٹھ جاتے ہیں کہ ساری دنیا انہیں گری گری معلوم دیتی ہے۔" پیچھے سے آواز آئی۔

"کب درگاہ شریف پر جلوس کی صورت میں جا رہے ہیں۔" اشفاق حسین نے پوچھا۔

"ایڈر صاحب نے کہا تھا آدھ گھنٹے میں۔"

"اس بات کو ۳۵ منٹ تو ہو چکے ہیں" دوسرا بولا۔

"ہم اور ہری جا رہے ہیں ہشت کرنے۔" اشفاق حسین نے کہا۔ "وہیں سے شامل ہو جائیں گے جلوس کے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

"ہلا جی جاؤ۔" ایڈر کا کیا اعتبار ہے۔"

طوطیاں والے

جب ہم کمپ کے چانک پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تھڑے پر درختوں کی چھانوں میں دس بارہ کرسیاں چڑی ہیں جن پر سیکوری والے بیٹھے ہیں۔ بظاہر وہاں نہ کوئی فائل تھی نہ کائنات گمراہ وہاں بیٹھے تھے جیسے شدت سے مصروف ہوں۔

"یہ جھگڑا کیا ہے۔" میں نے اشفاق حسین سے پوچھا۔

"بھئی یہ وہی سیکوری والے۔" اشفاق حسین نے جواب دیا "جو شیٹن سے

ہمارے ساتھ آئے ہیں۔"

زندگی بھر میں نے سرکاری نوکری کی ہے۔ پندرہ سال اطلاعات میں کام کیا ہے۔

دو سال صدر گھر میں بھی رہا ہوں۔ میں نے سیکورٹی کا نام بار بار سنا ہے۔ جابجا سنا ہے لیکن میں آج تک اس کے مفہوم کو نہیں سمجھ پایا۔

میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ جب ہمارے صدر صاحب گھر سے باہر نکلتے ہیں تو دو ایک موٹریں آگے اور دو ایک موٹریں پیچھے طوطیوں جیسی ہوتی یا تو کن کن سے کرتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ لوگ خبردار ہو جائیں۔ رک جائیں۔ سڑکیں صاف ہو جائیں۔ یہ سیکورٹی کے لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر ملا۔

ایسے جلوس کو دیکھ کر میں اکثر سوچا کرتا ہوں ہمارے یہ محترم سربراہ جن سے ہم بدل مانگتے ہیں، آزادی مانگتے ہیں۔ یہ ہمیں کیا دیں گے۔ یہ تو خود مجبور دلاچار ہیں۔ صدر ایوب کے دور میں میں نے اکثر صدر کو ان طوطیوں سے زچ اور بے زار دیکھا تھا۔ لیکن وہ ڈسپن کے بہت قائل تھے لہذا چپ چاپ سنتے تھے بی جاتے تھے۔

خبر آتی ہے کہ امریکہ سے فلاں صاحب پاکستان آرہے ہیں۔ ان کی آمد سے چھ ماہ پہلے امریکی سیکورٹی پاکستان میں آگیا کرتی ہے تاکہ ان صاحب کے دورے سے متعلق انتظامات کریں۔ چھ مہینے وہ شدت سے مصروف کار رہتے ہیں اور پھر جب دورہ خیر و عافیت ختم ہو جاتا ہے تو خوشی خوشی واپس امریکہ چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ یہاں کرتے کیا ہیں۔

جب ایوب کے دور میں میں صدر دفتر میں ملازم تھا تو سارا دن سیکورٹی کا نام سنا کرتا تھا لیکن یہ بی بی بھی دیکھنے میں نہ آتی تھی۔ صرف اتنی سی بات تھی کہ جب میں دفتر میں داخل ہوتا تو گیت کے ماتحت کمرے میں داخل ہو جاتا وہاں پولیس نما لوگ بیٹھے ہوتے۔ وہ مجھے ہوں گھور گھور کر دیکھتے جیسے قضیٰ بھٹس کو دیکھتا ہے۔ ان کی نگاہیں میرے اندر جا دھنکتی۔ اور پھر دوسری طرف سے باہر نکل جاتیں۔

ان پولیس نگاہوں سے تو میں بیٹھ سے خائف ہوں اور پولیس کے سپاہی کو دور سے دیکھ کر راست بدل لینے کا عادی ہوں۔ سپاہی کو دیکھ کر میں بیٹھ ہوں محسوس کیا کرتا ہوں جیسے ابھی ابھی میں کوئی جرم کر کے آیا ہوں۔

جب ہم ہند کی سیکورٹی کے پاس سے گزر رہے تھے اس وقت سیکورٹی والے شدت سے مصروف کار تھے۔ مصروفیت تو نظر آتی تھی البتہ کار کا پتہ نہ چلتا تھا وہ ہوں

مصروف تھے جیسے انہیں علم ہی نہ ہو کہ دو ذائقہ کمپ سے باہر جا رہے ہیں۔ اتنی بے نیازی دیکھ کر مجھے شک پڑنے لگا کہ آنکھوں کے سوا ان کے جسم کا بند بندہ ہم پر مرکوز ہے۔ وہ اپنی دوسری حیات سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ لیکن وہ آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ رہے۔ شاید اس لئے کہ ہمیں پتہ نہ چلے کہ وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ کیوں۔ کسی رولہ گیر کو دیکھنا تو ایک معصوم فعل ہوتا ہے۔

شدھ ہندو

ہر صورت ہم دونوں پھانک سے باہر نکل گئے۔ ابھی چند ایک قدم ہی گئے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی۔ مہراج۔ مہراج۔ ہم رک گئے۔ وہ ایک دہلا چلا بڑا بھرا مٹھنی آدی تھا۔ ہمیں متوجہ دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

”مہراج وہ۔۔۔ مہراج وہ۔۔۔ آپ کہاں جا رہے ہیں مہراج“۔ اس کے انداز میں نہ تو سوال تھا نہ مضامین۔ صرف گھبراہٹ ہی گھبراہٹ تھی جیسے اسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کہے۔ کیسے کہے۔

”بھئی ہم بازار جا رہے ہیں“۔ اشفاق حسین نے کہا۔ ”بشتہ کرنے کے لئے۔“

”مہراج۔۔۔ مہراج آپ جاتے ہوئے بتا جائیں تو۔۔۔ ذرا بات کر لیا کریں۔۔۔ ہاں مہراج۔۔۔“

”ٹھیک ہے“۔ اشفاق حسین نے کہا۔

اور ہم دونوں واپس چل پڑے۔

پھانک پر پہنچ کر ہم رک گئے۔

سیکوریٹی کے تمام اراکین اسی طرح شدت سے مصروف کھڑے ہوئے تھے جیسے تھری آف کے بندے میں انہیں قطعی کوئی علم نہ ہو۔

”جناب“۔ اشفاق حسین بولا۔ ”ہم ذرا بازار جا رہے ہیں۔ بشتہ کرنے کے لئے۔“

میں ہلکا ہوا، بشتہ میں دھکیلا ہوا۔ وہی یہاں لی خال پر موجود نہیں ہے۔“

انہوں نے چونک کر ہٹری طرف دیکھا۔ میں جیسے ہمارے پیچھے چڑھائی بیٹھے سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ ہٹری آگ پر شدت سے حیران ہوں۔

میں اس وقت ایک آدمی کرسی سے اٹھا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھے۔
 ”مصلح آپ جائیں ضرور جائیں، بیٹھ کر میں۔ بڑی کرپا ہے آپ کی۔“

”اگر آپ چاہتے ہیں کہ جلتے ہوئے آپ کو اطلاع کر دی جائے تو قاتل سڑک میں اعلان کر دیجئے۔“ میں نے کہا۔ ”تاکہ انہیں پتہ چل جائے۔“

”نہیں مصلح“ — وہی شخص بولا۔ ”آپ بے فکر جائیں جہاں جی چاہے جائیں۔ کوئی منجائی نہیں مصلح۔“

وہ ایک شدد بندوق تھا۔ یہ پلا شدد بندوق تھا۔ جس سے مجھے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔ سبحان اللہ کیا بندوق تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل پھول کی طرح کھل گیا۔ یہ وہ بندوق تھا جس کے ساتھ میں نے زندگی کے چالیس سال گزارے تھے۔ وہی منض، وہی بگن وہی نرم و نازک بات۔

اسے دیکھ کر مجھے وہ بندوق یاد آگیا جس کے ساتھ میں چالیس برس پہلے بے حد مانوس تھا۔

مجھے چاند یاد آگیا۔

چاند حلوائی

بنالے میں محلہ مفتیاں کے بازار میں چوراہے سے ہٹری ڈیوڑھی تک ایک ہی بندوق کی دکان تھی۔ چاند کی دکان۔ چاند منضائی بنایا کرتا تھا۔ وہ ہر آتے جاتے کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا کرتا تھا۔ بجز طور پیار سے بات کیا کرتا تھا۔

بڑوں کی بات چھوڑیے۔ بڑوں کو تو سہی سلام کرتے تھے۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا اور چینیوں میں بنالے آتا تو مجھے دیکھ کر چاند کی ہاتھیں کھل جاتیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر وہ مجھے پرہام کرتا اور بھرکتا۔ ”آگے مصلح۔ پدھارو مصلح۔“ چاند کی باتیں اس کی منضائی سے زیادہ میٹھی تھیں۔

اس کے برعکس پوچا نکیم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ طنز بھری مسکراہٹ مسکراتا۔ ”آ

گئے۔ پھر آگئے۔ دھماچو کڑی چانے۔ آؤ باجو آؤ۔"

اس کی باتیں اس کی سکینہیں سے زیادہ تلخ ہوتیں اور اس کی سکینہیں۔۔۔ تو بے فیک
مگنوٹ پیچتے تو آنکھوں سے دھواں نکلنے لگتا۔

ہندو کے بجز نے مجھے اس قدر مسرور کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کے پاکستان کے مطالبے
پر ہندو کو انکار کرتے اور جیسے بہ جیسے ہوتے دیکھ کر مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس قدر غمزہ
فصل کا ملک اس مطالبے پر چڑچڑائے کیوں جھوٹے لگا۔ یہ یکدم ایک معصوم شخص سے جن
کیسے باہر نکل آیا۔

بہر صورت اس روز سیکورٹی کے افسر کو اس انداز میں بات کرتے دیکھ کر میرا جی
چاہا کہ میں بڑھ کر اسے گلے لگا لوں۔ چار کروں۔ جب سے میں ہندو میں داخل ہوا تھا یہ پہلا
ہندو تھا جس میں روایتی ہندو کی انکساری تھی۔

سکاؤٹ کیمپ سے ایک ٹھگ سی سڑک گھومتی ہوئی ہمایوں کے مقبرے کے صدر
دروازے سے گزرتی ہوئی مین روڈ پر پہنچتی تھی۔ سامنے مین روڈ پر چدرہ لہا تھا۔ چدرہ اچے کے
راؤنڈ اپ کے درمیان میں مظنی ڈیوڑھی تھی۔ لو۔۔۔ مظلوں کی ایک اور چھاپ۔ اوھر
ہمایوں کا مقبرہ اوھر سڑک کے مین درمیان کے گولے میں ایک ڈیوڑھی۔

صدارت یہ آپ نے اس مظنی ڈیوڑھی کو سڑک کے راؤنڈ اپ میں کیوں لے لیا۔
میں ڈیوڑھیوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں آپ۔ میں تو آپ مظلوں کی دلی کے متولی
بن کر رہ جائیں گے۔

درا سوچنے مسلمانوں کے مین ہانات۔ بارہ دریوں۔ لانوں۔ مقبروں۔ جنتز حقروں۔
دھوپ گھڑیوں۔ حزاروں کے رکھ رکھاؤ پر کتنا خرچ آتا ہو گا۔ یہی رقم آپ کے
ڈیفنس بجٹ میں کام آتی۔

سڑک کو پار کرنے کے بعد ہم ایک چھوٹے سے ہزار میں داخل ہو گئے۔
ہزار میں چند بوڑھے دو روپے چادریں بچھائے بیٹھے تھے جن پر کھلونے، رسالے،
جھوٹے زیور، تھیمیں اور ایسا ہی جھوٹا سونا سا لٹکا ہوا تھا۔ ایک طرف چار ایک ریسیڑیاں
کڑی تھیں جو کچے گلے سڑے پھلوں سے بھری ہوئی تھیں۔

ان کے قریب دو ہوٹل تھے۔ روڈ ساڑھ ہوٹل۔ ایک کھلا کھلا سا نظر آتا تھا جس پر اقبال ہوٹل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دوسرے پر کوئی بورڈ نہ تھا۔ باہر سڑک پر چولے جتے ہوئے تھے جن پر دیکھیاں چڑھی ہوئی تھیں جن پر ایک معزز شکل کا آدمی ہاتھ میں مچھ لے کر کھڑا تھا۔ اندر کونٹھروں میں دو ایک آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔

اقبال ہوٹل باہر سے فراخ نظر آتا تھا۔ اندر کوئی گنگ نہ تھا۔ باہر ایک نوجوان کھڑک پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک بوڑھا کھین شیو بزرگ تھا۔
 ”آئیے آئیے۔ بیٹھے بیٹھے۔ تشریف تو رکھئے۔“

”دی۔ ہاں ہاں۔ مل جائے گا۔ میں منگوائے دیتا ہوں۔“

”ٹھنڈا پانی“ ”ہائل ہائل۔ ابھی۔ برف والا آتا ہے۔ ذرا ابھی انتظار۔“
 پورے ضمیمے ہوئے۔ کل تک انشاء اللہ ہر چیز یہاں دستیاب ہوگی۔ آپ زلموں کے ٹولے میں آئے ہیں۔ خوب بہت خوب۔“ اقبال ہوٹل والے نے گویا نیپ چلا دیا۔ ہاتھ کا ایک تار بندھ گیا۔ منڈب ہاتھیں، توت پھرت ہاتھیں، تھنڈی کی طرح چلتی ہوئی ہاتھیں۔ سڑک میں شپ سے بھری ہوئی ہاتھیں۔ رکھ رکھاؤ میں بھگی ہوئی ہاتھیں۔ میں اہل زمان سے بہت ڈرتا ہوں اس کی ہاتھیں مجھ پر ہمیشہ حاوی رہیں۔ وہ مجھے احساس کستری سے تھوڑا بھڑکتی ہیں۔ میں گونگا ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرا تمام ظلم و انوہ سب کچھ ناپید ہو جاتا ہے اور میرا وجود چلاٹا ہے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا۔ اللہ کے واسطے مجھے ایک ظلم کاٹ دے دو۔ میرے پاس جواب ہے۔ لیکن منہ زبانی ضمیمے۔ کوئی میری اہلیں ضمیمے سنتا اور میں جنوں کا توں گونگا کھڑا کھڑا رہ جاتا ہوں۔

بوڑھا جو اس اثنا میں خاموش بیٹھا تھا۔ بولا۔ ”ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے میں کی پاکستان سے ہیں۔ ہم تو پیشانی دیکھ کر بھانپ لیتے ہیں کہ پاکستان سے ہے۔“ بوڑھے کے چہرے پر مسرت کی ایک رو دوڑ گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سوکھے کھیت میں پانی آگیا ہو۔
 ”اور فرمائیے۔“ بوڑھا بولا۔ ”آپ خبریت سے تو ہیں۔“ یہ سوال پوچھتے ہوئے اس کی پیشانی کی سلونین کس رہی تھیں۔ ہم تو جیسے کیسے ہیں۔ تم تو خبریت سے ہونا الحمد للہ کہ تم خبریت سے ہو۔

وہ علاقہ مسلمانوں کا علاقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھروں سے، گرے پڑے لوگ۔ کوئی ایسا نہ تھا جسے خوش حال کہا جاسکے۔ کوئی چہرہ چمکدار نہ تھا۔ آنکھ شگاف نہ تھی۔ نظر مطمئن نہ تھی۔ نو جوان لوہڑے جو آ جا رہے تھے اگرچہ ان کے انداز میں ”ہم“ تھا۔ ہم گئے۔ ہم آئے۔ ہم نے کہا۔ ہم نے سنا! لیکن وہ ہم ٹوٹی ہوئی ”میں“ پر زبردستی سہایا ہوا تھا۔ ہر ”میں“ شکستہ تھی۔ ہر ”میں“ مستحرب تھی جس پر ہم کا غول چڑھا تھا۔ ہوٹل والے نے ہمارے سامنے چائے رکھ دی۔ ساتھ ہی اس نے کھین شیوہ بوڑھے کے سامنے بھی ایک پیالہ رکھ دیا۔

بڑھا بولا۔ ”نہیں! یہی نہیں ہم تو چائے پی کر آئے ہیں۔“
 ”پھر کیا ہوا۔“ ہوٹل والے نے کہا۔ ”ایک پیالہ اور سسی۔“
 ”نہیں۔“ بوڑھے نے بڑے وقار سے کہا ”میں تم روز ہمارے سامنے چائے کا پیالہ رکھ دیتے ہو۔ روز جانتے۔ یہ ٹھیک نہیں۔“
 ”اس میں کیا ہے۔“ ہوٹل والا بولا۔
 ”میں کیا تم چاہتے ہو کہ ہم تم سے ملنے نہ آیا کریں۔“
 ”نہیں! یہی مطلب نہیں۔“ ہوٹل والا مسکرا کر بولا۔
 ”تو پھر تم ہمیں چائے نہ پیش کیا کرو۔ بس کہہ دیا۔“
 ”یہ تو میرا فرض ہے۔“

”ہمارے بھی کچھ فرائض ہیں میں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ روز ہم تم سے مفت کی چائے پی جائیں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا“ وہ بولا۔ اب یہ اتفاق کی بات ہے۔ وہ رک گیا۔ یوں رک گیا جیسے مزید کہنے کی سکت نہ ہو جیسے الفاظ حلق میں انکڑ رہے ہوں جیسے وہ آبدیدہ نہ ہونے کی شدید کوشش میں جھلا ہو۔ ہاں یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت ہم چائے کے اس پیالے کی قیمت بھی لوا نہیں کر سکتے۔

ہم تھک رہے ہیں:

میں نے حیرت سے اس معزز ”ہم“ کی طرف دیکھا۔
 وہ چائے پی رہا تھا لیکن اس کا چہرہ سستا ہوا تھا۔ آنکھیں ہلکا ہلکا ڈوب رہی تھیں۔

ڈوب جاتیں پھر طلوع ہو جاتیں تاکہ پھر سے ڈوب سکیں۔

یا اللہ یہ ہم ابھی تک قائم ہے کیا۔ کب تک قائم رہے گا۔ سی جیل گئی۔ پھر بل کیوں نہیں اترتا۔

یہ ہم کی تذبذب پتہ نہیں کب قائم ہوئی تھی۔ ظہان ان دنوں جب دربار واری کا دور دورہ تھا۔ شہنشاہوں کے سامنے احقر۔ خاکسار اور عوام کے روبرو ہم۔ جب خود کو میں کہنا اپنے مرتبے کو کم کرنے کے مترادف تھا۔ جب ہم جمع حکظم کا میضہ نہ تھا بلکہ واحد حکظم کی شان تھی۔ جماعت کا احساس نہ تھا۔ فرد کی عظمت تھی۔ یہ ہم کی تذبذب اسلامی سپرٹ کے سراسر منافی تھی۔ چونکہ اسلام جماعتی ہم کا قائل ہے، واحد حکظم ہم کا نہیں۔

ہم کی یہ تذبذب ایک وبا کی طرح پھیلی۔ جس طرح آج مغرب کا کچھڑی کچڑ پینٹس کی ہوس کے زور پر ہمارے قصوں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ یہ وبا امراء سے شروع ہوئی اور پھر قریاء کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ ہم کا یہ زہر و باری علاقے میں پھیلتا گیا۔ پھیلتا گیا۔ حتیٰ کہ ہر ذیہ، بکر اس کی زد میں آ گیا۔

حاضری

میری زندگی کی سب سے بڑی غای یہ ہے کہ مجھ میں شعور کی کمی ہے۔ زندگی بھر
 بہت سے کام میں رسمی طور پر کرتا رہا۔ سوچے بچے غور کئے بغیر۔
 رشتے:

خانا میں نے اپنی ماں کو ملاں سمجھا ماں نہیں سمجھا۔ میں نے ماں کے مٹھوم
 پر بھی غور نہ کیا۔ اس رشتے کی نوعیت سے میں غالباً آج تک ناواقف ہوں۔ ماں
 کا مٹھوم رسم میں اس قدر دب چکا ہے کہ ہم نے بھی اس رشتے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش
 نہیں کی۔

لوگ کہتے ہیں۔ وہ میری ماں ہے۔ اس نے تجھے چنا۔ مطلب یہ کہ اس نے میرے
 لئے جتنی کی تکلیف برداشت کی۔ پھر وہ کہتے ہیں اس نے تجھے پالا پوسا۔ اپنی نیندیں میرے
 لئے حرام کیں۔ خود گھٹے ہستر پر سوئی، تجھے سوکھی طرف لٹایا۔ ان سب باتوں سے ایک
 مٹھوم ابھرتا ہے کہ ماں نے میرے لئے تکلیفیں اٹھائیں۔ قربانیاں دیں۔

یہ تفصیل اپنی جگہ درست سی لیکن یہ تفصیل ماں بیٹے کے رشتے کی وضاحت نہیں
 کرتی۔ میں نے اب ۷۷ سال کے بعد پہلی بار جانا ہے کہ میں ماں باپ کے جسم کا ایک حصہ
 تھا۔ ماں باپ کے جسم کا ایک حصہ ہوں۔ ماں باپ کے جسم کا ایک حصہ رہوں گا۔ اس
 تعلق سے پھنکارے کی کوئی صورت نہیں۔

میں نے زندگی بھر اپنے باپ سے نفرت کی۔ اس لئے کہ مجھے اس کی عادتیں پسند نہ تھیں۔ مجھے شعور نہیں تھا کہ باپ کا مضمون کیا ہے۔

اہستہ اہستہ جوں جوں میں عمر سیدہ ہوتا گیا۔ مجھے شعور ہوتا گیا کہ میں اپنے باپ سے الگ نہیں ہوں۔ میں اپنے باپ میں سے ہوں۔ اس کی وہ عادتیں جو مجھے ناپسند تھیں ایک ایک کر کے مجھ میں ابھریں اور میں حیران رہ گیا۔ یا اللہ یہ کیا ہے۔ میں تو خود کو ایک آزاد فرد سمجھتا تھا۔ ایک الگ جسم۔ ایک الگ ذہن لیکن یہ کیا میں تو الگ نہیں ہوں۔ انہی میں سے ہوں۔

اس کینو کے قہیلے میں جسے میں ”میں“ سمجھتا تھا۔ یہ پھر کی باپ کی ہے۔ یہ پھر کی ماں کی ہے یہ ایکسل باپ کا ہے۔ یہ بیچ ماں کا ہے۔ یہ دریا باپ کا ہے۔ یا اللہ میں کہاں ہوں۔ میرا کیا ہے۔ کیا میرا کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ جسے میں اپنا کو سکوں۔ یہ شعور حیران کن تھا۔ تکلیف دہ تھا۔

ہاں میری زندگی کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ مجھ میں شعور کی کمی ہے۔ رشتوں کے شعور کی کمی۔

اللہ میاں

ماں باپ کے بعد دوسرا رشتہ جو میرے ذہن میں قائم ہوا۔ لفظ بنیاد پر قائم ہوا۔ جوں جوں میں بڑا ہوتا گیا۔ جیسا کہ مینار کی طرح اس رشتے کا میلر میرھا ہوتا گیا۔ اور میرھا اور میرھا۔ اتنا میرھا کہ گر کر زمین بوس ہونا اس کا مقصود بن گیا۔ میرا یہ رشتہ۔ اللہ میاں سے رشتہ تھا۔

اس غلط بنیاد کی وجہ سے میں نے اللہ کو نہ سمجھا۔ نہیں۔ نہ سمجھا۔ نہیں۔ نہ سمجھا۔ ایک تو رحمت ہے۔ اگر مجھے یہ شعور ہو جائے کہ میں فلاں بات کو نہیں سمجھتا تو دل میں بخیر پیدا ہوتا ہے۔ ہماری شکل یہ ہے کہ ہم نہیں سمجھتے لیکن کہتے ہیں کہ سمجھتے ہیں۔

میں نے اللہ کو غلط سمجھا اور یہ نہ سمجھا کہ غلط کچھ رہا ہوں۔ بچپن میں میں نے اللہ کو ایک بتا سمجھا۔ اہاں مجھے اس بت سے ڈرا یا کرتی تھی۔ یہ ایک ایسا بتا تھا جو غلط کام کرنے پر ناراض ہو جاتا تھا۔ ناراض ہو جاتا تو ڈرانا دھمکانا۔ اپنی لاشی چلاتا اور لوگوں کو پکڑ پکڑ کر

آگ کے شور میں ڈال دیا۔

پڑا ہوا تو لوگوں نے کہا اللہ نے تجھے پیدا کیا۔ پیدا ہونے کا مفہوم مجھ پر واضح نہ ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ ایسے پیدا نہیں کیا جیسے ماں کرتی ہے۔ تخلیقات کچھ ایسی تھیں کہ پیدا کرنے کا عمل ایک میکانیکی عمل نظر آیا۔ ایک حکم پڑ چلا دیا گیا۔ کن - ہو جا۔ اور سب کچھ ہو گیا۔ اس تفصیل کو میں غلط سمجھا۔ پیدا کرنے کی یہ تفصیل جو میں سمجھا، تعلق نہیں بلکہ بے تعلقی کا اظہار کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اللہ کو جانے بغیر بنا۔ لیکن اللہ سے میرا کوئی مثبت تعلق پیدا نہ ہو سکا۔

جب میں شعور تک پہنچا تو اللہ کو جاننے اور سمجھنے کی بجائے میں اس پر شکستہ چینی کرنے لگا۔ یہ میا کیوں بنایا۔ وہ ویسا کیوں بنایا۔ یہ کیا کیا۔ یہ تو عدل سے ملتی ہے۔ وہ کیا کیا۔ وہ تو حق سے دور ہے۔

جوانی میں میں بیچ بن کر بیٹھ گیا۔ اپنے روبرو اللہ کو کھڑا کر لیا اور اس کی حکمتوں پر فیصلے سناتا رہا۔ یہ غلط کیا۔ وہ خیر ٹھیک سہی۔ لیکن وہ دوسرا بالکل غلط۔ یوں میں اللہ کو سکھاتا رہا کہ نئی نوع انسان سے اسے کیا سلوک کرنا چاہئے۔

صرف میں ہی نہیں، وہ، آپ، ہم سب اللہ کے کاموں کو پرکھتے ہیں۔ ان پر شکستہ چینی کرتے ہیں۔ اسے اپنی عقل کے تابع کر لینی کو شش میں گئے رہتے ہیں۔ ہذا میں چلے تو ہم سکول ماسٹر کی طرح اسے عقل سکھائیں اور کوتاہی پر سوئی انصاف کریں۔ نکال لینا ہاتھ۔ یوں خالق اور مخلوق کا رشتہ ایک ہاتھ کی تالی کے مصداق رہا۔ خالق نے رشتہ جانا، بھایا، مخلوق نے نہ جانا۔ جب جانا ہی نہیں تو بھانا کیسا۔

حاضری

جب میں پہلی بار لاہور میں دانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے شعور نہ تھا کہ میں کس کی خدمت میں حاضری دے رہا ہوں۔ مجھے دانا کے مفہوم کا علم نہ تھا۔

جو کچھ بھی میں اس کے متعلق جانتا تھا، اس سے یہ اخذ ہوتا تھا کہ وہ ایک بڑا جاہل تھا جو لاہور میں کسی دلیہ پر بیٹھا تھا۔ لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ ہندو مسلمان امیر غریب سکرست، پتلہ۔ وہ اس سے بات کرتے تھے۔ بابا دولت دے۔ بابا صحت دے۔ بابا اولاد دے

— اور وہ دیتا جاتا تھا — دیتا جاتا تھا۔ اس لئے وہ دانا بن گیا۔

مجھے یہ بات نہ سوجھی کہ وہ تو انسان تھا۔ انسان ہے فلک کچھ دے سکتا ہے سب کچھ نہیں دے سکتا۔ سب کچھ تو بادشاہ بھی نہیں دے سکتا۔ پھر وہ دانا کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے اس بات کا شعور نہ تھا کہ اللہ کے حوالے کے بغیر کوئی دانا نہیں ہو سکتا۔ یہ وصف صرف اللہ کا ہے۔ پھر یہ علی جھویری دانا کسولانے والا کون ہوتا ہے۔ ضرور اس بڑے فقیر نے اللہ کو ہائی جیک کر رکھا ہے۔ اللہ دانا گیری کرتا ہے۔ کام اس کا، نام اس کا۔

یہ جتنے بھی دانا حزاروں میں چھپ کر بیٹھے ہیں، یہ بڑے پر اسرار بندے ہیں۔ ان میں اور ہم میں صرف ایک فرق ہے۔ ہم نے اللہ کو صرف ملا ہے جانا نہیں۔ انہوں نے اسے جانا ہے ملا ہے اور اس سے تعلق پیدا کیا ہے۔

میں اور تُو

اللہ سے تعلق پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ محبوب ہے، بڑا سخت گیر محبوب ہے۔ وہ ہر کسی کے گھر آنے کے لئے تیار ہے۔ صرف ایک شرط ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اپنا گھر صاف کرو۔ کوڑا کرکٹ جماؤ۔ گھر کو لپیٹ دو۔ دیواروں کے چالے پوچھو۔ گھر میں فرشتہ چمڑکو۔ غلاط نہ رہے۔ غلاط کی بو نہ رہے۔ اور اس کے نزدیک سب سے بڑی غلاط "میں" ہے۔ وہ میں جسے ہم زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ وہ میں جس پر ہم اپنی شوکت نفس استوار کرتے ہیں۔ وہ میں جسے ہم انفرادیت کی شان سمجھتے ہیں۔ پھر میں کیوں اللہ کو صرف اس گھر میں آنا منظور ہے جس میں موجود نہیں یا جس سے میں کا سانپ تو نکل گیا ہے لیکن اس کی کلیں موجود ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اپنی میں کو تیاگ دے۔ میری میں ہٹالے۔

صاحبزادے دانا لوگ جو دیکھنے میں نحیف و نزار نظر آتے ہیں، بہت بڑا بُت اور برداشت کے لحاظ سے انسان نہیں بلکہ جن ہیں۔ ان میں "میں" کے قلعے کو رہنہ رہنہ کر کے زمین بوس کر دینے کی قوت موجود ہے۔ یہ دانا لوگ اپنی "میں" کے فہرے سے ہوا نکال کر اسے پھسوا رہا دیتے ہیں۔

پہلے اپنی "میں" کی کھڑکی اندر لے جاتے ہیں پھر اسے کات کر تندی بنا لیتے ہیں۔ تندی

کو نکھاتے ہیں پھر اکتدے پر چڑھا کر اسے بجاتے ہیں حتیٰ کہ ”تو“ کی آواز نکلنے لگتی ہے۔

پھر تو توکر کے یہ اسے جاتے ہیں۔ جان من یہاں کوئی ”میں“ نہیں۔ یہاں تو تو ہی تو ہے اب تیری مرضی ہے چاہے آئے یا نہ آئے۔
یہ بابا لوگ اللہ کو بھی زنج کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے آ جانے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ پھر یہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس کے حضور پاؤں بیٹھ جاتے ہیں۔ اس سے باتیں کرتے ہیں۔ اس کا نور سمیٹ کر اتنا قرب حاصل کر لیتے ہیں کہ میں اور تو میں فرق نہیں رہتا۔ اس کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے کانوں سے سنتے ہیں۔ اس کی زبان سے بولتے ہیں۔

الہی یہ حیرے پُر اسرار بندے
جنہیں تو نے بھٹکا ہے ذوقِ خدا کی

شکر ہے میرے اللہ کہ میں ان جان ہوں۔ میں نے حیرے ان بندوں کی عظمت و حیثیت کو نہیں سمجھا۔ شکر ہے۔ میرے مولا کہ آج تک حیرے رسولؐ کو صرف رحمت اللعالمین کے زاویے سے دیکھا ہے عظیم انسان کے حوالے سے جاتا ہے۔ ان کی عظمت و سر بلندی پر غور نہیں کیا۔ شکر ہے میرے مولا کہ میں نے حیرے جملہ اوصاف پر نہیں بلکہ صرف رحیم اور کریم پر غور رکھی ہے۔ تیری ہیبت پر نگاہ نہیں ڈالی۔ ورنہ تیری ہیبت کے خوف سے میری ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو جاتیں۔ میرے گوشت کی پچھوٹیاں اڑ جاتی اور میں تحلیل ہو کر پھر سے عناصر میں مل جاتا۔

اس روز جب ہم امیر خسرو اور حضرت محبوب الہی کی خدمت میں حاضری دینے جا رہے تھے تو مجھ احساس نہ تھا کہ میں کس کی خدمت اللہ میں طود کو پیش کرنے جا رہا ہوں۔ وہ کون جتنی ہے جسے میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہو رہا ہوں۔

جی بات یہ ہے کہ حضرت امیر خسرو کو سلام کرنے کے لئے حاضری دینے کو میرا جی نہیں بلاتا تھا۔ سوچتا۔ میں کس من سے آپ کے سامنے جا کھڑا ہوں گا۔ کس من سے سلام عرض کروں گا۔ میں آپ کو سلام کرنے کے بدلے دلی گیا تھا۔ وہ ایک ہلانہ تھا۔ مقصود نہ تھا۔

سلام عرض کرنے کے لئے لازم ہے کہ گھر سے نیت کر کے چلیں۔ میں گھر سے ہو میری بیٹی کی کتابیں لینے کی نیت سے آیا تھا۔ اب کس منہ سے میں حضرت کی خدمت میں جا کر عرض کروں کہ عالی جاہ میں آپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

اجازت:

۱۹۶۸ء میں جب ڈاکٹر محبت اور میں حج پر گئے تھے۔ تو عین منورہ میں ہمیں ایک برکزیہ خاتون ملی۔ ہم نے محترمہ سے احوال پوچھا۔

بولی۔ ”بے شک میں حاضری دینے کی نیت سے آئی ہوں لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔ انشاء اللہ دوبارہ حاضری دینے آؤں گی۔“

ہم نے پوچھا۔ ”کیا اس حاضری میں کوئی مقم رہ گیا ہے جو آپ پھر حاضری دینے کی نیت رکھتے ہیں؟“

بولی۔ ”ہاں۔ میری یہ حاضری۔ حاضری نہ بن سکی“
”وہ کیسے محترمہ!“ ہم نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ ”حاضری میں صرف نیت کر کے آنا ہی کافی نہیں۔ حاضری وہ ہوتی ہے کہ نیت کر کے آؤ۔ لیکن اجازت ملنے کے بغیر وہیں نہ جاؤ۔ آتے وقت میں نے صرف حاضری دینے کا ارادہ کیا تھا۔ رخصتی کی اجازت کے متعلق نہ سوچا تھا۔ انتظام نہ کیا تھا اب میں واپس جانے پر مجبور ہوں۔ لہذا پھر سے حاضری دوں گی“
”کیا رخصت ہونے کی اجازت مل چکی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں“۔ وہ بولی۔ ”اگر اس نیت سے کوئی خدمت اللہ میں پہنچا رہے کہ رخصت کی اجازت ملے گی تو چلوں گا۔ تو ضرور ملے گی۔“

میں نے حیرانی سے محترمہ کی طرف دیکھا۔ اور محسوس کیا کہ محترمہ کو حاضری اور حضوری دونوں کا شعور ہے۔ اور اس عالی مرتبت شخصیت کا بھی شعور ہے۔ جس کی خدمت میں یہ حاضر ہے۔

حضرت امیر خسرو کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مجھے علم تھا کہ وہ بہت

بڑے فنکار ہیں۔ گنتی ہیں، لویب ہیں، شاعر ہیں، دانشور ہیں۔ اور اپنے مرشد کے پروانے ہیں۔

اللہ کے حوالے سے میں نے ان کو نہ جانا تھا اور اللہ کے حوالے کے بغیر کسی صوفی کو سمجھنا ممکن نہیں۔ صوفیا کرام چاند کے مصداق ہوتے ہیں۔ سورج کی روشنی بڑے قوروشن، نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ وہ بشری روشنیاں بجھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں کی قدریل توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ اپنے گھر میں گھپ اندھیرا کر لیتے ہیں۔ اور پھر آس لگا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اسے روشن کرنے والے ہماری روشنی کے طالب ہیں۔ ہماری مرضی ہے روشن کروے یا نہ کرو۔ ہم نے بتیاں گل کر دیں۔ اب ہماری روشنی کے طالب ہیں۔

علامہ اقبالؒ

مجھے علامہ اقبال کی خدمت میں ماضی دینے کا فخر حاصل ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ میکانوڈ روڈ پر رہتے تھے۔
پندرہ مئی مجھے کون ساتھ لے گیا تھا ورنہ شاید میں خود سے بھی جانے کی نہ سوچتا۔

اس زمانے میں میں بی اے کا طالب علم تھا۔ میرے نزدیک اقبال ایک بڑا شاعر تھا۔ فلسفی تھا، مفکر تھا۔ مجھے شعور تھا کہ میں ایک بڑے شاعر، مفکر اور فلسفی کی خدمت میں ماضی دینے جا رہا ہوں۔ اس زمانے میں مجھے ذلتی طور پر ادب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اقبال سے مل کر میں بہت محسوس ہوا۔ ان کا انداز شاعرانہ نہ تھا۔ شاعرانہ انداز کو میں ابھی طرح سمجھتا ہوں۔ شاعرانہ شخصیت کا ایک ٹک رنگ ہوتا ہے جو دور سے پہچانا جاتا ہے۔ اس زمانے میں میں نے کئی ایک شاعروں کو خاصا قریب سے دیکھا تھا۔ مثلاً مجید ملک تھا، آخیر تھا، صوفی تبسم تھا، حفیظ تھا، بشیر سیمائی تھا، سانگر سیمائی تھا، علوی سیمائی اکبر آبادی تھا۔

ان سب کی شخصیتوں میں شاعرانہ جھلک واضح تھی۔ علامہ اقبال میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ میرے روبرو ایک محیف و نذر اور شدت سے بے چین مضطرب آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی کلیتہً کچھ ایسی تھی جیسے اندرونی طور پر کسی شدید آندھی کی زو میں آیا ہوا منی کا دیا

ہو۔ وہ خود کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ فلسفی اور مفکر تو اس وقت ابھرتا ہے جب دنیا سو رہا ہو اور کشتی آپ ہی آپ یوں چلی جا رہی ہو جیسے مکھن میں چاقو چلا ہے۔
 ابن دونوں مجھے علم نہ تھا کہ علامہ اقبال کو نہ تو علم کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے نہ شاعری کے حوالے سے، نہ فلسفہ و فکر کے حوالے سے۔ یہ یونانسی اور حوالے سے ہر ابھرا تھا۔ شعر اور فکر تو اس پونے کے پھل پھول تھے۔

عظیم چالان

اللہ کے ابن پر اسرار بندوں کے کئی ایک سلسلے ہیں۔ کچھ ظاہر ہیں۔ کچھ گہت ہیں۔ ایک کو غریبی میں حکم ہوتا ہے کہ اللہ عازم سفر ہو اور لاہور میں جا کر بیٹھ جا۔ وہ کہتا ہے علی جاہ لاہور میں تو پہلے سے ہی یعقوب زہدانی متعین ہیں۔ حکم ملتا ہے کہ تم قبیل کرو۔ جب وہ لاہور پہنچتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یعقوب زہدانی کا جنازہ جا رہا ہے۔

اللہ کے یہ پر اسرار بندے حکم کے پابند ہیں۔ ایک کو حکم ہوتا ہے کہ جاسانلوں کی جھولیوں بھرتا جا۔ جا کھل کھیل۔ ایک کو حکم ہوتا ہے کہ چادر اٹانے میں جا بیٹھ۔ لوگوں سے دور رہ۔ اکیلا تھن۔ ایک کو حکم ہوتا ہے کہ جا اہلے قعیدے گا۔

اللہ کے ابن پر اسرار بندوں کا ایک سلسلہ ایسا بھی ہے جو علم و ادب کو اپناتا ہے۔ شعرو سخن کی بقیوں روشن کرتا ہے۔ مثلاً مولانا رومی تھے۔ شیخ سعدی تھے۔ علامہ اقبال تھے۔

حضرت امیر خسرو بھی اسی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو رنگ وینے کے لئے۔ اس رنگ ریز کے دوار تک پہنچانے کے لئے جنہیں حضرت نظام الدین اولیاء کہتے ہیں، امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین کو بلخ سے عازم ہند کیا گیا۔ چنگیز خان کے حکم و حکم کو اس ہجرت کا بہانہ بنایا گیا۔

امیر سیف الدین ہند پہنچے۔ لور دلی کے قرب و جوار میں ایک گاؤں میں جس کا نام پیالی تھا، آئے۔

آپ کے والد کو دلی لاسنے کے لئے القش کو سیف الدین کی طرف متوجہ کیا گیا۔ القش نے آپ کو مشیر حاس بنالیا۔ دلی کے ایک بزرگ عماد الملک نے اپنی بیٹی کا سیف الدین

سے نکاح کر دیا۔

یوں ابو الحسن یحییٰ الدین نوکد ہوئے تو بعد میں امیر خسرو کے نام سے مشہور ہوئے۔

چار سال نیپالی میں پرورش پائی پھر دلی آ گئے۔

باپ نے خطاطی سیکھنے کے لئے کتب بھیج دیا۔ کتب میں آپ حلیہ رومی کے ہجر میں پڑ گئے۔ زلف اور خال کے تصور میں گمن رہنے لگے۔ شعر گوئی آپ کا مقدر بن گیا۔ چونکہ شعرو سخن کے حوالے سے حضور نظام الدین کی خدمت میں پہنچا تھا۔

صاحبو! اللہ بہت بڑا پلانر PLANNER ہے اور یہ کائنات ایک عظیم پلان

ہے۔

میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ امیر خسرو ایک ملکر تھے۔ شاعر تھے۔ گانگ تھے۔ دانشور تھے۔ شہنشاہوں کے درباروں میں منگور نظر تھے۔ مرشد کے دربار پر خود کو خسرو خاشاک کے مصداق جانتے تھے۔ میری نظر میں ان کی عظمت فن کے حوالے سے نہ تھی فکر کے حوالے سے نہ تھی۔ درباری قدر و منزلت کے حوالے سے نہ تھی۔ مرشد کے دربار میں تو کچھ بھی نہیں " کے حوالے سے تھی۔ نام کے امیر تھے۔ شاید یہ نام اور درباری حاضری ان پر حائد کر دی گئی ہو۔ دربار میں ڈوبتی گئی ہو۔ بادشاہوں پر اثر انداز ہونے کی ذہنی۔ یا شاید بادشاہوں کو حضور کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہو۔ قدرت کی رمزیں کس نے جانی ہیں۔

اس وقت ہم غیاث پور کی بستی میں کھڑے تھے۔ یہ بستی حضرت نظام الدین اولیاء نے آباد کی تھی۔ جب آپ پاک فتن میں آستانہ فرید سے خلافت پا کر خلیفہ ہوئے تو مرشد نے فرمایا۔ نظام اب تو عازم دلی ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک ایسا سایہ وار درخت بنائے گا جس کی چھاؤں میں جینہ کر لوگ آرام پائیں گے۔

حضرت نظام الدین نے آکر دلی سے تین میل دور غیاث پور میں قیام کیا تھا۔ چند ہی سالوں میں آپ کی برکت سے غیاث پور ایک روحانی بستی بن گئی۔ اس وقت اس بستی پر مملوک الخانی چھائی ہوئی تھی۔ اداسی، دیرانی، بد حالی۔ ہم روضہ مبارک کی طرف چل پڑے۔ دروازے میں داخل ہوئے۔ آگے ایک

تنگ سی گلی تھی۔ اس کے دونوں جانب بیٹھے بیٹھے گمروندے تھے یا پتہ نہیں کیا تھے۔

موتلی

یا اللہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ اتنی عظیم خانقاہ۔ اتنے عظیم بزرگ کو تنگ گلیوں اور گمروندوں میں کیوں مقید رکھا ہے۔

اس سے پہلے دو ایک بار مجھے حضرت کے حرار پر حاضری کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اس زمانے میں میں طالب علم تھا۔ میرے ماموں دلی میں ملازم تھے۔ دو ایک بار ماموں سے ملے کیا تھا۔

مجھے ابھی طرح یاد ہے جب ماموں مجھے روضہ مہدک پر لے کر گئے تھے تو وہ جگہ بڑی فراخ تھی۔ کھلی کشادہ۔ ثقافت۔ روضہ مہدک پر جا کر مجھے احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک حرار ہے۔ مجھے ایسے لگا تھا جیسے دربار ہو۔ کسی شلو کی خدمت میں آکر ہوا ہوں۔

وہ فراخی اور ثقافتی جو دانا دربار میں ہے۔ پاک بنن میں بابا کے حرار پر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسنے بڑے دربار کو تنگ گلیوں سے کیوں گھیر رکھا تھا۔ کیا یہ متولیوں کا پھنکار تو نہیں۔

شاید انہوں نے پیسے کے لالچ میں گرد و نواح کی زمین کو ٹکڑوں میں بانٹ کر بیچ دیا

ہو۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ اتنے عظیم۔ اتنے طاقتور بزرگ۔ متولیوں کے سامنے اتنے زنج کیوں ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کی خانقاہوں پر موتلی وہ وصول اڑاتے ہیں۔ وہ دھمکیاں کرتے ہیں کہ حد نہیں اور یہ اللہ کے برگزیدہ بندے اف نہیں کرتے۔

میں نے لاہور میں دانا صاحب کے حرار اور اس کے گرد و نواح میں متولیوں کو ایسی ایسی گستاخیاں کرتے دیکھا ہے جن کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔ خوف سے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ متولیوں نے دربار میں نامناسب حرکات کیں۔

دانا یہ سب دیکھتے رہے، مسکراتے رہے۔ یا اللہ یہ دانا لوگ کسی مٹی سے بنے

ہوئے ہیں۔

مکيا۔

ليڈر دعا کر رہے تھے۔

يا اللہ! اتنی حکم دعا۔ اس قدر گرج در آواز میں دعا۔ کیا انہیں پتہ نہیں کہ دعا تو مانگ ہوئی ہے۔ دعا مانگنے کے لئے منگنا بننا پڑتا ہے۔ منگنا کیا اس سر تال سے مانگتا ہے۔ اتنے توجہ سر جن میں دم کا نشان تک نہیں یہ مانگنے والے کی آواز تو نہیں۔ مجھے تو ایسے لگا جیسے وہ دینے والے کی آواز ہو۔

اول تو مانگ کو آواز سے تعلق ہی نہیں۔ جتنی مانگ بھی ہو دل سے ہو۔ اتنی آواز دم ہو جاتی ہے۔ جب ہلڑے بھیک جاتے۔ بے بسی اور لا چاری کا احساس دل اور جسم کے تک انگ سے پھوٹ پڑے۔ وہ عالم دعا کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ اس وقت انسان بے آواز ہو جاتا ہے۔ زبان ساکت ہو جاتی ہے لفظ معطل ہو جاتا ہے۔ ہونٹ پھڑپھڑاتے ہیں۔ آواز پیدا نہیں کرتے۔ تکلم ڈوب کر دل میں جا نکلتا ہے۔ پھر دل سے آواز نکلتی ہے۔ عاجزی میں ڈوبی ہوئی بے آواز۔ آواز۔ منگنا مانگتا ہے۔ دینے والا سنتا ہے۔ لفظ کی اس شور اشوری میں کون سنتا ہے بھلا۔ اللہ کی بات چھوڑ دینے وہ تو مانگ ہے۔ آقا ہے۔ خالق ہے۔

انسان سے بھی مانگو تو کراری آواز نہیں چلتی۔ کوئی دینے والا ہند نہیں کہ تاکہ کوئی ڈانٹ کر مانگے۔ کڑک کر مانگے۔ دھمکا کر مانگے۔

لیکن نہیں۔۔۔ میں معافی چاہتا ہوں وہ تو ہاور مطلق ہے۔ میری کیا حیثیت ہے کہ اس پر یہ اصول عائد کروں کہ کڑک کر مانگنے والے کی نہ سن۔ وہ تو بادشاہ ہے۔ کائنات کا بادشاہ۔ چاہے تو ڈانٹ کر مانگنے والے کی جھولی بھر دے چاہے تو رو رو کر مانگنے والے کی ان سنی کر دے۔

یہ تو میرے اندازے ہیں کہ مانگ کے حضور بندہ بن کر کھڑے ہونا لازم ہے۔ دینے والے کے حضور کھڑے ہو کر منگنا بننا ضروری ہے۔

ليڈر صاحب کی دعا یوں گونج رہی تھی جیسے منہ زبانی ہو۔ جیسے زبان کے علاوہ اسے کسی عضو سے تعلق نہ ہو۔ وہ تو کتابی دعا معلوم ہو رہی تھی۔ لفظ ہی لفظ۔ لفظ ہی لفظ۔ لفظوں کا ایک طوفان چل رہا تھا۔ ہڈیوں سے خالی لفظ۔ جیسے ليڈر دعا نہیں مانگ رہے تھے

بلکہ کڑا کے دلمہ ریوڑیاں چہار ہے۔ تھے۔

پھر وہ ساری دنیا کے عقائدوں کی بات کر رہے تھے۔ ساری دنیا کے بندوں کی سفارش کر رہے تھے۔ ساری دنیا کے بے پرواہوں کو نواز رہے تھے۔ کشمیر کی بات کر رہے تھے۔ اسرائیل کی بات کر رہے تھے۔

میرا مسئلہ۔ حقیرا مسئلہ

یہ سن کر میں تو گھبرا گیا۔ میں تو ایک عام آدمی ہوں۔ میں تو ذاتی تکلیف دور کرنے کے لئے دعا مانگ سکتا ہوں۔ اپنی بیماری سے چھٹکارہ پانے کے لئے منت کر سکتا ہوں۔ مجھے ساری دنیا کے عقائدوں سے کیا تعلق۔ یا اللہ یہ کائنات میری ہے۔ یہ دنیا میری ہے۔ ساری دنیا کے بندوں کو شفا دینا حقیرا مسئلہ ہے۔ ساری دنیا کے بے پرواہوں کو ہدایت دینا حقیرا کام ہے۔ ہدایت دے یا نہ دے۔ مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میں تو صرف اپنی ذات کے لئے مشکا ہوں۔ ہاری تعالیٰ مجھے ہدایت دے۔ اپنے فضل و کرم سے مجھے کسی کا محتاج نہ کر۔ میری بیماری دور کر دے۔ تو شفا دینے والا ہے۔ جب تک مانگ اپنی ذات سے متعلق نہ ہو اس میں جذبہ کیسے شامل ہو سکتا ہے۔ دل اور روح کیسے ساتھ دے سکتے ہیں۔ بے شک میں بچے کے لئے مانگ سکتی ہے۔ باہر ہاویں کے لئے مانگ سکتا تھا۔ بس بھائی کے لئے مانگ سکتی ہے لیکن ساری دنیا کے بندوں کے لئے شفا کیسے مانگی جا سکتی ہے۔

مشکل

ساری دنیا کے لئے مانگنا مجھ ایسوں کا نہیں دانتوں کا کام ہے۔ بزرگوں کا کام ہے۔ کہیں لیڈر خود کو بزرگ تو نہیں سمجھ رہے۔ نہیں بزرگ بھلا بیٹھ میں مانگتے ہیں۔ بزرگ کیا انسانوں کے لئے سمجھتے ہیں۔ ایسی رتی رتی اپنی جتنی دعا مانگتے ہیں جو دلمہ کی ڈگڈگی کی طرح جھپے اور سامعین کہیں واہ کیا دعا مانگی ہے۔

میں ہکا بکا کرنے سے لگا کھڑا تھا۔ لیڈر کی دعا میں چمک چمک کر رہی تھی جیسے ایک پریس ٹرین ہو۔ اس چمکا چمک سے دھول اڑ رہی تھی۔ حرام مبارک پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ آواز کے اس طوفان نے میرے دل کے پت بند کر دیئے تھے۔ دل جذبات سے

پہلے تو میں سمجھا پتہ نہیں کسے اشد سے کر رہا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ مجھے جلا رہا ہے۔

”جلدی کرو جلدی“۔

”کیوں کیا ہوا“۔ میں نے پوچھا۔

”جلدی کرو۔ لیڈر صاحب حضرت نظام الدین کے حزر میں پہنچ چکے تھے۔

وہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھانے والے ہیں“۔

”تواضلیں۔ میں کیا انہیں منع کرتا ہوں“۔

”نہیں نہیں“۔ وہ چلایا۔ ”اگر آپ نے دیر کی تو دعا میں شرکت سے محروم رہ جائیں گے“۔

الحمد للہ۔۔۔ میں نے دل میں کہا۔ پھر یاد آواز بلند ہوا۔ ”چلے چلے جلدی چلے“۔ میں آ رہا ہوں۔“ اسے یقین دلانے کے لئے میں نے دو چار لمبے لمبے ڈاگ بھرے ہوں جیسے پلیٹ فارم پر بھرتے ہیں کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ وہ مجھے حرکت میں دیکھ کر مطمئن ہو گیا اور حضرت کے حزر مقدس کی طرف بھاگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر میں نے رفتار کم کر دی اور دل ہی دل میں دعا مانگتے لگا۔ یا اللہ مجھے اس حکم دعا سے محفوظ رکھ۔

جی میں حزر مہارک پر پہنچا تو اعد سے چھکا چمک سیل گاڑی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ حکم دعا یوں سن سن بول رہی تھی جیسے کولو کے تیل کے گھڑکی گھنٹی بج رہی ہو۔ پھر دفعتاً حزر مہارک کے سنگ مرمری گھن کے ایک کونے سے ایک لمبی بھری آواز اٹھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اسے یہ کیا۔ حیرت سے میری آنکھیں پانی کی بہن رہ گئیں۔

وجدانی دعا

میرے دو ہر دو آنحضرت و دو آدمیوں کا نولہ کھڑا تھا۔ ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ سر جموم رہے تھے پاؤں لٹک رہے تھے۔

ان کے ہاتھوں میں کھڑک تھے جنہیں وہ وجدانی کیفیت میں بھا رہے تھے۔ ماتھے پر شکر کی ٹمک لگے ہوئے تھے۔ سر منڈے ہوئے تھے نیچے دو حوٹیاں تلخی ہوئی تھیں۔

خالی تھا۔ اس خالم آواز نے مجھے زچ کر رکھا تھا۔

لیڈر خود تو امیر خسرو کی خدمت میں نہیں کھڑے تھے مجھے بھی ان کی خدمت میں کھڑے ہونے سے محروم کر رکھا تھا۔ اور صرف مجھے ہی نہیں سداے زائرین کو محروم کر رکھا تھا۔ وہ اس خالم دعا کی طرف اس قدر متوجہ تھے کہ انہیں احساس ہی نہ تھا کہ وہ کس کے سامنے حاضر ہیں۔

بارے وہ دعا ختم ہوئی اور لیڈر یوں چھاتی نکال کر باہر نکلے۔ جیسے میاں دلو پتھری بنا کر گراؤٹھ سے باہر نکل رہا ہو۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ امیر کے دربار میں منگناہن کر کھڑا ہو جاؤں لیکن حراز کے ماحول میں ابھی تک اس دعا کا شہدہ لہریں لے رہا تھا۔ میں نے ایسے محسوس کیا جیسے امیر خود اس کوفت سے تھک کر پہلو بدل کر لیٹ گئے ہوں۔ مجھ میں ہمت نہ پڑی کہ امیر کو مزید آزدہ کروں لیکن میں تو ذات کا منگنا ہوں۔ ہر وقت دینے والے کے سامنے ہاتھ پھیلائے رکھتا ہوں۔ میں کب امیر کے دربار سے مانگے بغیر ملنے والا تھا۔ میں نے کہا اے صاحب قلم امیر تجھے نظام نے بخشا تھا تو مجھے بخش دے۔ اے رنگ میں ڈوبے ہوئے درویش تجھے رنگ دے بولے رکھا تھا۔ تو مجھے رنگ دے۔ ایسے کہ

دھوب دھوئے جائے سداہی عمر

کائیں، قائیں

معاً "دوبار پر بیٹھا کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔ پتہ نہیں ابھی مجھے کیا کیا مانگتا تھا۔ اس خالم کو نے شور مچا کر دھول اڑادی۔ پہلے لیڈر صاحب کی کائیں کائیں نے دھول اڑائی تھی اب کو نے کی کائیں کائیں کوٹھی۔ میں دوڑ کر حراز مہلک سے باہر نکل آیا۔ مجھے دیکھ کر کو نے اور زیادہ شور مچایا۔ کائیں کائیں کی بجائے قائیں قائیں کرنے لگا۔ دفعتاً مجھے ایسے لگا جیسے وہ مجھ پر قہقہے لگا رہا ہو "احق دعوت کالے کو کون رکتے" میں پھر سے امیر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ ہاں میں دعوت کلا ہوں۔ لیکن علی جاہ تو بھی تو وہ رنگریز نہیں جو صرف بچے کو رنگ سکے۔

"آ جاؤ آ جاؤ"۔ ایک زائر دور کھڑا چلا رہا تھا۔

یا اللہ یہ کون ہیں۔ یہ کیسا نولہ ہے۔ نہام کے دوار پر ہندو پھاری۔ وہ دف بجا بجا کر محبوب الہی کو منارہے تھے۔ ان کے انداز میں کتنا بجز تھا۔ کس قدر وجدانی کیفیت تھی۔ یہ آواز اس آواز سے کس قدر مختلف تھی جو مزار کے اندر سے دعا کے روپ میں گونج رہی تھی۔ اس میں لگن تھی۔ سرشاری تھی حوالگی تھی۔ میراجی چل رہا تھا کہ اس کھڑائی ٹولے کے ساتھ شامل ہو جاؤں اور نہام جی کو تاج تاج کر منٹوں۔ اس رنگ پچھاری والے رنگر بھرا کے بل بل جاؤں۔ پھر جب تاج تاج کر تھک جاؤں تو ہاتھ جوڑ کر اس کے دوار پر جا کھڑا ہوں۔ ہے ہو مہاراج کی ہے ہو۔

”بھھو دے سوری کھری چڑیا“

میراجی چل رہا تھا کہ پرار تھنا دھوشی میں ڈوب جائے۔ دھوشی پرار تھنا میں ڈوب جائے اور آخر میں مدھم سرگوشی میں کہوں ”ہے مہاراج جیسا امیر کو قلم دیا ہے ویسا مجھے بھی دے دے۔ یہ نہ دیکھ کہ بھکاری حقدار ہے یا نہیں۔ یہ نہ دیکھ کہ سنگا ٹھیک طرح بنگ رہا ہے یا نہیں۔ دانا دیکھتے نہیں، دیئے جاتے ہیں دیئے جاتے ہیں“

دفعاً ایک آواز ابھری، سرٹی، گری، گھنیر

دیون ہار سوری جھولی بھر دے

ایک بھکشو داخل ہو کر باواز بلند گا کر پرار تھنا کر رہا تھا۔ بھکشو کی تان سن کر کھڑائی ٹولے میں گویا از سر نو چلن پڑ گئی۔ ان کے وجدان میں چنگاری گری۔ تال چڑھی۔ لے بڑھی اور اک دھماچو کڑی شروع ہو گئی۔

میراجی چاہا کہ یا علی کہہ کر چھلانگ لڑوں اور اس ٹولے میں شامل ہو کر دھمال

ناچوں۔

رجسٹری رجسٹر

چند نہیں کب تک میں وہاں ٹانٹا رہا، ٹانٹا رہا، ٹانٹا رہا۔ پھر جو مجھے ہوش آیا تو دیکھا کہ حضرت کے دولہ کے پاس بیٹھا ہوں اور میرے ارد گرد دو شخص رجسٹر اٹھائے کھڑے ہیں۔

یا اللہ یہ دونوں میرے سامنے اپنے اپنے رجسٹر کیوں بڑھا رہے ہیں۔

ایک بولا۔ ہمارے رجسٹر میں دستخط فرمائیے۔

دوسرے نے اپنا رجسٹر بڑھایا۔ جناب ہمارے رجسٹر میں دستخط فرمائیے۔
میں حیران من کا منہ دیکھ رہا تھا۔ کچھ میں نہیں آتا تھا کہ دفعتاً میرے
دستخط اسنے اہم کیوں ہو گئے۔

زندگی بھر کسی نے میرے دستخطوں کو اہمیت نہ دی تھی۔ میرا تو بنگ میں اکاؤنٹ
کلک نہ تھا پھر دستخطی اہمیت کیسی۔ دفتر میں کبھی وہ عہدہ نہ ملا تھا جو اہمیت رکھتا ہو۔

میں نے اٹھ کر ان دونوں سے جان پڑانے کی کوشش کی۔ سوچا کہ ادھر بھاگ
جاؤں۔ مین اس وقت ادھر سے دو اور رجسٹرر دار نمودار ہوئے اور میری طرف آگے
بڑھے۔ یا اللہ یہ رجسٹروں کا کیا بھید ہے۔ یہ دستخطوں کے مطالبے میں کیا راز ہے۔

اسنے میں اشتقاق حسین داخل ہوا اور باوازا بلند کہنے لگا۔

”اب آؤ گے بھی یا نہیں“۔

میں اٹھ بھاگا۔

چپے وہ چاروں رجسٹرر دار تھے۔

”صاحب دستخط تو فرما جائیے“۔

”صاحب دستخط تو فرما جائیے“۔

مہرولی

لاہور میں ایک بابائی رہتے ہیں۔ پتہ نہیں ان کا نام کیا ہے۔ لوگ انہیں شلہ بابا کہتے ہیں۔ چراہست نورانی ہے۔ انداز بے حد مختل۔ بولتے نہیں سنتے ہیں۔ اس قدر غور سے سنتے ہیں کہ بات کہنے والا بات کہہ کر یوں اطمینان محسوس کرتا ہے جیسے بات کہہ دینا ہی کافی ہو۔ بہادر اپنی کیفیت بیان کرنے کے بعد یوں محسوس کرتا ہے جیسے اتفاق ہو گیا ہو۔ نہ دوا کی ضرورت رہی ہو نہ دعا کی۔ شلہ بابا ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ مسکراہٹ بڑی دلنشیں ہے شاید اس لئے کہ اس میں بڑی معصومیت ہوتی ہے۔

تروتازہ بابا

مجھے شلہ بابا کی ایک خصوصیت بے حد پسند ہے۔ اگر ڈاکو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہو کر کہیں شلہ بابا۔ آج رات ہمارا ارادہ ہے کہ شہر میں ڈاکہ ڈالیں۔ آپ ہمارے لئے دعا کریں تو بھی جیسے یہ جہیں نہیں ہوتے۔ منہ سے منع کرنے کی بات الگ رہی۔ انکے چہرے پر بھی کوئی ایسی تبدیلی واقعہ نہیں ہوتی جس سے پتہ چلے کہ بات ناگوار خاطر ہے۔ جواب میں یوں مسکرا دیتے ہیں۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

کوئی کہتا ہے کہ شلہ بابا میں اپنی سنگیت کو اغوا کرنے جا رہا ہوں۔ آپ دعا کریں۔ شاید بابا مسکرا دیتے ہیں۔ کبھی کبھار بولتے ہیں۔ عام طور پر مسکراتے پر ہی گزارہ کرتے

کتنی ہے بحث میں پڑنے کی نسبت تو کہیں بہتر ہے کہ کانٹوں والی باز میں جاگھسو۔
اشفاق احمد اٹھ بیٹھا۔ بولا۔ ”مفتی جی اب تو لازم ہو گیا کہ تمہیں شام بابا سے
ملوؤں۔ اس بابے کا رنگ ہی زرا ہے۔ شرکت نفس کا نشان نہیں۔“ میں ”کی جگہ تو ہی
تو ہے۔ پھر بھی تو تازہ ہے۔ یوں جیسے پھول کھلا ہو۔ نقطہ نظر میں بھی، بشرے میں بھی، فکر
میں بھی۔“

خدا کھا کر اشفاق احمد مجھے اپنی موٹر میں بٹھا کر لے گیا۔
ایک ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد درختوں کے ایک جھنڈ تلے اس نے گاڑی
روک دی۔ ہم نیچے اترے۔ درختوں کے جھنڈ تلے ایک گھروندہ سا تھا۔ اس کے سامنے
ایک چارپائی پر کوئی شخص بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

ازلی اکیلا

وہ میری شام بابا سے پہلی ملاقات تھی۔
میں نے اشفاق احمد سے کہا ”یار یہ تو اکیلا بیٹھا ہے“
”ہاں“ وہ بولا۔ ”یہ تو ازلی اکیلا ہے“
”لیکن بابے تو اپنے گرو میلہ لگائے رکھتے ہیں۔“
”جیسی تو کہہ رہا ہوں۔ یہ بابا منفرد ہے۔ پتہ نہیں اس کے پاس کیا چادر ہے۔ یہ
بھینر گئے نہیں رہتا۔“

”لوگ اسے جانتے نہیں ہوں گے“ میں نے کہا۔
”جانتے ہیں۔“ اشفاق احمد مسکرایا۔ ”ابھی طرح جانتے ہیں“
”پھر جھگٹا کیوں نہیں کرتے“
”کرتے ہیں“
”پھر اکیلا کیوں ہے“
”لوگ آتے ہیں۔ جھگٹنا کرتے ہیں لیکن جلد ہی اٹھ کر چلے جاتے ہیں“
”یہ کیسے ممکن ہے کہ حاجت مند اٹھ کر چلے جائیں“ میں نے پوچھا۔
”یار اس کے پاس کوئی ایسی کلام ہے کہ لوگوں کو پاس بیٹھنے نہیں دیتا“ اشفاق احمد

نے کہا۔

”تجھے کلام کی کیا خبر۔ کلام بڑی طاقت ور چیز ہے“ اشفاق احمد جیسا۔

ہند جانے سے چھ مہینے پہلے میں دوسری بار شاہ بابا سے ملا۔

شاہ بابا سے ملنا ایک ہاتھ سے تالی بجانے کے مترادف تھا۔ جب ہریات کا جواب خالی مسکراہٹ ہو تو انسان کب تک بولتا رہے۔

نتیجہ یہ تھا کہ اشفاق احمد نور میں شاہ بابا سے ملنے جاتے۔ ان کے پاس بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے رہتے۔ مسکرا مسکرا کر شاہ بابا کی ”ورواچیں“ پک جاتیں پھر ہم واپس گھر آ جاتے۔

ہند آنے سے دو تین مہینے پہلے کا ذکر ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہند جانے کا ہم نے ارادہ ہی نہیں کیا تھا۔ اشفاق احمد مجھے شاہ بابا کے پاس لے گیا۔ بابا کے پاس بیٹھ کر ہم آپس میں حسب دستور باتیں کرتے رہے۔

پیغام سلام

اشفاق احمد نے کہا ”یاد رہا ہے تم نے وہاں ایک اللہ واسطے کا ہسپتال کھول رکھا ہے“

”ہاں کھول رکھا ہے“ میں نے جواب دیا۔

”لوگوں کو شفا بھی ہو رہی ہے کیا۔“ اشفاق احمد نے پوچھا۔

”ہم نے اللہ میاں سے معلوم کر لیا ہے“ میں نے جواب دیا۔

شاہ بابا کی آنکھ میں چمک لہرائی۔

”کیسا معلوم؟“ اشفاق احمد نے پوچھا۔

”میں نے کہا“ ہم نے اللہ میاں سے عرض کی جناب ہم آپ کے نام پر ایک مطب

کھول رہے ہیں۔ اب آپ کی ڈیوٹی یہ ہے کہ صرف اس مریض کو ہلدے مطب کا راستہ دکھائیے جسے آپ نے شفا بخشی ہو دوسرے کو نہ دکھائیے“

شاہ بابا کی مسکراہٹ شکم ہو گئی۔ چنے۔

اشفاق احمد نے کہا۔ ”بے شک شفا تو وہی دیتے ہیں۔ دوا دینے کے علاوہ تم اور

کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤنا"

میں نے کہا "ہاں ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں مطالعہ کرتے ہیں۔ پڑھ پڑھ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ وقت یہ ہے کہ ہند سے کتابیں نہیں منگوا سکتے"

"تو خود، ہند چلے جاؤ" اشفاق احمد نے کہا "کتابیں لے آؤ۔۔۔ کیوں شاہ بابا"۔۔۔

اس پر شاہ بابا کی چپ ٹوٹ گئی۔ بولے "جاؤ تو قطب صاحب کو ہمارا سلام کہتا"

دلہنسی پر میں نے اشفاق احمد سے پوچھا۔ "یاد یہ شاہ بابا کن قطب صاحب کی بات کر رہے تھے۔"

اشفاق احمد نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "تم قطب صاحب کو نہیں جانتے کیا"

میں نے کہا "نہیں تو"

"بھئی وہ حضرت بختیار خلکی کی بات کر رہے تھے۔"

"وہ کون ہیں؟ میں نے پوچھا۔"

"وہ قطب الاقطاب ہیں" اشفاق احمد نے کہا۔

"پھر تو وہ بہت بڑے ہوئے۔"

"ہاں"۔۔۔ وہ بولا۔ "حضرت نظام الدین کے دادا پیر تھے۔ وہ بابا فرید کے مرشد

تھے۔"

"پھر تو شاہ بابا کا پیغام پہنچانا لازم ہو گیا تا۔"

"ہاں۔"

"یاد میں دارآہوں کہیں بھول نہ جاؤں۔"

"اور انہوں" وہ ہنسا۔ "شاہ بابا بھولے نہیں دیں گے"

"اچھا"۔۔۔ میں نے حیرت سے کہا۔

"ہاں" وہ بولا۔ "ایک بار انہوں نے مجھے سات دن کے لئے کچھ پڑھنے کو بتایا

تھا۔ کہنے لگے۔ روز صبح سویرے فجر کی نماز کے وقت یہ آیت سات بار پڑھو۔ صرف سات

وان اللہ شفا دے گا

میں نے کہا ”شلہ ہا میں اکثر بھول جاتا ہوں“
 بولے ”اوسوں فکر نہ کریں آپ بھولیں گے نہیں ہمارا دوسہ رہا۔“
 ”اگلے روز جب فجر کی نماز کا وقت ہوا تو دروازہ بجا۔ میں جاگ پڑا لیکن سمجھا شاید میرا بیٹا نکلی یا کیسی ہے۔ اس لئے کروٹ لے کر پھر سو گیا۔

پھر دروازہ بجا۔ اتنی شدت سے بجا کہ ہم گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ مجھے اس پر بڑا غصہ آیا۔ بڑے احمق لڑکے ہیں جو دروازہ بجا رہے ہیں۔ میں نے جوتا پہنا۔ چل کر دروازے پر آیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو دروازہ اندر سے بند نہیں۔ بڑا حیران ہوا کہ اگر دروازہ اندر سے بند نہیں تو بجانے کا مقصد۔

دروازہ کھولا تو باہر کوئی نہ تھا۔ ساتھ والے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ بچے گھری نیند سو رہے ہیں۔ بڑا حیران ہوا۔ پھر دفعتاً شلہ ہا کی بات یاد آ گئی۔ آپ بھولیں گے نہیں ہمارا دوسہ رہا۔

جلائیں نہ جلائیں

جب اشفاق حسین اور میں حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے باہر نکلے تو اشفاق حسین کہنے لگا چلو یاد اقبل ہوٹل سے ایک پیالہ چائے کا پیتے چلیں۔
 ہم دونوں اقبل ہوٹل میں جا کر بیٹھ گئے۔

ابھی ہم چائے پینے سے غلغلی نہیں ہوئے تھے کہ وہی ”ہم“ صاحب آ گئے۔ آتے ہی ہوٹل والے سے کہنے لگے۔ ”میں ہمیں چائے پیش نہ کرتا۔ ہاں۔ بتائے دے رہے ہیں ہم“

”کیوں۔ آخر وجہ“ ہوٹل والے نے پوچھا۔

ہم صاحب بولے ”بھئی در پیالے پی کر آئے ہیں اکٹھے دو“

”ہائیں اکٹھے دو۔ یہ کیسے ہوا“ ہوٹل والے نے پوچھا۔

”ہیں اوسر تھمادی طرف آرہے تھے کہ شلہ صاحب مل گئے۔ سونر میں سوار تھے

ہمیں دیکھ کر سونر روک لی۔“

”کون شاہ صاحب“ ہوٹل والے نے پوچھا۔

”وہ ہیں ہمارے ایک عزیز۔ بڑی محبت کرتے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر کہنے لگے وہ جناب آج تو دل کی بات پوری ہو گئی۔ کچھ اور مانگ لیتے۔“

”کیا مطلب“ ہم نے پوچھا۔

”بولے۔“ آپ کو ڈھونڈنے لگے تھے۔ ڈھونڈے بغیر مل گئے آپ۔“

”خیریت ہاشد“ ہم نے پوچھا۔

”بولے۔“ جناب آج قطب صاحب کو سلام کرنے کا ارادہ تھا۔ صبح سے طبیعت بگڑ رہی تھی۔ میں نے سوچا کیلئے جانے میں کیا حرا ہے۔ آپ کو ساتھ لے چلیں۔“

”تو لے گئے ساتھ“ ہوٹل والے نے پوچھا۔

”بالکل لے گئے۔ وہیں کار میں بٹھایا اور لے گئے قطب صاحب کی خدمت میں۔“

”وہ تو سمجھ لیجئے کہ قطب صاحب نے بلایا ہو گا۔“ ہوٹل والا ہنسا۔

”بالکل۔۔۔“ ہم صاحب نے کہا۔ ”حضرت نے بلایا اور ساتھ گاڑی بھیج دی۔“

پھر وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔ بولے۔ ”جناب والا جس کو چاہیں بلا لیں۔ ہماری کیا حیثیت ہے۔“

یہ سن کر مجھے یاد آ گیا کہ مجھے قطب صاحب کی خدمت میں شاہ بابا کا سلام پہنچانا ہے۔

اشفاق حسین انڈر بیٹھا۔ بولا۔ ”چلو بھئی لب ڈیر سے پر چلیں آرام کریں۔“
وکان سے باہر جا کر میں نے اشفاق حسین سے کہا ”یار مجھے تو قطب صاحب کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔“

”کون قطب صاحب“ اس نے پوچھا۔

”تم قطب صاحب کو نہیں جانتے۔“

”نہیں“ وہ بولا۔

”بھئی وہ بہت بڑے بزرگ ہیں۔ قطب الاقطاب ہیں۔ ان کی خدمت میں

حاضری بست ضروری ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”تو چلو۔۔۔ لیکن تمہیں رستے کا پتہ ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو چلو پوچھ لیتے ہیں۔“ وہ جانے پر راضی ہو گیا۔

ہم نے کئی ایک رلوں گیاروں سے پوچھا۔

کسی جگہ کاراست پوچھنا بست پڑا نہیں ہے۔

کسی جگہ کاراست تھا۔ یوں کہ پوچھنے والے کی سمجھ میں آ جائے اس سے بھی پڑا نہیں

ہے۔ میں ان دونوں فنوں میں کوراہوں۔ نہ مجھے راستہ پوچھنا آتا ہے نہ جانتا۔ جانتے کی تو

میں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ پوچھنے کی مجبوری سے نجات نہیں پاسکا۔ جب بھی راستہ

پوچھتا ہوں تو جانتے والے کے خلوص، لگن اور محنت کو دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ جاتا ہے اور

میں کبھی بغیر کہہ دیتا ہوں جی سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔

دلی میں راستہ پوچھتا اور وہ بھی ایسے مقام کا جو دس چودہ میل دور واقع ہو آسان

کام نہ تھا۔

دو ایک اصحاب نے ہمیں سمجھانے کی کوشش کی۔

پھر ایک صاحب آگے بڑھے بولے۔ ”بھئی اسی بس سٹاپ سے فلاں نمبر کی بس پکڑ

لو۔ صفدر جنگ کا کنکٹ کنوا لینا۔ صفدر جنگ پر اتر جانا اور وہاں سے مہرولی کا اڈہ پوچھ لینا۔

لاڑے سے دوسری بس میں بیٹھ جانا۔ مہرولی آخری سٹاپ ہے۔ وہاں پہنچ کر قطب صاحب

کا پوچھ لینا۔

استریاں

اس وقت دفتر ٹوٹ رہے تھے۔ بڑا رش تھا۔ اس رش کی نوعیت ظاہر تھی۔ دفتر

کے اسٹنٹ کلرک اور چھوٹے افسر اپنے اپنے گھر جا رہے تھے۔ ہر سٹاپ پر نو جوانوں کے

ساتھ لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ظاہر تھا کہ وہ بھی دفتری ہیں۔

وہ بھی ایسے ہی کھڑی تھیں۔ جیسے لڑکے کھڑے تھے۔ لڑے یہ کیسی لڑکیاں ہیں۔

میں نے اتفاقاً صہبن سے کہا۔ انہیں تو پتہ نہیں کہ یہ لڑکیاں ہیں۔

”ہاں“ وہ ہنسا۔ ”میں بھی یہ دیکھ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مشینیں کام نہیں کر رہیں۔“

”مشینیں، کیسی مشینیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہمارے ہاں تو لڑکیوں کی مشینیں کٹنا کٹ چلتی ہیں۔“ اشفاق حسین بولا۔

”کیا مطلب؟“

”وہ مشینیں جو ہر وقت آنے جانے والوں کو پیغام دیتی رہتی ہیں۔ ٹک ٹک۔ میں لڑکی ہوں۔ ٹک ٹک۔ میری طرف دیکھو۔ ٹک ٹک ٹک ٹک۔ دیکھو میں کتنی اچھی لگتی ہوں۔“

”بھئی یہ ہندو لڑکیاں ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہندو استری ایک بڑی پاکیزہ شے

ہے۔“

”بے شک“ وہ بولا۔ ”پاکیزہ ہے۔ پوتر ہے لیکن شے نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لوہی نظروں سے حیر چلتے ہیں۔ یہاں بچی لگا ہوں سے چلتے ہوں گے۔“

”میں چل رہے ہاں نہیں چل رہے۔“ میں چلایا۔ ”میں تو میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ وہ ٹک ٹک گر لڑ ہیں۔ نہ ان میں فرمائش ہے نہ فیشن ہے نہ چمک ہے نہ بھڑک ہے۔ انہیں پتہ ہی نہیں کہ یہ لڑکیاں ہیں۔“

”میں یاد یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اشفاق حسین بولا۔ ”یہ شعور نہ رہے تو مرد کی تفسیر کا قصہ ہی ختم ہو جائے۔ زندگی کی ندی سوکھ جائے۔“

قطار

بس بس بس۔ ایک شور اٹھا۔

چیچے ہلو بس آگئی۔

اسے سن کر وہ دھکا پھیل کر کے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ گئے۔ اور سمٹ کر

ایک قطار بنائی۔ اس قطار میں لڑکے بھی تھے لڑکیاں بھی۔ اوپر سر کے بھی سر دھندے بھی۔

قطار بناتے وقت لڑکیوں نے خود کو الگ نہ کیا۔ نہ الگ سمجھا۔

ہمارے ہاں تو لڑکیاں ہوں الگ کمزری ہو جاتی ہیں جیسے کسی الگ مخلوق سے ہوں۔

اور یوں خود کو سنبھالتی ہیں جیسے پھوکی سوئی ہوں۔ ہونچھ سے دور رہوں۔ میں میلی ہو چوں گی۔ ہاتھ لگ گیا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ بہت کچھ ہو جائے گا۔ ناقابل برداشت قسم کا کچھ۔۔۔ نہ نہ نہ نزدیک نہ آتا۔ فاصلہ رکھوں۔ دور رہوں۔ ذرا ہٹ کے۔

وہاں ہندی لڑکیوں کو تو گویا پتہ ہی نہ تھا کہ وہ لڑکیاں ہیں یا شاید اپنا لڑکی پن انہوں نے خود سے الگ کر رکھا ہو، کہ بوقت ضرورت نکال لیں گی اور کام میں لائیں گی۔

بہر حال اس قطار میں کوئی ہونچھ نہ تھا۔ نہ ہی عمر رسیدہ لوگ خصوصی توجہ کے طالب تھے یوں جیسے ایک مزدوروں کا ٹولہ ہو۔ سب اچھا سب ایک جیسا۔ وہ ایک ایک کر کے بس میں داخل ہو گئے۔

لن لوگوں میں کتنا نظم و نسق ہے۔ میں نے کہا۔

آزادی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے قطاریں بائیں جانب لیں حالانکہ ان کے دھرم میں اونچ نیچ تھی اور بڑی شرت سے تھی اور ہم نے جن کا مسلک مساوات تھا۔ قطاریں توڑنا سیکھ لیا ہڑ بونگ بچانا سیکھ لیا۔

جب میں بس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ بس کی آخری سیٹ پر ایک شخص چاقو بٹا پڑا ہے۔ اس کے قریب ہر نو دلوں درک۔ جاتا۔ پیچھے اس کے ہاتھ میں تھما اور ٹکٹ لے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

اوسے میں حیران رہ گیا۔ وہ چاقو کنڈکٹر تھا۔ وہ اٹھ کر لوگوں کے پاس نہیں جاتا تھا۔ مسافر اس کے پاس جاتے رقم دیتے ٹکٹ خریدتے اور پھر اپنی اپنی سیٹ پر جا بیٹھتے۔

واہ یہ اچھا کنڈکٹر ہے۔ جو مسافروں کو کنڈکٹ ہی نہیں کر رہا۔ اور یہ ایسے مسافر ہیں جو ایسے کنڈکٹر کے باوجود ٹکٹ خرید رہے ہیں۔ اہلے ہاں تو بس میں ساری روٹی ہی کنڈکٹر کے دم کرم سے ہوتی ہے۔ کبھی وہ سوچے مردوتا ہے۔ کبھی آواز لگاتا ہے۔ کبھی مگھوتا ہے۔ کبھی ہٹھا کرتا ہے۔ یہاں تو بس میں ایک رنگ آلود چاقو پڑا ہے۔ نہ پوچھ نہ کچھ۔ نہ جھگڑا نہ فساد نہ دھونس نہ دھمکی۔

ہم دونوں ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔

چار ایک لڑکیاں اہلی جانب آئیں۔ ہمیں غور سے دیکھا اور پھر وہیں کھڑی ہو

گئیں۔

اشفاق حسین کھڑکی کی طرف تھا۔ میں بھیڑی جانب تھا۔ میں لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ ان چہروں پر محنت اور مستعدی ضرور دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن چمک نہ تھی۔ بھڑک نہ تھی۔ محنت اور مستعدی کے باوجود وہ چہرے مجھے بچے بچے سے تھے۔ ان سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ صرف روٹین کے دائرے میں جی رہے ہوں۔ زندگی ان کے لئے ایک روٹین ہے۔ علم و ضبط ہے۔ عشرت نہیں، پنکج نہیں، ہالڈے نہیں۔

مجیب بات یہ تھی کہ وہ ہماری طرف خصوصی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ہمیں جنکس نظروں سے نہیں دیکھ رہے تھے جیسے انہیں معلوم نہ ہو کہ ہم پاکستانی ہیں مسلمان ہیں۔

کیسے ہندو

ہماری انہیں پتہ تھا کہ ہم نوادرو ہیں، پاکستانی ہیں، مسلمان ہیں۔ اتارا لباس انداز، طور طریقہ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ ہم ان میں سے نہیں۔ پھر بھی نہ تو ان کے چہروں پر محنت تھی نہ تعجب تھا نہ محبت تھی۔ وہ ہمیں کوئی اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ یوں جیسے ہم انہیں میں سے ہوں۔ ان کے برتاؤ میں بڑی رواداری تھی۔

میں حیرت میں گم تھا۔ بالکل یہ کیا سید ہے۔ یہ لوگ ہندو معلوم نہیں پڑتے۔ وہ ہندو جس سے میں واقف تھا جس کے ساتھ میں نے زندگی کے ۳۲ سال گزارے تھے۔ وہ ہندو ایسا تو نہ تھا۔ اس میں افترقی و تفریق تھی۔ امتیازات تھے۔ وہ مسلمان کے قرب کو محسوس کر کے ان جانے میں سٹ جاتا تھا۔ بھرٹ ہو جانے کا خطرہ ابھرتا تو وہ سستا۔ جوں جوں سستا توں توں اس کے ہونٹوں پر مجھ بھرے کلمات کھینچتے۔ جی مڈل ایج جی مڈل ایج۔ جوں جوں وہ اپنی پوترا کو سنبھالنے کی کوشش کرتا توں توں زبان کے الفاظ بیٹھے ہوتے جاتے اور بیٹھے اور بیٹھے۔

یہ کیسے ہندو ہیں جنہیں نہ بھرٹ ہونے کا خطرہ لگا ہے نہ اپنی پوترا کو محفوظ کرنے کا دھیان ہے۔ افترقی و تفریق کا احساس نہیں۔ امتیاز کا علم نہیں جو مجھے مسلمان اور پاکستانی جانتے ہوئے بھی پیچھے نہیں چھوٹے۔ فاصلہ قائم نہیں کرتے۔ گمن نہیں کھاتے۔

نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہند میں گزشتہ تینتیس سالوں میں ہزار ہا کیوں قتل فسادات کیوں ہوئے ہیں۔ آج بھی ہو رہے ہیں۔ کیوں۔ یہ لوگ جو بس میں

میرے پاس کھڑے ہیں۔ ان کے دلوں میں عناد نہیں، بغض نہیں۔ انفریق و تفریق نہیں بلکہ ایک اپنائیت ہے۔ یہ تو ہمیں اپنوں میں سے سمجھ رہے ہیں۔ بھروسا دات کیوں۔
دفعتاً میری پنڈلی پر ایک نرم و ملائم سا لمس محسوس ہوا۔ میرا رواں رواں دل گیا۔

لمس کا ڈنک

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میری زندگی کی سب سے بڑی عشرت لمس ہے۔ میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ لمس ہے۔

یوں لگتا ہے کہ جب میری تخلیق ہو رہی تھی اور خواص خصبہ میں جس کی پائنت کی جا رہی تھی تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ کچھ ایسا ہوا کہ گنڈ ہو گیا۔ سننے، دیکھنے، سو گھسنے اور بھکسنے کے جسے گنڈ ہو کر لمس میں جا شامل ہوئے۔ یوں میری قوت لمس تلواری و حار بن گئی اور زندگی بھر مجھے یوں کافی چھیلی رہی جیسے پھل فروش گنڈ بریاں کاٹنا چھیلتا ہے۔

پنڈلی پر وہ لمس مجھے یوں لگا جیسے بجز نے ڈنک مارا ہو۔ بیک وقت تکلیف دہ اور لذیذ۔ میں تپ کر مڑا۔ دیکھا تو ایک لڑکی کی پنڈلی میری پنڈلی سے ٹکرا رہی ہے۔ میں نے لمس کو گہرا کرنے کے لئے اپنی پنڈلی اور قریب کر دی۔ اور قریب اور قریب۔

پھر میں نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا اسے اس لمس کا شعور ہو گا۔ وہ میری طرف دیکھ کر آنکھ مڑے گی۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ لیکن اسے تو پتہ ہی نہ تھا۔ خیر نہ تھی۔ اسے لمس کا شعور ہی نہ تھا۔ پھر بھیڑ اور بوجھ گئی اور میرے دائیں ہاتھ پر دست سی لڑکیاں آکھڑی ہوئیں۔

پھر میری گردن پر ایک اور ڈنک لگا۔ کسی کا نرم نرم سا عضو میری گردن پر ٹکا تھا۔ ٹکا رہا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے گردن کا سارا دینے رکھا۔ دینے رکھا۔

پھر دفعتاً مجھے شعور ہوا کہ سارا دینا بے فکر ہے۔ اسے علم ہی نہیں کہ سارا دیا جا رہا ہے۔ یا اللہ اتنی بے نیازی۔ کیا ہند کی عورت میں حس نہیں رہی۔ ہمارے ہاں تو حس کے فولے چلتے ہیں۔ حتیٰ کہ دور کھڑے راہ گیر بھی پھوار سے بھیگ جاتے ہیں۔

اشفاق حسین نے مجھے کئی ماری۔ بولا۔ ”یار یہ کیسی لڑکیاں ہیں۔“

”کیسی ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”بے نیاز بے خبر۔ کچھ پتہ ہی نہیں۔“

”یہ تو بڑی خوبی ہے۔“ میں نے کہا۔

”خوبی تو ہے پر اپنا تو کبلاہ ہو گیا۔ ارے۔۔۔۔۔ وہ چلا یا۔“

”یہ دیکھ رہے ہو تم۔“

”کیا۔۔۔؟“

”یہ ہماری سیٹ کی کھڑکی کے اوپر ہندی میں کچھ لکھا ہے۔“

”ہاں لکھا تو ہے۔“

”شاید یہ زنانہ سیٹ ہو۔“

”ہر سکتا ہے۔“

اشفاق حسین اٹھ بیٹھا۔ پاس کھڑی لڑکیوں سے کہنے لگا یہ زنانہ سیٹ ہے کیا۔

لڑکیوں نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

”ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ان چلتے میں آپ کی سیٹ پر بیٹھے رہے۔ ہم ہندی

نہیں پڑھ سکتے۔ آئیے تشریف رکھئے۔ ہم معلیٰ چاہتے ہیں۔“ اشفاق حسین نے کہا۔

ہم دونوں اٹھ بیٹھے۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں بھنس کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے

چاروں طرف سے نرم دھڑک لمس نے گھیر لیا۔ حتیٰ کہ میرا سدا جسم سیال بن گیا۔ اس میں

سے چھیننے اڑنے لگے لیکن گرد و پیش میں کسی کو خبر ہی نہ تھی۔

مستور جنگ پر ہم نے بس بدل لی اور مردولی کی طرف چل پڑے۔ اس بس کی

سواروں کا بھی وہی عالم تھا۔ وہی بے نیازی بے خبری۔

لڑکوں کو خبر نہ تھی کہ وہ لڑکے ہیں۔ لڑکیوں کو خبر نہ تھی کہ وہ لڑکیاں ہیں۔

مسافروں کو خبر نہ تھی کہ وہ ہندو ہیں۔ ہم مسلمان ہیں پاکستانی ہیں۔

کنڈکٹرز اسی طرح کچھلی سیٹ میں چاقو بنا پڑا تھا۔ سواریاں خود جا کر نکلت طلب

کرتیں۔ کوئی چیکر نہ تھا۔

پھر وہ بس ایک گول سے دائرے میں جا کر رک گئی۔ یہ ٹریٹل شیشن تھا۔

قطب صاحب

پتہ نہیں قطب صاحب کی خدمت میں حاضری دینے کو میں اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا۔ سیراجی چلہ رہا تھا کہ رک جاؤں۔ خود کو کسی دھکی میں ڈال دوں۔ جہاں میری روح کا بند بندہ جھکا جائے میرے قلب کا کثیف لوگوڑوں رواں رواں ہو کر لطیف ہو جائے۔ میرے دل، روح اور ذہن کی آلائشیں صاف ہو جائیں۔ ایک معمولی سے وقت کے لئے ہی سہی۔ کچھ دیر کے لئے۔ کچھ لمحات کے لئے جتنی دیر میں حضرت کے سامنے کھڑا رہوں۔ یا اللہ مجھے کچھ دیر کے لئے پاکیزگی عطا کر دے کہ حضرت کے رو برو کھڑا ہونے کے لائق بن جاؤں۔

پتہ نہیں میری یہ کیفیت کیوں تھی۔

شاید اس لئے کہ شلہ بابا کی عقیدت کو دیکھ کر میں اتنا متاثر ہوا کہ اسلام آباد پہنچ کر میں نے حضرت بختیارد کلکی کی سوانح کا بڑے اہتمام سے مطالعہ کیا تھا اور ان کے کردار اور مشق سے بے حد متاثر ہوا تھا۔

حضرت بختیارد کلکی کی تمام تر زندگی مشق الہی کے عہد کے لوگوں دھکھو سنی تھی۔

کاش کہ میں آپ کی سوانح کا مطالعہ نہ کرتا۔ نہ کرتا تو آپ کی خدمت میں حاضری کے خیال پر یوں غور نہ کرتا۔

بسپ میں نے قطب صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں تو حیران رہ گیا تھا۔ اسنے بڑے، اسنے جمالی پھر بھی میں ان جان رہا۔

ہند کے صوفیائے کرام کی کئی ایک لڑیاں ہیں۔ سب سے زیادہ جلتی پہچانی لڑی داتا کی ہے۔ اس لڑی میں پانچ موتی ہیں۔ قلب صاحب اس لڑی کے تیسرے موتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی حیثیت مرکزی ہو جاتی ہے۔ دوا دھر دوا دھر۔ سبحان اللہ کیا حیثیت ہے۔

صوفیائے کرام کے درجہات کو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان سب شعاعوں کا منبع حضورؐ کی ذات ہے، اور یہ پچھنیں رنگ رنگ میں جلتی ہیں۔ ایک کارنگ دوسرے سے نہیں ملتا۔ منزل سب کی ایک ہے رنگ ہدا ہدا ہیں۔ کوئی باروق راستے سے سفر کرتے ہیں، کوئی لق و وق دیرانے سے۔ ان کا مقابلہ یا موازنہ کوئی جانتے دلا کرے تو کرے مجھ ایسا انہیں تو صرف احرام میں سر جھکانا ہی جانتا ہے۔

اس لڑی میں پہلا موتی داتا ہیں، دوسرا خواجہ غریب نواز، تیسرا قلب صاحب، چوتھا بابا فرید اور پانچواں محبوب الہی۔ کتنی جلتی پہچانی روشن تابندہ لڑی ہے۔ صدیاں بیت گئیں لیکن ان کی تابندگی میں فرق نہیں آیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے زمان و مکان دونوں کو منسوخ کر کے رکھ دیا ہے۔

حضرت مختیار کلکی کی عوام میں مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جہاں سے گزرتے لوگ فردا محبت یا احرام سے خاک اٹھا کر آنکھوں سے لگا لیتے۔ پتہ نہیں یہ ان کے کروڑوں کا بجز تھا۔ یا ان کی اللہ واسطے کی محبت کی مناسبت تھی کہ ولی کے لوگ کھینوں کی طرح اس گزری سیلی پر منتظا تھے۔ عام طور پر احرام ایک دیوار کی مصداق ہوتا ہے جو احرام کرنے والے اور محترم کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے۔ جس کا احرام کرو اس سے کچھ کچھ ڈر آئے لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ناگوار خاطر ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ہار خاطر ہو۔

پتہ نہیں یہ صوفیائے کرام کیسے جاوے کہ ہیں کہ لوگ بیک وقت پیار بھی کرتے ہیں ساتھ احرام بھی کرتے ہیں۔ احرام پیار میں جھل نہیں ہوتا۔ پیار احرام میں گل نہیں ہوتا۔

دلی کے تمام لوگ قطب صاحب کی محبت میں گویا پاگل ہو رہے تھے۔ کیا عوام کیا امراء کیا بادشاہ۔ البتہ دلی کے شیخ الاسلام کو شکایت تھی کہ بھی قطب صاحب کے دیوانے ہیں انہیں کوئی نہیں پہچانتا۔ ایک مرتبہ خواجہ غریب نواز دلی آئے تو شیخ الاسلام نے ان کی خدمت میں شکایت کی۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ اچھا فکر نہ کرو ہم قطب کو اپنے ساتھ اجیر لے جائیں گے۔ جب آپ قطب صاحب کو لے کر اجیر کو روانہ ہوئے تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ساری دلی میں پھیل گئی۔ لوگ دیوانہ وار اٹھ بھاگے۔

خواجہ غریب نوازی خدمت میں پہنچ کر آہ دہکار کرنے لگے۔ عالی جاہ جو حضرت دلی سے چلے گئے تو ہلکا کیا ہو گا۔ شروریران ہو جائے گا۔ لوگ جہنم ہو جائیں گے۔ باقی کیا رہ جائے گا۔ بجڑو رہی، برہادی، محرومی۔

لوگ خواجہ غریب نواز کو قدم قدم پر روکتے۔ عالی جاہ یہ ظلم نہ کیجئے ہم پر ترس کھائیے۔

جب شاہ احسن کو پتہ چلا تو وہ بھی اٹھ دوڑا۔ خواجہ غریب نوازی غصے سے لگا۔ حضرت انہیں نہ لے جائیے۔

خواجہ غریب نواز کے لئے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔ فرمایا "قطب تم واپس چلو۔ قسدا یہی مقام قیام ہے۔ ہم نے دلی کو قسدا ہی پناہ میں دیا۔"

یا اللہ میرا یہ بندہ کیا شے ہو گا جس کے جانے سے ایک ہزار ستا ہشتا شروریران ہو جاتا ہے جس کے لئے لوگ آہ وزاری کرتے نہیں جھکتے ہیں۔

صاحبو! عوام تو بڑے کھٹے ہیں شکوہ شکایت ان کا شیوہ ہوتا ہے۔ بے شک وہ محبت کرتے ہیں لیکن ان کے جذبے میں قیام نہیں ہوتا۔ وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا رہتا ہے۔

پتہ نہیں قطب صاحب میں وہ کیا جادو تھا کہ وہ ہر خاص و عام کے محبوب تھے۔ محبوب رہے۔

سب سے بڑا معجزہ

میں نے تو زندگی بھر یہی دیکھا ہے کہ دنیا کو خوش کرو تو اللہ کی خوشنودی حاصل

کرنے کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ اللہ کی خوشنودی کی طرف توجہ کرو تو دنیا باریک بینی سے دیکھی جائے گی۔ پتہ نہیں حضرت قطب صاحب کے پاس کیا ظلم اعظم تھا کہ اوجہ عوام کو اپنا دیوانہ بنا رکھا تھا، اوجہ اللہ سے لو لگا رکھی تھی۔

استغفر اللہ کا یہ عالم تھا۔ کہ فرزند فوت ہو گیا مگر آپ کو خبر ہی نہ ہوئی۔ گھر میں فالتے پر فالتے آ رہا تھا۔ آپ کو پتہ ہی نہ تھا۔ ایک روز اپنے آپ میں آئے تو بیوی نے صورت حال بیان کی۔ بولیں۔ ”پہلے پڑوسن سے قرض پر آٹا ملگ لیا کرتی تھی۔ اب وہ بھی طعنے دینے لگی۔“ آپ نے فرمایا۔ ”اب اس سے قرض نہ مانگنا جب روٹی کی ضرورت پڑے تو ہم اللہ پڑھ کر اس طاق میں ہاتھ ڈال کر حسب ضرورت کاک نکال لیا کرتا“ اسی وجہ سے آپ کا نام حضرت قطب الدین اوشی کی جگہ ”کلی“ مشہور ہو گیا۔ یا اللہ یہ لکھ لکھی کیسی دنیا ہے اور تھرے یہ بندے کیسے بندے ہیں۔ دنیا ٹھوکر میں دھری ہے لیکن فالتے آتے ہیں بیٹائی پر مل نہیں آتے۔ قطب صاحب کی زندگی سے متعلقہ کوائف پڑھ کر میں تو حیرت سے کم صم رہ گیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں کرامات مجھ پر اثر نہیں رکھتے۔ میں مافوق الفطرت کھانا سوں پر مصور نہیں ہوا۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کرامات دکھانا ڈکڑی بھانے کے حرافہ ہو۔ میرے نزدیک سب سے بڑی کرامت کردار کا مجھوہ ہے۔ میرے لئے سب سے عظیم مجھوہ حضورؐ کا کردار تھا۔ ایک مسلسل مجھوہ۔ حضورؐ کا تو خود ہی ایک مجھوہ تھا۔

صوفیائے کرام کی کرامت بھی ان کے کردار کی عظمت ہے۔ جناب قطب صاحب کے کردار کی عظمت کے رویہ و کھڑا ہو کر میں کانپتا رہا۔ تھر تھر کانپتا رہا۔ پتہ نہیں یہ محبت کی کھلی تھی یا احساس عظمت کی۔ اور پھر میں۔۔۔ میں جو ایک کثیف روح ہوں۔ غلیظ۔ آلودہ جس کا ریپور کنڈ ہے۔ گرد آلود ہے۔ جو اللہ کے بندوں کی عظمت کا احاطہ نہیں کر سکا۔ بے جان۔ مردہ۔

ایک بار قطب صاحب کی توجہ بھنگی بھی۔ وہ یوں کہ: جوانی میں ہی جب آپ بغداد کے نزدیک قصبہ اوشی میں رہتے تھے۔ آپ حضور صلعم سے لو لگائے بیٹھے تھے۔ معمول تھا کہ روز تین ہزار مرتبہ درود بھیجتے۔

پھر والدہ نے شادی کر دی۔ منکوحہ حسین جمیل تھی۔ توجہ اس پر مرکوز ہو گئی۔

وہیں اوش میں آپ کا ایک مرید احمد نامی رہتا تھا۔ ٹیک آدی تھا۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک حائل شان محل ہے جس کے باہر بہت سے لوگ کھڑے ہیں اور ایک پست قد آدی ہار ہار محل کے اندر جاتا ہے اور باہر آتا ہے۔ پوچھا کہ یہ محل کس کا ہے اور یہ اندر باہر جانے آنے والا کون شخص ہے۔ کسی نے بتایا کہ یہ حضور صلح کا محل ہے اور یہ پست قد آدی سانکوں کے سوال لے کر اندر جاتا ہے اور جواب لاتا ہے۔

احمد نے پست قد سے کہا جناب میں حضورؐ کی زیارت کا متعلق ہوں۔ پست قد اندر گیا۔ جواب لایا۔ بولا اے احمد حضورؐ فرماتے ہیں ابھی تو زیارت کا اہل نہیں۔ الہت گاؤں واپس جائے تو قلعہ سے کتنا حضورؐ نے سلام بھیجا ہے فرماتے ہیں کیا وجہ ہے کہ وہ تحفہ جو تو ہمیں روز بروز بھیجا کرتا تھا تین دن سے موصول نہیں ہوا۔ قلعہ صاحب نے جب یہ سنا تو تادم ہوئے اور منکوحہ کو حلاق دے دی۔

تھر تھر کانپ

ایک روز میں اور اشفاق احمد ٹیلے ٹیلے لارنس بارغ جا پہنچے۔ صبح کا وقت تھا۔ سماں بڑا پیارا تھا۔ ایک شہج پر بیٹھ گئے۔ اسٹے میں وہاں ایک جمدار آٹلا۔

اشفاق نے کہا ”جمدار جی آپ سڑک صاف کریں پلاٹ پر جھاڑو دینے کا کیا ٹائمہ؟“

جمدار بولا۔ ”جناب میرا کام جھاڑو دینا ہے۔ چاہے سڑک ہو یا پلاٹ ہو یا مکان“

اشفاق احمد بولا۔ ”کیمٹی کے ہو“

”جی نہیں۔“ جمدار نے کہا۔

”تو پھر کس کے ہو“ اشفاق احمد نے پوچھا۔

جمدار بولا۔ ”جناب اپنے مرشد کا ہوں“

”ہم دونوں چمکے۔“

”جناب“ وہ بولا۔ ”میں جعدار نہیں ہوں“

”پھر جھاڑو کیوں لگاتے ہو؟“

”مرشد کا حکم ہے۔ اس لئے۔ پہلے حکم ہوا کہ چھ سال جھاڑو لگاؤ۔ چار سال

لگایا۔ پھر بد قسمتی سے ایک بھول ہو گئی۔“

”کیسی بھول؟“ اشفاق احمد نے پوچھا۔

وجود کی غلطی

”بس جی“ وہ بولا۔ ”بندہ بشر ہے بھول چوک ہو جاتی ہے“

”پھر“ میں نے پوچھا۔

”پھر“ وہ بولا۔ ”حکم ہوا کہ پھر سے چھ سال جھاڑو لگاؤ۔ اب غلطی ہوئی تو

خارج کر دیئے جڑ گئے۔ اب جناب یہ حال ہے کہ ڈرتا ہوں۔ قمر قمر کانپتا ہوں کہ پھر

بھول نہ ہو جائے۔ دعائیں مانگتا ہوں اسے بچانے والے تو ہی بچائے گا تو بچوں گا۔ میں تو

بندہ بشر ہوں تو ہی لالچ رکھے گا تو رہے گی“

اتنی اونچی منزل

”بڑی مشکل منزل ہے“ اشفاق احمد بولا۔

”کیا کر رہی جی“ وہ آہ بھر کر بولا۔ ”ہمارے بزرگ منزل کو اتنا اونچا لے گئے ہیں

کہ مجھ سا بندہ بشر دیکھ کر قمر قمر کانپتا ہے۔ سو پاؤں جی اپنا کام جھاڑو لگاتا ہے۔ جھاڑو لگاتا

ہوں۔ ڈرتا ہوں، قمر قمر کانپتا ہوں۔“

میرا جی چاہتا تھا۔ کہ اس جعدار کے دوہرا ادب کھڑا ہو جڑوں، اسے ایک فنی

سلوٹ بلوں اور گھول بھان لٹھ میں تیرے جھاڑو لگانے پر قربان ہو جاؤں۔ یا اٹھ مجھے

بھی فنی عطا فرما کہ میں بھی جھاڑو لگاؤں، ڈروں، قمر قمر کانپوں۔

میرے ایک کرم فرما بھی گزشتہ دو سال سے قمر قمر کانپنے کے عالم میں ہیں۔ ان کے

کانپنے کی نوعیت کچھ مختلف ہے۔ وہ کوسے میں رہتے ہیں۔ نام ڈار ہے۔ محشر کھروپ

دھارے پیٹے ہیں۔ دونوں کو سکھر کے ہانے پچھلے مہدوب بزرگ جناب قاضی صاحب

سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ ملنے ملانے لگے۔ لگاؤ محبت میں بدل گیا۔ قاضی صاحب مریدان ہوئے اور وقت رخصت اپنی گھڑی محضر صاحب کے سر پر دھر گئے۔ بوجھ سخت بھاری تھا۔ محضر ساکیت کو ہاتھ سے جانے دینا نہ چاہتے تھے۔ ہاتھیں لڑکھڑاتے لگیں۔ لڑکھڑاتے رہے۔ لڑکھڑا رہے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ جو گرا تو ڈمیر ہو جاؤں گا۔ پھر اپنی سادھ بدھ نہ رہے گی۔ ابھی تک لڑکھڑا رہے ہیں۔ لڑکھڑاتے ہیں۔ ڈرتے ہیں۔ قہر قہر کا پتے ہیں۔ اے قیام بخشے والے تو ہی سداوے گا تو قائم رہ سکوں گا۔

سچ ہے ہمارے بڑے عشق کی منزل کو اس قدر اونچا لے گئے ہیں کہ شاید وہاں فرشتوں کے بھی پہ چلتے ہوں۔

اشفاق حسین اور میں دونوں چپ چاپ بسوں کے اڑے سے حزر مبارک کی طرف چلے جا رہے تھے۔ مرزا مبارک اڑے سے دور نہ تھا۔ لیکن قاصدے فرلانگوں میں ٹاپے نہیں جلتے۔ جذبات سے ٹاپے جاکیں تو اشفاق حسین اور میں ساٹھا ساٹھ چلتے رہے چلتے رہے۔ میں حضرت کی سوانح کا اوسر نو نگارہ کرتا رہا کرتا رہا۔ ان کے عشق کی عظمت کو بند بندہ میں محسوس کرتا رہا۔

دفعتاً اشفاق حسین رک گیا اور میری طرف مسکرا کر دیکھنے لگا۔

بچتے بڑے اتنے قریب

ہمارے سامنے ایک بہت بڑا دروازہ تھا جس پر جلی حروف میں قطب الاقطاب لکھا ہوا تھا۔ اشفاق حسین اس جلی تحریر کو دیکھ کر اور بھی سہم گیا۔ بولا۔ ”یہ یہ تو بہت بڑی در کھ محسوس ہوتی ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بہت بڑی۔“

”ایک بات بتا۔ بتائے گا۔“ اس نے پوچھا۔

”پوچھ۔“

”مجھے ایسے لگتا ہے۔“ وہ بولا۔ ”جیسے ہر عملیت کی ایک روح ہوتی ہے۔ کچھ عملتیں پیار سے ہلاتی ہیں۔ آ جائند آ جا۔ کچھ دیر آرام کر لے۔ کچھ مانتے پر تجوری چڑھا لیتی ہیں اونٹوں۔ اندر نہ آتا۔ کچھ ایسی ہیں جو ذرا سی دھمکتی ہیں۔ خبردار اس طرف کا رخ

نہ کرتا۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم مانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"مانتا ہوں۔"

"دانا کے دربار میں جاؤ تو ایسے لگتا ہے جیسے دل سے بوجھ اتر گیا ہو۔ وزن کم ہو گیا ہو۔ ایک لطافت ہی چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے۔ اگر بھر مکی صاحب کے حزار پر جاؤ تو خوف سا طاری ہو جاتا ہے۔ دم رکھتا ہے۔ دل پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "جمال اور جلال میں یہی فرق ہے۔ یہ جتنا کہ یہاں کیا ہوتا ہے۔"

"یہاں۔" وہ بولا۔ اور پھر اس لمبی گلی کو دیکھنے لگا جو دروازے سے دور تک چلی گئی تھی "دیکھ لو۔" وہ بولا۔ "اسنے بڑے ہیں پر اسنے قریب محسوس ہوتے ہیں۔"

"یہ کیسے؟" اشتقاق حسین نے کہا۔ "میں تو یہ جانتا ہوں کہ جتنے بڑے اسنے دور۔"

"ہاں۔" میں نے کہا "وہ دنیا والے ہوتے ہیں۔ یہ اللہ والے جتنے بڑے اسنے قریب۔"

ہم اس لمبی راہداری میں داخل ہو گئے۔

"اتنی لمبی گلی ہے۔" میں نے کہا۔

"گلی نہیں۔" اشتقاق حسین نے کہا۔ "راہداری ہے۔ یہ حزار کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ ارد گرد کے گھر وندے بعد میں بنے ہوں گے۔"

اس راہداری میں چار ایک میٹھے پنخے تھے۔ وہ میٹھے عجیب قسم کے میٹھے تھے۔ میٹھے نظر نہیں آتے تھے لیکن تھے میٹھے۔ اپناج نظر نہیں آتے تھے لیکن لگتا تھا جیسے ہوں۔ ان سب کے ارد گرد جیسے کثافت کے دائرے بچھنے ہوئے تھے۔

وہ میٹھے حزار مہلک کی فضا سے ہم آہنگ نہ تھے یوں جیسے پھولوں کی فضا میں گانٹے لگے ہوئے ہوں۔ جیسے ٹھل میں ٹاٹ کے بچہ نہ ہوں۔

اس وقت میں نے محسوس کیا جیسے میں لوہا دیکھ رہا ہوں۔ اور اروج کی شعاعیں ہوتی

ہیں جو انسان کے جسم خصوصاً سر کے گرد ہویا ہوتی ہیں۔ جو عام انسان کو دکھائی نہیں دیتیں بلکہ برگزیدہ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔
 ان مخلوقوں کو دیکھ کر میرے دل میں کراہت سی پیدا ہوئی اور مجھے وہ شام یاد آ گئی۔

اس شام میں اسلام آباد کے ایک چنگے کے پلاٹ میں چند بڑے امیروں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھنے کی میری کوئی حیثیت نہ تھی۔ اتفاق سے وہاں چلا گیا تھا۔ اہل بکھر باقیں کر رہے تھے میں خاموش تھا۔ اسے میں ایک نوجوان بھکاری آگیا۔ اس نے لوگوں کو باہر بیٹھے ہوئے دیکھا تو دست سوال دروازہ کر دیا۔

اس پر ایک صاحب بولے۔ ”میاں ہٹا کٹا ہو کر مانگتا ہے۔“
 دوسرے نے کہا۔ ”محنت مزدوری کیوں نہیں کرتا؟“
 تیسرا بولا۔ ”تو اس لائق نہیں کہ تجھے کچھ دیا جائے۔“

اس پر صاحب خانہ بولے۔ ”کہا ہم سب اس لائق ہیں کہ ہمیں یہ سب کچھ ملے جو ہمیں مل رہا ہے۔“

صاحب خانہ کا وہ جملہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ جب بھی میں کسی کو چاہتے لگتا ہوں تو میرے دل میں سے وہی آواز ابھرتی ہے، کیا میں اس شخص سے بہتر ہوں۔ خود کو بہتر سمجھتا ہوں کیا۔

”معافی چاہتا ہوں علی چاہ کہ آپ کے در پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کراہت محسوس کر رہا ہوں میرے در کے حوالے سے میں دیکھ رہا۔“ میں نے قطب صاحب سے عزامت کا اعلان کیا۔ پھر مجھے حضرت کی وہ بات یاد آ گئی۔

شاہ ہند اہلش آپ کی خدمت میں حاضری دینے کا اشتیاق رکھتا تھا جب بھی اجازت مانگتا آپ منع کر دیتے۔

ایک بار شیخ الاسلام کے بچوں کی حق تلفی دور کرانے کے لئے خود اہلش کے دربار میں جانے پر مجبور ہو گئے۔ بادشاہ انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ حیرت اور مسرت سے اوسان خطا ہو گئے۔ تعلیم کے لئے پادوب انھیں کھڑا ہوا۔

اس وقت دربار میں اودھ کا حاکم رکن الدین حلوانی بیٹھا ہوا تھا۔ حلوانی کی نشست

حضرت سے اونچی تھی۔ احتش کو یہ بات سخت ناگوار گزر۔ نہ گئی۔

حضرت سمجھ گئے۔ بولے۔ "آزاد نہ ہوں۔ جب طوطہ اور کاک (روٹی) اگئے موجود ہو تو طوطہ کاک کے اوپر ہوتا ہے۔"

حضرت خود کو کسی سے برتر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک میں ہوں کہ ان کے در پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو خود سے کم تر محسوس کر رہا ہوں۔

اس خیال پر میں پھر سے قہر قہر کا بچہ لگا۔ کس منہ سے میں حضرت کے سامنے جاؤں گا۔ کیا میں اس لائق ہوں کہ آپ کی خدمت میں شہ بابا کا پیغام لے کر جاؤں۔
راہداری ایکدم دائیں جانب مڑی۔

ودنا خوشبو کا ایک جھوٹا آیا۔ فضا لطافت سے بھر گئی۔ میرے سامنے
گویا پہلوں کا ایک تختہ پھیلا ہوا تھا۔
سامنے مزار مقدس تھا۔

زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں گویا کائنات کی وسعت تھی۔ وسعت
الطاف اور سکون ہی سکون۔ مہل سکون کے ہوں ڈھیر لگے ہوئے تھے جیسے گلابوں کے باغ
میں فرحت کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں۔ ایک فکارتھی۔ ایک غنائت تھی۔ یوں لگتا تھا
جیسے یہاں آکر سب کچھ پالیا ہو۔ کوئی مشکل نہ رہی ہو کوئی حسرت نہ رہی ہو۔ آزاد نہ رہی
ہو۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ٹکڑا زمین کسی اور دنیا کا ہو۔ وہ فضا کسی اور ہی رنگ کی
ہو۔

۱۷۹

اگرچہ وہاں چند ایک لوگ موجود تھے لیکن مجھے ایسے لگا جیسے حضرت کے سوا وہاں
کوئی دو جان نہ ہو۔ حضرت بیٹھے مسکرا رہے ہوں اور ارد گرد فرحت ہی فرحت منظر رہی
۱۸۰

شہ بابا کا پیغام پیش کرنے کے لئے میں ایک کونے میں سٹ کر کھڑا ہو گیا۔
وہاں کوئی کرخت آواز نہ تھی۔ کوئی عظیم دعا نہ تھی۔ کوئی بھیڑ نہ تھی۔ کوئی ہنگ
نہ تھی۔ ہمکنار سہمیٹا۔ ایسی حیرت خاں غاموشی جو پہلوں کی سیرابی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔
میراجی چلا رہا تھا کہ حضرت کے رویہ آنکھیں بند کر کے معدوم ہو جاؤں لیکن جو فنی میں
نے آنکھیں بند کیں میرے سامنے عشق کا ایک دریا موجزن ہو گیا۔ ساری کائنات پر مد

جزر کا دھڑا چلنے لگا۔

یا اللہ یہ کیا بھید ہے کہ تھرا یہ پردانہ ہو زندگی بھر تیرے عشق میں ہر لمحہ مرنا اور ہر لمحہ زندہ ہونا رہا اور پھر اسی مرن بھیں کی ترپ میں اس جہان سے رخصت ہو گیا۔ اس کے مزار مبارک پر سکون غیسے گلڑے ہوئے ہے۔ یہ کیا بھید ہے۔
حضرت محفل سماع میں بیٹھے تھے کہ قوالوں نے ایک شعر گایا۔

کشیجھن منجھر حلیم را
ہر زلی از فیب جان دیگر است

اپنے قلب کی کیفیت کا نقشہ لفظوں میں کھنچا دیکھا تو حال کی کیفیت پیدا ہوئی۔ وہ جان ہوا۔ لڑخورد رفتہ ہو گئے۔ لوگ اسی کیفیت میں اٹھا کر گھر لے آئے۔

ہوش میں آئے تو قوالوں کو طلب کیا۔ فرمایا اسی ایک شعری تکرار کرتے رہو۔ پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی۔ تین دن مسلسل اسی مرن بھیں کی ترپ میں چلا رہے۔ چوتھے روز حالت غیر ہو گئی۔

حکیم نے نبض دیکھی۔ بولا۔ ”جگر پانی ہو کر بہ گیا ہے۔“

اس کشیہ منجھر حلیم کا صرف جگر ہی نہیں سارے اعضائے رکبہ پانی ہو چکے تھے۔
صرف ایک طلب کی حدت سے یہ دیا جا رہا تھا۔

کہتے ہیں حضرت کی وصیت تھی کہ میری نماز جنازہ کی امامت وہ کرے جس نے کبھی نماز قضا کی ہو۔ ہر جماعت میں تکبیر لوٹی کے ساتھ شرکت کی ہو۔ اور کبھی تہجد میں نافذ نہ کیا ہو۔

مجمع میں بڑے بڑے درویش موجود تھے۔ کوئی امامت کے لئے آگے نہ بڑھا۔ کبھی ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ آخر بادشاہ جس الدین اقتش افشا۔ آگے بڑھا۔ اور امامت کا فرض ادا کرنے سے پہلے بولا۔ ”حضرت نے آج مجھے نکال کر دیا۔“

پھر پتہ نہیں کیا ہوا جیسے وقتاً میری آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا۔ جیسے ہمیدہ کھل گیا اور میں معدوم ہو گیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر تک حضرت کے حضور کونے میں کھڑا معدوم رہا۔

دنیا ٹاپید ہو گئی۔ زمین، آسمان، ہوا، فضا سب ختم ہو گئے۔ کائنات معدوم ہو

گئی۔ صرف حضرت مرقہ پر تشریف فرما تھے۔ آپ کے وجود سے بحود سے بھی روشنی چلاؤں طرف نکل رہی تھی اور ایک معدوم شدہ مداح حواس کم، قیاس کم، کونے میں لگا کھڑا تھا۔

جب ہم سکاؤٹ کیمپ میں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ صدر دروازے کے پہلو میں تھڑے پر سیکورٹی والے جوں کے توں بیٹھے تھے۔
یا اللہ کیا یہ لوگ کوسے کے بنے ہوئے ہیں جو صبح سے اب تک جوں کے توں بیٹھے ہیں۔ چاقو، چوبند، مستند، پیدار۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے سامنے فائلیں نہ تھیں، رجسٹر نہ تھے۔ وہ چٹھ نہیں رہے تھے، لکھ نہیں رہے تھے۔ جہانیاں نہیں لے رہے تھے۔ بس بیٹھے تھے۔ لیزی نہیں۔ مستند۔ ڈھیلے نہیں چاقو، چوبند۔ جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔
یا اللہ یہ لوگ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ کچھ کر رہے ہوں تو بیٹھے رہنا ممکن ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی نہیں کر رہے پھر بھی بیٹھے ہیں۔ نہ جھکتے ہیں نہ آگاتے ہیں۔
پانچ روزہ ہم دلی میں سکاؤٹ کیمپ میں مقیم رہے۔ اور صبح شام انہیں دیکھتے رہے۔ پانچ روزہ وہ جوں کے توں بیٹھے رہے۔

صبح سویرے جب ہم جاگتے تو انہیں بیٹھے ہوئے پاتے۔ رات کو سونے لگتے تو بھی وہ بیٹھے ہوتے۔ ان کے انداز میں نہ تو پولیس کی رعوت تھی۔ نہ انسر شہی کی نہیں تھی۔ ان کے کان کھڑے رہتے۔ نگاہیں جھکی رہتیں۔ ہر آنے جانے والے کو دیکھتے لیکن سر اٹھا کر نہیں، جھکی جھکی نظروں سے ہوں دیکھتے کہ کسی کو پتہ نہ چلتا کہ دیکھ رہے ہیں۔ ہر آہٹ پر کان رکھتے لیکن ہوں جیسے بالکل نہ سن رہے ہوں۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے نہ جاننے کیوں مجھے ان پر ترس آتا۔ دل میں ہمدردی کی ایک روانہ تھی۔ جی چاہتا کہ باری باری ہر ایک کو گنگے سے لگاؤں اور پھر رو دوں۔

کیمپ کے ہال کے بٹنی کمرے میں پولیس کی ایک چوکی ڈیوٹی پر تھی۔ کل چھ سات سپاہی تھے جو دیکھنے میں سپاہی نظر نہیں آتے تھے۔ نہ ہی ان کا انداز توجہ طلب تھا۔ نہ آواز میں کشاکش تھی۔ پچھلے چپ باہر میدان میں چل پانیوں پر بیٹھے رہتے۔ کوئی غور سے ان کی طرف دیکھتا تو نظریں جھکا لیتے۔

پہلے دو ایک دن تو یہ پولیس چکی گم سم ٹٹھی رہی پھر آہستہ آہستہ ان میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ مسکراتے لگے۔ پھر مدھم مدھم آواز میں باتیں کرنے لگے۔ جی صدا، جی صدا اور آخری دنوں میں خاصے گمل مل گئے۔ ایک ایسے ہل کمرے میں سو با جس میں اسی بچاسی چار پائیاں چھٹی ہوں میرا زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔

اشفاق حسین اس بھیڑی وجہ سے خالص پریشان تھا۔ اس کی مشکل یہ تھی کہ لمبی بیماری کی وجہ سے اسے نیند نہیں آتی تھی۔ رات کے ایکے بجے تک کروٹیں بدلتا رہتا یا بھگ آ کر کسی کتاب کا مطالعہ کرنا شروع کر دیتا۔ عام طور پر دو رات کے تین بجے سو یا کرتا تھا اور صبح نو بجے تک چار پائی پر گزارتا تھا۔

رات کے دس بجے بتیاں گل ہو گئیں لیکن سرکوشیاں جاری رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ہل پر سناٹا چھا گیا۔ دلی میں یہ بیماری پہلی رات تھی۔

دریا گنج

اگلی صبح اقبال ہوٹل سے ناشتہ کر کے ہو میو فوڈ کی کتابیں خریدنے کے لئے ہم دریا گنج کی طرف چل پڑے۔

ہو میو فوڈ کی کتابوں کے سلسلے میں ہمیں صرف دو ماہوں کا علم تھا۔ چو نے منڈی میں جین پبلشرز اور دریا گنج میں بھنڈاری۔

دریا گنج کا بازار شروع ہوا تو ہم رکشا سے اتر گئے۔ وہ ایک فراخ بازار تھا جس میں بینک تھے، ہوٹل تھے، دفتر تھے، ریل تودان تھے، جزیل مرچنڈس تھے، موٹر پارکس تھے۔ وہاں بھی کچھ تھا۔

بازار میں خاصی رونق تھی۔ لوگ اپنے اپنے کام سے آ جا رہے تھے۔ محل لگانے والے بکسر مفلکود تھے۔ احساس فراغت معدوم تھا۔

چہرے ہی چہرے:

ہم نے لوگوں کو دیکھا ہی چہرے ہی چہرے تھے۔

دو گھنٹہ میں نے محسوس کیا کہ یہ چہرے وہ چہرے تو نہیں یہ تو سب پرے ہیں۔ بالکل نئے۔

اس خیال پر میں چہروں کو دیکھنے لگا۔

چہرے ہی چہرے، چہرے ہی چہرے۔ دریا گنج میں چہروں کی سریں چل رہی

تھیں۔

نوجوان اور جوان چروں کی بھرمار تھی۔ یوزحہا چرا کوئی نہ تھا۔ کبھی کبھار نظر آتا تھا۔ یہ ہند میں یوزحوں کو کیا ہوا۔ کیا یہ کوئی راج کی مکر و دھوکہ دہی کا اثر ہے یا جذبات تھا کہ اس کے امرت و دھلا کا۔ حیرت کی بات ہے کہ اویڑ عمر کے لوگ بھی جوانی کے سرور پر اٹھائے پھرتے تھے لیکن وہ چرے ہندو چرے نہ تھے۔ کیا یہ چرے بیکور ہو گئے ہیں۔ ہندو چرے میں ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ ایک اعزاز ہوتا ہے۔ قیام ہوتا ہے۔ سکون ہوتا ہے۔ قتل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کیا کیا ہوتا ہے۔ سر حال ہندو چرا بڑا منفرد ہوتا ہے اور ہوں ہوں عمر بڑھتی ہے وہ جین پر آتا ہے۔

لیکن اس جھوم میں ہندو چرا کیسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ یا اللہ یہ کیا ہوا۔ وہ چرے کہاں ہیں جن سے میں واقف تھا۔ یہ چرے وہ چرے تو نہیں۔

مجھے یاد ہے جب میں قصہ میں سکول ماسٹر تھا تو ہمارے ایک سیکٹر ماسٹر ہوتے تھے۔ ان کا نام سکھ راج تھا۔ ان کا چرا اٹالی ہندو چرا تھا۔ ان کے چرے پر کوئی تکی نہ تھی۔ غصہ نہ تھا۔ کبھی ناگوری نہ جھنگلی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی بچے کو سرزنش نہ کی تھی۔ کسی کو سزا نہ دی تھی۔ بس وہ سنجیدہ ہو کر کھڑے ہو جاتے۔ جماعت کے لڑکے انہیں دیکھ کر خود بخود شور مچانا بند کر دیتے۔

سکول کے میدان میں جھگڑا ہو جاتا تو وہ باہر نکل کر چپ چاپ کھڑے ہو جاتے۔ جھگڑنے والے انہیں دیکھ کر خود بخود چپ ہو جاتے۔

واقعی لالہ سکھ راج۔ سکھ راج تھے۔ ان کے چرے پر سکھ راج تھا۔ صرف چرے پر ہی نہیں ان کے من پر بھی سکھ کا راج تھا۔

سکھ راج کی دو مصروفیتیں تھیں۔ ایک تو وہ بڑے عابد تھے دوسرے دین پن ان کا دھرم تھا۔

حالانکہ ان کی تنخواہ کچھ زیادہ نہ تھی پھر بھی وہ ہر مہینے گھڑے کی ۳۰ قیسیں سلاوتے۔ روز صبح سویرے سیرے جاتے تو ایک قیس بغل میں دبا لیتے۔ سیر کے دوران جو غصے انہیں مستحق نظر آتا چپکے سے قیس اس کے ہاتھ صہا کر یہ جاوہر جا۔ جب تک وہ قیس کا دین نہ دے لیتے ہاتھ نہ کرتے تھے۔

بجھے ہوئے دیئے

دریا سمج میں بہتے ہوئے چروں پر ذرا چمک نہ تھی۔ جیسے سارے بجھے ہوئے دیئے ہوں۔ ان پر رونق نہ تھی، خوشی نہ تھی۔ فراغت نہ تھی۔ نہ بے ہنگامی نہ غلغلہ گردی۔ نہ ہی وہ چہرے انگلابی تھے۔ ان چروں پر جلی حروف میں میڈیا کر لکھا ہوا تھا۔ وہ چہرے مصروف چہرے تھے۔ رونق میں پھنسے ہوئے جیسے کوسو میں بہتے ہوئے تیل کا چہرا ہوتا ہے۔ کوسو کے تیل کی آنکھوں پر کھوپے چڑھا دیئے جاتے ہیں تاکہ اس کی توجہ منتشر نہ ہو۔ چارہ دیکھ کر راہ ناپنے سے رک نہ جائے۔ ان چروں پر کھوپے نہیں چڑھے تھے۔ کھوپے چڑھانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ توجہ منتشر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

پاکستانی چروں سے وہ چہرے کتنے مختلف تھے۔ یہاں مصروف لوگ بھی یوں چلتے بھرتے نظر آتے ہیں جیسے احساس فراغت سے بھرے ہوئے ہوں۔

سیدھی راہ چلتے ہوئے بھی گرد و پیش کا یوں جائزہ لینے رہتے ہیں جیسے صرف جائزہ لینے کے لئے گھوم بھر رہے ہوں۔ کام سے جاتے ہوئے بھی یوں غصہ کھینکتے جاتے ہیں جیسے خل رہے ہوں۔ نوجوان اپنے چہرے چال و حال رنگ روپ کے شعور سے یوں بھینکے ہوئے ہوتے ہیں جیسے صبح کے وقت گھاس لوس سے بھری ہوتی ہے۔ یہاں کا ہر چہرا خود کو پر زنت کرتا ہے یوں جیسے چاندی کی قفل میں درق لگی گھوڑاں پیش کی جاتی ہیں۔

دریا سمج کے چہرے خود شعوری سے خالی تھے۔ انہیں احساس نہ تھا کہ وہ کیسے ہیں۔ وہ بس تھے خود کو پیش نہیں کر رہے تھے۔ لیکن وہ چہرے حکم تھے ان پر سرت کی جھلک نہ تھی۔ نہ اطمینان تھا نہ بے اطمینانی۔ نہ سرکشی تھی نہ انگلابی جذبہ نہ غلغلہ پن اور مسمر چہرے تو نظری نہیں آتے تھے۔

وہ معزز، متوازن، مشعل بعد چہرا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

سر دار جی

سکھ سکھ سکھ۔ ساری دلی سکھوں سے بھری ہوئی تھی۔ جب ہم دانگہ بارڈر پر پہنچے تو سرحد پر سکھ قبیلوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

جب ہم امر تر پہنچے تھے تو سکھ ہائیکل رانسا چار ہے تھے۔ یوجہ انھار ہے تھے۔
 چنگ چار ہے تھے۔ وہاں سکھ کو دیکھ کر میں نے آہ بھری۔ پھلا سکھ۔
 لیکن ہم دلی پہنچے تو منظر بالکل بدل گیا۔ ارے۔۔۔ سکھ

سردار جی مہراج۔

دلی میں سکھ کا چراہیں تھا جیسے صحرا میں نخلستان آگیا ہو۔ جزیرے ہی جزیرے۔
 جزیرے ہی جزیرے۔ سکھ کی پگڑی جو کسی زمانے میں سر کا یوجہ نظر آتی تھی۔ سر برہوں
 لپٹی ہوئی تھی جیسے باندھی ہوئی نہ ہو، بلکہ خالی دلی ہوئی ہو۔ سکھ کی وہ پگڑی جو دھتائیت کا
 نشان کبھی چلتی تھی اس پگڑی نے دریا سمجھ میں رنگ جملہ کھاتا۔ وہ پگڑی لپٹی ہوئی نہیں تھی
 بلکہ باندھی ہوئی تھی۔ باندھی ہوئی بھی نہیں بلکہ کھلی ہوئی تھی۔ اس کی بندش میں اک
 بندش تھی۔ اس کی شیب کیوٹ تھی۔ اس کی ٹاٹ میں اک سولٹ تھی۔

سکھ کی پگڑی سکھ کی پگڑی۔ سارے دریا سمجھ میں سکھ کی پگڑی۔ یہاں وہاں اور
 اور جگہ جگہ سے جھانک رہی تھی۔ صرف پگڑی ہی نہیں سکھ کے چہرے پر بھی گویا استری
 پھری ہوئی تھی۔

سکھ کی پگڑی، سکھ کا چہرا، سکھ کا لباس، سادی، دلی میں سوست دل ڈوبی سکھ تھا
 سکھ کا چہرا جلاؤب توجہ تھا۔ متول سکھ میں اک وجہ تھا۔ مٹتی سکھ میں لگن تھی۔ یا اللہ یہ
 کون سی قوم ہے جس نے دلی پر پورش کر رکھی ہے۔ یہ وہ سکھ تو نہیں جس سے میں واقف
 تھا۔ اس سکھ میں صحت تھی جذبہ تھا منت تھی خوش باشی تھی غلوس تھا۔ اس سکھ میں ہانک
 پن ہے خود اعتمادی ہے۔ وہ سکھ سادہ لوح تھا یہ سکھ جگدار ہے۔ وہ سکھ بد رنگ تھا یہ سکھ
 رنگ رنگیلا ہے، چمکیلا ہے۔ اس میں مزاج کی حس ہے۔ مجھے یاد ہے چپ تقسیم کے بعد پہلی
 مرتبہ سکھوں کا جھٹہ پاترا کے لئے حسن ابدال آیا اور چٹائی رکھا تو نوجوان اور بچے سکھ کو
 دیکھنے کے لئے گھروں سے باہر نکل آئے۔

انہوں نے سکھ کے گرد گھیر ڈال لیا۔

سکھ نے لوگوں سے خطاب ہو کر کہا۔ میرے بھائیو گمہ ان ڈاؤ۔ دیکھتے جاؤ اور چلتے
 جا۔۔۔ پیچھے بھی مت بھائی دیکھنے کے لئے کھڑے نہ بنو ان کا حق نہ مارو۔

سکھ کی یہ بات سن کر میرے دل میں اس کے لئے احترام پیدا ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں

کہ سکے ایک عظیم قوم ہے۔ میراجی چاہتا تھا کہ دریائے گنڈک میں کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لوں اور چلا چلا کر کہوں۔ سردار جی صدراج آپ ایک عظیم قوم ہیں۔

لطیفہ ہی لطیفہ

پتہ نہیں سکھوں کا مذاق اڑانے کی تحریک کس نے چلائی کیسے چلی۔ ایک بات ہر صورت یقینی ہے کہ یہ تحریک ایک معظم تحریک تھی۔ اگرچہ اس تحریک کو مزاح کا رنگ دے دیا گیا تھا۔ مگر اس میں مزاح کا عنصر کم کم تھا سفر کا عنصر زیادہ تھا۔

تقسیم سے پہلے سکھوں کا مذاق اڑانے کے لئے بارہ بجے سے متعلق لطیفے چلائے گئے۔ مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ دوپہر بارہ بجے سکھوں کا ذہن الٹ پٹ جاتا ہے اور وہ عقل سے خالی ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ بات سکھوں کے کہیں کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی۔ یہ بات وضع کرنے والوں نے کہی یہ نہ سنا تھا کہ عورت کے سر پر بھی لمبے ہل ہوتے ہیں۔ سکھوں نے یہ حقیر بھرا لطیفہ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

مجھے یاد ہے تقسیم سے پہلے دوپہر کے وقت میں ایک دوست کے ساتھ مل روڑ پر کسی کام سے جا رہا تھا۔ ایک سائیکل سوار سکھ سوک پر آرہا تھا۔ کسی رکاوٹ کے بغیر۔ ظاہر کسی وجہ کے بغیر سائیکل سوار سکھ سوک پر گر پڑا۔ میرے ساتھی نے اپنی گھڑی دیکھی اور ہنس کر کہنے لگا سردار جی ابھی تو بارہ بجتے ہیں سات منٹ باقی ہیں۔ سکھ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا صدراج اپنی گھڑی ٹھیک کر لیں۔

پھر تقسیم کے بعد سکھوں کے متعلق لطیفوں کا ایک طوفان اٹھ آیا۔

مجھے علم نہیں کہ یہ طوفان کس طرح اٹھا۔ ہر صورت ایک بات ظاہر تھی کہ یہ طوفان از خود نہیں اٹھا تھا۔ یہ لطیفہ معمولی قسم کے لطیفے نہیں تھے۔ کئی ایک تو بڑے دور رس ذہنوں کی پیداوار نظر آتے تھے۔ کئی ایک مزاح کی عمدہ مثال تھے۔ ایسے معلوم پڑتا تھا کہ فن لطیفوں کو تخلیق کرنے کے لئے باقاعدہ کوئی اعلیٰ پائے کی ٹیکنیکی کام کر رہی ہے مثلاً سب سے پہلا لطیفہ جو میں نے سنا اسے سن کر میں حیران رہ گیا۔

یقیناً آپ نے وہ لطیفہ سنا ہو گا۔

سکھوں کا ایک جتھہ آ رہا تھا۔ سردار صاحب نے ان سے پوچھا ”یہ فوجیں باہر سروں آئیں نہیں“ جتھے کے سربراہ نے جواب دیا ”نہ صلاح۔ آپاں نے امیر سروں آ رہے ہیں۔“ سردار جی بولے ”اچھا میں سمجھتا تھا امیر سروں آ رہے ہیں۔“ یہ لطیفہ سکھوں پر عائد نہیں ہوتا۔ یہ تو افسانہ اور کیونٹی کیشن پر ایک آفتابی لطیفہ ہے۔ بہر طور اسے سکھوں پر زبردستی منطبق کیا گیا جس کا مقصد تحقیر و تضحیک تھا۔

سکھوں نے تحقیر کے اس طوفان کو چندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اگر ہندو یا مسلمان پر ایسے لطیفہ وضع کئے جاتے تو یقیناً خوفناک نتائج برآمد ہوتے۔

اس قسم کے تحقیر پھر سے وار سکھوں نے سروانہ وار برداشت کئے۔ اور آج دہلی کی سڑکوں پر، بازاروں میں، محلوں میں، باغوں میں سکھ یوں برا بھلا کہتے ہیں جیسے کبھی بہادر کے راج میں چوکوں میں ملکہ کے بت برا بھلا کہتے تھے۔

یہ کیا ہو رہا ہے صلاح۔ توجہ فرمائیے۔ آپ کے دیش میں کوئی اقلیت اٹھ رہی ہے۔ اتنی گستاخی۔ نہ صلاح ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ ایسا تو کبھی ہوا نہیں۔
دفترا اشفاق حسین رک گیا۔

دیریا آج میں وہ ایک موسیقی کی دوکان تھی۔

اندرونی ایک سلا پڑے تھے۔ سٹار ہار مونیم۔ ٹیبلہ۔ ایک بالکا سکھ پوچھ رہا تھا۔
”کیا چاہتے صلاح۔“

اشفاق حسین مسکرایا۔ بولا ”سردار جی سٹار کے لئے تدریس چاہتے ہیں لیکن تانے کی ہوں مل جائیں گی۔“

”کیوں نہ ملیں گی صلاح۔ ضرور ملیں گی۔“

”اچھا تو پھر دے دیجئے۔“

”کتنی تدریس چاہتے ہیں۔“

”اشفاق بولا ”سردار جی ہم پاکستان سے آئے ہیں۔“

سکھ ہنسا۔ بولا ”وہ تو صلاح آپ کے منہ پر لکھا ہوا ہے۔“

”کیا مطلب۔“ میں نے پوچھا۔

”پاکستان کا چہرا اور سے نظر آ جاتا ہے جی۔

”کس طرح سردار جی ذرا آپاں کو یہ نقطہ تو سمجھا دیجئے کیسے پتہ چلتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا۔ ”نہ صلاح آپاں کو یہ نہیں پتہ کہ کس طرح پتہ چلتا ہے۔ بس اتنا ہی پتہ ہے کہ پتہ چل جاتا ہے کہ یہ پاکستان سے آیا ہے۔“

چلتے پھرتے کھانا:

دور یا منج میں فٹ پاتھ پر دبی عالم تھا جو اہلے ہاں ہوتا ہے۔ دو کانیں اپنی حدوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ریشیاں چلنے کی بجائے قائم تھیں۔ خوابے کھڑے نہیں تھے۔ آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک جانب کچھوری والا تھا دوسری جانب چاٹ والا۔ لوگ کچھوری کھا رہے تھے۔ چاٹ کھا رہے تھے پوری کھا رہے تھے۔

پتہ نہیں کیوں لوگوں کو بازار میں کھڑے ہو کر کھاتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں جیتے جاگتے لوگوں میں آ گیا ہوں۔

کاش کہ اسلام آباد میں بھی لوگ بازاروں میں چلتے پھرتے کھاتے پیتے نظر آتے۔ لیکن یہاں ہر شخص انگریز کی بو جھل گھڑی اٹھانے پر مجبور ہے۔ یہ بوجھ رکھنے نہیں دیتا۔ کھانے نہیں دیتا۔ بیٹھے نہیں دیتا۔ وہ لوگ جو اپنا بچپنا کھو دیتے ہیں مردہ لاش بن جاتے ہیں۔

مجھے نیا جانندھری سے محبت ہے۔ اس محبت کی ابتدا صرف اس لئے ہوئی کہ میں نے اسے خورشید کے ساتھ بازار میں کھڑے کھاتے ہوئے دیکھا۔ ارے۔ میں رک گیا۔ اتنا خوبصورت آدمی اتنا دل ڈرست اور ایک میلے سے حلوائی کی دوکان پر کھڑا کھا رہا ہے۔ عمدے والا افسر ہے۔ کرسی والا ہے پھر بھی کھا رہا ہے۔ اوہراوہر نہیں دیکھتا کہ کوئی دیکھتا تو نہیں۔ اوہراوہر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں۔ کھانے کی لذت سے اس قدر مرشاد ہے کہ اوہراوہر کا ہوش نہیں۔

صرف کھانا ہی اہم نہیں ہوتا۔ کھانے کی سرنگل زیادہ اہم ہوتی ہے۔ معذرت

بھرے انداز میں کھانا — نہ کھانے سے بدتر ہے۔ ”کوئی دیکھتا تو نہیں“ کی احتیاط سے کھانا۔ ”معافی چاہتا ہوں“ کے انداز سے بھی برا ہے۔
لوگ کہتے ہیں جب تک کسی کو جوا کھیلنے نہ دیکھو پتہ نہیں چلتا کہ کیسا آدمی ہے۔ میں کہتا ہوں آدمی کو جاننا چاہو تو اسے کھاتے ہوئے دیکھو۔ کھل کی پابندیوں میں نہیں آزاد لے۔

پہیٹ بھرتا

کھانا ایک پر لذت عمل ہے۔ جسے کچان سے چنداں تعلق نہیں چاہے آپ بسنی مرثی کھارہے ہوں۔ یا لسی کے ساتھ مسی روٹی کھارہے ہوں۔ چاہے آپ کے سامنے پلاؤ کی قاب ہو یا کنالی دال چاول سے بھری ہو۔ شرطیں صرف یہ ہیں کہ آپ کو کھانے کی اشتیاق ہو۔ آپ پوری توجہ سے کھارہے ہوں۔ ماحول سے بے نیاز۔ اگر آپ کو جلدی ہو۔ پیچھے یہ احساس ڈبڈبائے کر کھڑا ہو کہ جلدی کرو دفر جانا ہے تو پھر کھانا نہیں رہ جاتا۔ پہیٹ بھرتا رہ جاتا ہے۔ اگر آپ بوئے کھانا کھارہے ہیں اور ساتھ سوٹل بات چیت بھی جاری رکھے ہوئے ہیں، تو وہ کھانا کھانا نہیں ہوا۔ کھڑے ہو کر توجہ اور کھاتے ہیں۔ اگر آپ کھانے کا عمل دیکھنا چاہتے ہیں تو کسی گھڑی میں دوپہر کے وقت کھیت یا گھر میں چلے جائیے۔ صبح سے دوپہر تک کام کرتے ہوئے تھکا ہوا کسان چو بھڑی بل کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ گھر والی پچھلا کرتی رہتی ہے اور وہ آرام و اطمینان سے بیٹھ کر پٹنی سے روٹی کھاتا ہے ساتھ لسی چٹا ہے۔ گلن غالب ہے کہ وہ پٹنی روٹی ڈانٹک سیر کی بسنی ہوئی مرثی سے زیادہ لذت دیتی ہے۔

دریا سنج میں لوگوں کو پکھڑی پوری کھاتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی۔ لیکن یہ کیا۔ یہ کیا کھارہے ہیں۔ اونسوں۔ یہ کھانا کھانا تو نہیں۔ یہ کھانے والے تو کچان کی لذت سے ہانکل بے گانہ ہیں۔ انہیں تو احساس ہی نہیں کہ یہ پکھڑی کھارہے ہیں یا ہنے ہوئے پنے چہارہے ہیں۔ یہ کیا کھائیں گے۔ انہیں تو احساس فراغت ہی نہیں۔ احساس فراغت نہ ہو تو کھانا کیسا۔ ہندو اس طرح تو نہیں کھاتے تھے۔ مجھے یاد ہے ہندو بڑے اجسام سے روٹی کھایا کرتے تھے۔ جوتا اٹرتے۔ چوکے پر آلتی پالتی بل کر بیٹھ جاتے۔ گڑوی سے ہاتھ دھوتے۔ پھر ان کے سامنے ایک بڑی سی قالی میں چار ایک کنوڑیاں رکھ دی جاتیں۔

ہندو پانی مسلمان پانی

تقسیم سے پہلے ریلوے سٹیشنوں پر آواز بلند ہوئی۔ مسلمان پانی - ہندو پانی - ایک قلی پانی سے بھری ہوئی باٹنی لئے پھرتا۔ ہندو پانی - ایک اور قلی پانی کی بھری ہوئی باٹنی لئے پھرتا۔ مسلمان پانی - دونوں قلی ایک جیسے ہوتے۔ ان کی کالی وردیاں ایک جیسی ہوتیں۔ باقیوں ایک جیسی ہوتیں۔ پانی ایک جیسا ہوتا۔ پھر بھی ایک ہندو پانی ہوتا۔ دوسرا مسلمان پانی۔

مسلمانوں نے بھی خصیصہ نہ کی تھی کہ پانی ہندو ہے یا مسلمان۔ ان میں اتنا صبر نہ تھا کہ مسلمان پانی کا انتقلہ کرتے۔ دراصل مسلمان کے لئے پانی پانی تھا۔ نہ وہ ہندو تھا نہ مسلمان تھا۔ ہندو انتقلہ کرتا تھا کہ کب ہندو پانی آئے۔ اس کے نزدیک صرف ہندو پانی، پانی تھا۔

مسلمان اپنی بے نیازی کی وجہ سے ہندو پانی کے سامنے چاہیشتہ۔ قلی گڑوی بھرتا۔ مسلمان اوک بیٹاتا۔ قلی گڑوی کو مسلمان سے اتنی دور رکھتا جتنا ممکن ہوتا۔ اوپر دور سے دھند کرتی، نیچے مسلمان۔

پلا دے اوک میں ساتی جو ہم سے نفرت ہے
بیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

صرف سٹیشنوں پر ہی نہیں۔ بازاروں میں، گزر گاہوں میں، راہوں میں جگہ جگہ ہندو جھیلیں لگی ہوتی تھیں۔

ہندو میں پن کا بڑا خیال ہے۔ دان کرتا ہے۔ لیکن گیت دان۔ دان ہو۔ نام نہ ہو۔ دکان بند کرنے سے پہلے بھری کا مخصوص فی صد دان ہو جائے۔ دکان بند نہیں ہو سکتی جب تک دان دے نہ دیا جائے۔ دان کرتے وقت وہ ہندو مسلمان کا خیال نہیں رکھتا۔

لیکن لوگوں کو پانی پلانے کا پن کرتے وقت وہ ہندو مسلمان کا خیال رکھتا تھا۔ پلاتا دونوں کو اوک سے تھا۔ فرق یہ تھا کہ ہندو ہوتا تو گڑوی لوک کے ساتھ لگی ہوئی۔ مسلمان ہوتا تو پانی کی اتنی لمبی ٹالی لگ جاتی پینے والا اور صبر۔ دور بیٹھا ہوتا۔ پلانے والے کی گڑوی

اور مردور ہوتی کہ بھرشت نہ ہو جائے۔

ہندو مسلمان پانی کی وجہ سے میں نے پہلی مرتبہ رام دین کو دیکھا تھا۔ بچہ رام دین۔ نہ وہ رام بن سکا نہ دین اسے دیکھ کر میرا جی چاہتا تھا کہ میں دھارمیں مار کر دو پڑوں۔

دھرم بھرشت

یہ ۱۹۳۳ء کی بات ہے۔ جب میں سکول ماسٹر تھا۔ پکی نوکری ملتی نہ تھی۔ موضوعوں پر کام کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے دھرم سالہ گورنمنٹ سکول کا ایک ماسٹر چھ مہینے کی چھٹی پر چلا گیا اور اس کی جگہ میری تعیناتی ہو گئی۔

دھرم سالہ میں پہلی مرتبہ مجھے ایسے علاقے میں رہنے کا موقع ملا جہاں ہندو اکثریت میں تھے۔ در سے میں صرف دو طالب علم مسلمان تھے۔ شاف میں میں واحد مسلمان تھا۔

میں بہت پانی پیتا ہوں۔ یہ میری پرانی عادت ہے گلاس بھرا ہو اور ہار ہار ہو۔ زندگی میں اتنا پانی اندر والا پھر بھی اندر کا ذہن نہ دھلا۔ آگ نہ بجھی۔

ایک روز مسلمان لڑکا غیر حاضر تھا۔ میں نے ایک ہندو لڑکے سے کہا کہ مجھے ایک گلاس پانی لاوے۔ وہ سر ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے پھر سے کہا۔

وہ چپ رہا۔

میں نے پھر سے کہا۔

وہ رک رک کر بولا۔ ”مہراج میرا دھرم بھرشت ہو جائے گا“۔ میں نے کہا

”بیٹا دھرم بھرشت تب ہو گا جب تو مسلمان کے ہاتھ کا پانی پئے گا۔ پانی پلانے سے دھرم بھرشت نہیں ہوتا“۔

وہ چپ کھڑا رہا۔ کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے پھر کہا۔

وہ پھر رک رک کر بولا ”مہراج ... میرا ... دھرم بھرشت ہو جائے گا

مجھے یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ وہ دھرم بھرٹ جو میرے ذہن میں تھا۔ ان علاقوں کا دھرم بھرٹ تھا جہاں ہندو اقلیت میں تھے۔

یہ دھرم بھرٹ جو لڑکے کے ذہن میں تھا اس علاقے کا دھرم بھرٹ تھا جہاں ہندو اکثریت میں تھے۔

بھراک دن بات میری سمجھ میں آگئی۔

اس روز چھٹی کا دن تھا۔ میں نے کپا چلو باہر چلیں۔ علاقے میں گھومیں پھریں۔ یہاں کتنے خوبصورت نظارے ہیں۔ میں نے قصیلہ لٹکایا۔ سوئی سنبلالی اور چل پڑا۔ چلتے چلتے بہت دور نکل گیا۔ پیاس لگی۔ پانی تو وہاں بہت تھا۔ جگہ جگہ پینے تھے، ندیاں تھیں نالے تھے۔ رفت یہ تھی کہ صحت والوں نے جا بجا بورڈ لگا رکھے تھے۔ ”خبردار پانی نہ پینا۔ صرف اسی جگہ سے پینا جہاں ہلدی بورڈ لگا ہو کہ یہ پانی پینے کے قابل ہے۔“

یہ امتیاز اس لئے برقی گئی تھی کہ علاقے کے پانی میں کوئی ایسی دھات موجود تھی جس کی وجہ سے گردن پر گھڑ نکل آتا تھا۔

پیاس نے پریشان کیا۔ کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی تھی جہاں اجازت تھے والا بورڈ لگا

ہو۔

رام دین

دفعتاً ایک سوز حزا تو سامنے گاؤں تھا۔

گاؤں کے شروع میں ہی ایک دوکان تھی۔ دوکان کے سامنے لالہ جی پیٹھے منہ دھر رہے تھے۔ پانی کی ہانسی سامنے دھری تھی۔

میں پاس گیا۔ بولا ”صداغ کیا یہاں پینے کا پانی ملے گا۔“

لالہ جی نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔

بولا ”مسلمان ہو؟“

”جی۔“

”کھیں جا رہے ہو۔“

”جی نہیں۔ کھوم پھر رہا ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“ پھر اس نے سامنے گھر کی طرف اشارہ کیا ”وہاں جا کر بی لو۔ وہ مسلمان کا گھر ہے۔“

میں اس گھر کی طرف چل پڑا۔

وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ باہر کا دروازہ کھلا تھا۔ صحن خالی تھا۔ سامنے باورچی خانہ صاف دیکھنے سے رہا تھا۔ نئی نئی گوری کی لپٹلی ہو رہی تھی۔ چو کاٹا ہوا تھا۔ اوھر اوھر تھاہیں اور کھنڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ کدائیں پر مٹی سے بنے ہوئے موٹے حروف میں لوم لکھا ہوا تھا۔

”نہیں نہیں یہ مسلمان کا گھر نہیں ہو سکتا۔“ میں نے سوچا۔ میں فلطی سے اوھر آ گیا ہوں۔ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ زبیر زحی کے دروازے پر نظر پڑی۔ وہ کھاتا دروازے کے اوپر ایک بت بنا ہوا ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے یقین آ گیا یہ مسلمان کا گھر نہیں۔ ابھی مزایا تھا کہ اندر سے ایک دبلا پتلا آدمی دھولی منہلا ہوا باہر نکلا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر مجھے پر نام کیا۔ اس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا۔ سر پر بالوں کی بو دی تھی۔

”مہراج۔“ میں نے پوچھا ”یہاں کسی مسلمان کا گھر ہے کیا۔“

”جی مہراج۔“ وہ بولا ”یہی ہے مہراج۔“

”یہی کون سا۔“

”یہی میرا مہراج۔“

”یعنی تم۔“ میں رک گیا۔

”جی مہراج۔ میں مسلمان ہوں۔ بھگوان کی کرپا سے میرا نام رام دین ہے۔“

پھر وہاں سے دھرم سار کے علاقے میں گھومتے پھرتے میں نے کئی ایک رام دین دیکھے اور مجھے پتہ چلا کہ رام دین فرد واحد کا نام نہیں بلکہ ہندو اکثریت کے علاقے کی ایک قوم ہے۔

اگر میں بار بار پانی پینے کا علاج نہ ہوتا تو اتنی بڑی حقیقت سے کبھی روشناس نہ

لیکن یہ کیا۔ ہندو کی پچیسل پر ایک پانی — ایک گلاس یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ میری نگاہ... ضرور یہ میری نظر کا دھوکا ہے۔
 وہ رے تک وہاں کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔
 راہ گیر آتے تھے، رکستے تھے، پانی کا گلاس پیتے پھر پانچ پیسے رکھ کر اپنی اپنی راہ لیتے۔

ان میں سکھ بھی تھے، مسلمان بھی تھے، ہر جگہ بھی تھے، شاید براہمن بھی ہوں۔
 ضرور ہوں گے۔ میں نے سوچا۔ پھر میں راہ گیروں کی طرف دیکھنے لگا۔
 زیادہ تر لوگ مغربی لباس میں لمبوس تھے۔ ڈرائنگ رومش مغربی لباس نہیں
 درک میں پورٹ چلون تو عام تھی بہت عام مگر وہ چلون نہ تھی کریم سے بے نیاز ج و ج سے
 بے گانہ۔ جیسے کام میں آسانی اور چلنے پھرنے میں چھٹی کا نشان ہو۔ وہ دھوئی نظر نہیں آ
 رہی تھی جو پہلے عام نظر آیا کرتی تھی۔ سرنگے تو بہت تھے۔ لیکن سر برودی نہ تھی۔ ہاتھ
 پر پٹکانہ تھا۔ پاؤں میں کھڑواں نہ تھیں۔ انداز میں وہ سننا نہ تھا جو احساس بحرث کا مظہر
 ہوا کرتا تھا۔

یا اللہ وہ ہندو کس کیا — کیا ہندو نے اس ہندو کا جتوہ نکال دیا۔ لیکن ہندوستان تو
 اکھنڈ ہندو اور رام راج کا نغرا لگا رہا ہے۔ جب ہندو ہی میں رہا تو پھر رام راج کیسا — لیکن
 ٹھہریے شاید رام خود ہندو نہ ہوں۔

وہ ہندو نہ ہوں جسے میں ہندو سمجھتا تھا بھائی تھا بھائی تھا۔ جو قدم قدم پر اعلان کرتا تھا
 کہ میں ہندو ہوں۔ میری جاتی لوہی ہے۔ میں اونچ نیچ کا شیدائی ہوں۔ اونچ نیچ کے بغیر میرا
 وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

”کرے —“ میں کہہ رہا تھا۔ سم گیا۔ میرا ساتھی اشفاق حسین جو اس دوران میں
 راگ دیا کی ٹیک دو کلن پر کھڑا سکھ دو کاندرا سے ہاتس کر رہا تھا دفعتاً مڑا اور
 پانی کی ریڑی کی طرف بڑھا۔

اُسے یہ کیا لگ پاکستانی مسلمان اشفاق حسین اس واحد گلاس میں پانی پی رہا تھا اور ریٹری والا ہندو یوں مطمئن کھڑا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

پانی پینے کے بعد اشفاق حسین میرے پاس آیا۔ بولا ”یار بڑا عمدہ پانی ہے۔ صاف صاف۔ تم بھی پی لو۔“ دلی میں یہ پانی کی ریٹریوں کا رواج بڑا اچھا ہے پانچ پیسے دو اور صفرا پانی پی لو۔“

”رولج۔“ میں نے حیرت سے اشفاق کی طرف دیکھا۔

”ہاں رولج۔“ وہ بولا۔

”یہ تو لیک ریٹری ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ بولا ”لیک نہیں۔ دلی میں ایسی ریٹریاں جگہ جگہ کھڑی ہیں۔“

وہ دیکھو سامنے پشروی پر ایک ایسی ہی ریٹری کھڑی ہے۔ پھر وہ چوک کے پاس لیک ہے۔ میں نے تو راستے میں چار لیک دیکھی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کسی سیٹھ نے پانی کا کاروبار چلا رکھا ہے۔ سینکڑوں ریٹریاں ہوا کر شر میں جا بجا کھڑی کر دی ہیں۔ کاروبار کا کاروبار پن کا پن۔

یہ ہندو:

”اور وہ ہندو پانی کیا ہوا۔“ میں نے کہا ”وہ پانی اور گڑی۔ وہ بانس کی اتنی لمبی

ٹلی۔ اور وہ لوک یاد ہے۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”لیکن۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا

”یہاں تو ہندو پانی نظر نہیں آتا۔“

”یار اشفاق حسین مجھے تو یہاں ہندو ہی نظر نہیں آتا تم پانی کی بات کر رہے

ہو۔“

”ہاں۔“ وہ مسکرایا۔ ”وہ ہندو نظر نہیں آتا۔“

”کسیں ایسا تو نہیں کہ جی نسل نے ہندو کا گلا گھونٹ کر اسے زمین میں دبا دیا ہو۔“

میں نے پوچھا۔

اشفاق حسین ہنس پڑا ”نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ہندو کا گلا کوئی نہیں دبا سکتا۔“

صدیوں سے کوئی نہ دہاسکا۔ بدھ آئے، مسلمان آئے، سکھ آئے، انگریز آئے، ہندو کا کوئی بدل
ہیکانہ کر سکا۔ نئی نسل کی کیا حیثیت ہے کچھ نہیں۔"

"کچھ کہتے ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"ہندو پانی بدل سکتا ہے۔" وہ بولا "ظاہری بھرٹ بدل سکتی ہے۔ لیکن
صدیوں سے دلوں میں بیٹھی ہوئی بھرٹ کیسے بدل سکتی ہے۔ صدیوں سے خون میں رہی
ہوئی اونچ نیچ کیسے بدل سکتی ہے۔"

اخلاق حسین یوں چمڑ گیا تھا جیسے بمزوں کا چھتہ چمڑ جاتا ہے۔ وہ بولے جا رہا تھا۔
بولے جا رہا تھا۔

"تم نے دلی کے مسلمانوں کو دیکھا ہے کیا۔ ان کے چروں پر خوف، بے بسی اور
بے چارگی کا عالم دیکھا ہے کیا۔ انہیں دیکھو۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو نہیں بدلا۔ تم نے
ان ہر بچی کو دیکھا ہے جو ہاپوں کے مقبرے کے سامنے پوٹ پر ڈیرہ ڈالے بیٹھے ہیں۔
ان کی گردنیں یوں جھاتی پر لٹکتی ہیں جیسے ان میں اٹھرنے کی طاقت نہ رہی ہو۔ وہ ہر
آہٹ پر چوکتے ہیں اور سسم کر ایک طرف ہو جاتے ہیں تاکہ کسی رلو چلتے ہندو کی
حدت کا شکار نہ ہو جائیں۔ بولو۔ بولو۔" وہ چلایا۔ "تم خود کو ادیب سمجھتے ہو کیا۔
مجھے ہو تو کیا یہ تفصیلات تمہیں نظر نہیں آتیں۔ تم ہندو کا چرا بڑا راست کیوں دیکھتے ہو۔
اس کے چہرے کا دل سے کوئی رابطہ نہیں۔ یہ رابطہ صدیوں سے ٹوٹ چکا ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"ہندو کونہ دیکھو۔ گردو چش ان لوگوں کو دیکھو جن کی تقدیر میں ہند کے ہاتھ میں
ہیں۔"

"تم نے امرتسر میں سکھ کو دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا۔"

"اوسوں۔ دیکھتے تو کبھی نہ کہتے کہ ہندو مر گیا ہے۔" کیا تم نے نہیں دیکھا کہ

سکھ اپنے منہ میں اپنے صوبے میں یوں دبا ہوا ہے جیسے لٹا دیا گیا ہو۔ امرتسر سکتا ہو۔"

"یہاں دلی میں تو ابھر رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں ابھر رہا ہے۔" وہ بولا "لیکن کس قیمت پر۔ اسے پوچھو" پتہ نہیں اخلاق

اپنی تقریر کب تک جاری رکھتا لیکن دفعتاً اہلے سامنے بھنڈاری کا بورڈ آکر اڑا ہوا۔

بھنڈاری

دریا گنج کے اختتام پر بھنڈاری کی دوکان تھی۔ ہم دونوں دوکان میں داخل ہو گئے۔ دوکان ایک ہل اور تین کمروں پر مشتمل تھی۔ یہ تینوں کمرے ہل سے ملے ہوئے تھے۔ داخل ہوتے ہی سامنے ایک کاونٹر تھا جس پر دو گریڈ قسم کی لڑکیاں کھڑی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ابھی ابھی رسوئی سے ہاریاں تل کر باہر نکلی ہوں۔ ان کے پیچھے المیہوں میں دو دنیاں اور کتابیں قریب سے رکھی ہوئی تھیں۔

سامنے دیوار پر ایک بڑا سا فریم آویزاں تھا۔ جس پر ایک معزز اور پاکیزہ صورت اللہ جی کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

اللہ جی کی تصویر کو دیکھ کر مجھے اپنے بزرگوں کی تصویریں یاد آ گئیں۔ وہی اطمینان اور سکون بھری شکل۔ وہی وقار، وہی سادگی۔ غالباً یہ تصویر بھنڈاری کی تھی۔

ایک کمرے میں اکیلی میز پر ایک معصوم صورت چھوٹی عمر کی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ غالباً وہ بھنڈاری نجی کی بیٹی تھی۔ خاموش۔ پروقار۔

ساری دوکان کا ماحول کچھ عجیب سا تھا۔ کاروباری رنگ مفقود تھا۔ دوکان کی فضا کے لحاظ سے وہ دوکان لگتی ہی نہیں تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی آشرم ہو۔ اگرچہ دوکان کے تمام لوازمات موجود تھے۔ مختلف کتابوں اور دوایتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ کاونٹر لگے ہوئے تھے۔ سیل گرائڈ ہتھیار وچ بند کھڑی تھیں پھر بھی کمرشل رنگ مفقود تھا۔

اوشا

پھر دفعتاً ایک کمرے سے لوہی لمبی ویلی پتلی سی لڑکی باہر نکلی۔ دوکان میں جیسے ایک دم ہانپیں کی ایک کرن چھوٹی۔ ہماری آنکھیں پتہ چیا گئیں۔ ساری دوکان ایک

رخصتیں جسم سے بھر گئی۔

لوشا کی آنکھیں کشتیوں کی طرح ڈول رہی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چال میں چستی تھی۔ ترست پھرت تو تھی مگر جیسے نہیں اڑتے تھے۔ جلاب توجہ تو تھی لیکن توجہ کا مطالبہ نہ تھا۔ رنگ پچھاری تو تھی لیکن رنگ میں شر کا عنصر نہ تھا۔ لوشا کی آمد سے دوکان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

اشفاق حسین نے اپنے دم انداز میں بات کی۔ کہنے لگا ”ہم پاکستان سے صرف ہومیو پتھی کی کتابیں خریدنے آئے ہیں۔ ہندو ہومیو پتھی کا دوست ہے۔“
لوشا مسکرائی۔ بولی ”یہاں تو لوگ ڈاکٹروں کے پر دانے ہیں۔ انہی پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ہومیو پتھی کو کوئی نہیں پڑھتا۔“

”ہلدے ہاں بھی یہی حال ہے۔“ اشفاق حسین مسکرایا۔ ”شاید یہاں سے بھی زیادہ۔ بسر حال ہند نے ہومیو پتھی کو بڑا بڑا حادو دیا ہے۔ ہمیں صرف ہندی ہومیو پتھیوں کی کبھی ہوئی کتابیں چاہئیں۔“ شنگل کی۔ گوبائی، ورمائی، چودھری کی۔“

سب لڑکیوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ حالانکہ اس دور میں دوکان میں اکا دکا گاہکوں کی آمد و رفت جلدی تھی اور لڑکیاں گاہکوں کے مطالبات کو چستی اور شہدہ چوستانی سے پورا کئے جا رہی تھیں لیکن ان کے کان ہماری طرف لگے ہوئے تھے۔

لوشا مسکرائی۔ بولی ”مغربی لکھنے والوں کی کتابیں کیوں نہیں جی۔“
”مغربی علاج ہلدے حراہوں سے واقف نہیں۔ ہند کے اور پاکستان کے مریضوں کے حراج ایک جیسے ہیں۔“

لڑکیاں چنے لگیں۔ ”کون کون سی کتابیں چاہئیں۔“ ایک نے کہا۔
اشفاق حسین ہنسا۔ ”بس میں ہو تو ہم ساری دوکان خرید لیں لیکن کیا کریں ہم غریب لوگ ہیں۔“

”دیکھتے تو نہیں۔“ دوسری گھریلو لڑکی نے کہا۔
”بس یہی تو آپ میں اور ہم میں فرق ہے۔“ اشفاق حسین نے کہا۔ ”آپ امیر ہیں
پر امیر دیکھتے نہیں۔ ہم غریب ہیں مگر غریب دیکھتے نہیں۔“

باتیں ہی باتیں

اس پر ساری لڑکیاں ہنس پڑیں۔
 ”آپ عجیب باتیں کرتے ہیں“۔ اوشا بولی۔
 ”جی“۔ اشفاق حسین نے کہا ”اس لئے کہ ہمیں باتوں کو بڑا سجا کر پیش کرنا نہیں
 آتا۔“

”آپ لاہور کے ہیں“ اوشا نے پوچھا۔
 ”جی“۔
 ”میں بھی لاہور سے ہوں“۔ وہ بولی۔
 ”آپ کے منہ پر لاہور لکھا ہوا ہے“۔ اشفاق حسین نے کہا۔
 ”ابھیا“۔ وہ ہنس ہنس کر دوہری ہو گئی۔
 ایک گھریلو لڑکی بولی۔ ”بھنڈاری جی بھی لاہور کے تھے۔ ماڈل ٹائون میں رہتے
 تھے۔“

”جیسی“۔ اشفاق حسین نے کہا۔
 ”جیسی کیا“۔ اوشا نے ڈولتی آنکھوں کو سنبھالا۔
 ”جیسی اس دوکان میں آکر میں محسوس کر رہا ہوں کہ گھر آ گیا ہوں“۔
 دوکان فرط انبساط سے گونجنے لگی۔
 وہ معصوم لڑکی جو آپیلی کمرے میں چپ چاپ بیٹھی تھی اس کا چہرہ بھی تبسم سے دیکھنے
 لگا۔

پھر ایسے لگا جیسے وہ دوکان نہ ہو۔ گھر ہو۔ دلی نہ ہو لاہور ہو اور وہ لڑکیاں بیل
 کر لڑ نہ ہوں۔ جیسے ہم سب ایک ہی خاندان کے فرد اپنے گھر میں بیٹھے ہوں اور ایک
 دوسرے سے دل کی باتیں کر رہے ہوں۔
 اس وقت دوکان خلوص، سلوکی بے تکلفی اور لہجائیت سے یوں بھری ہوئی تھی جیسے
 گاؤں کا کوئی آئٹن ہو۔ پتہ نہیں ہم کب تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ یوں باتیں
 کرتے رہے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ان باتوں میں وہ لڑکی بھی شامل
 تھی جو دور چپ چاپ بیٹھی تھی۔ بن بولے شامل تھی۔

وہ ہاتھ نمائشی ہاتھ نہ تھیں۔ بھوئی بھوئی ہاتھ۔ مکی پکی ہاتھ۔ وہ ہاتھ جو چھپانے کے لئے نہیں بلکہ بتانے کے لئے کی جاتی ہیں۔ وہ ہاتھ جو زمین سے نہیں بلکہ دل سے نکلتی ہیں۔ وہ ہاتھ جو کانوں سے رنگ رنگ کر روح تک جا پہنچتی ہیں۔ اس وقت ہم بھول گئے کہ وہ لڑکیاں ہیں، وہ بھول گئیں کہ ہم مرد ہیں۔ مسلمان ہیں، پاکستانی ہیں، ہم بھول گئے کہ وہ ہندو ہیں، ہندی ہیں۔

کم از کم اس ایک دوکان میں پاکستان اور ہند کے درمیان ڈر خوف اور نفرت کی وہ دیوار جو دھرم بھرتش کے جذبے نے پیدا کر رکھی تھی معدوم ہو چکی تھی۔ انسانیت کے جذبے نے ہم سب کو اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔

روز و شب

جب ہم اسلام آباد سے علوم سفر ہوئے تھے تو ہمارے لئے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کیا کیا مسلمان ساتھ لے جائیں۔

حج دفتر نے اس مسئلے میں اہل دیوبند کی توجہ کی تھی۔ ہمیں یہ بھی علم نہ تھا کہ ہندو میں ہم کس جگہ قیام کریں گے۔ آیا ہمیں چار پائیاں ملیں گی یا نہیں۔ بستر ساتھ لے جانے ہوں گے یا نہیں۔ وہاں کھانے کا کیا انتظام ہو گا۔ یہ انتظام، انتظامیہ کے ذمے ہو گا یا وزیرین کو از خود کرنا ہو گا۔

حکم نامہ ہدایت نامہ۔

حج دفتر نے ایک تحریری ہدایت نامہ جاری کیا تھا۔ یہ ہدایت نامہ موسیٰ کے ہدایت نامے کے خطوط کے مطابق ترتیب دیا گیا تھا جس میں DOS کی بجائے DONTs پر زور دیا گیا تھا۔ اس میں وزیرین کو بتایا گیا تھا کہ وہاں کیا نہیں کرنا۔ یہ نہیں کہ وہاں کیا کرنا ہے۔ اور یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ اگر منفی ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو آپ کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

موسمی مسائل میں یہ تھیں۔

کیمرا، ویڈیو، دور بین، ٹیپ ریکارڈر ساتھ مت لے جاؤ۔

غیر مذہبی رسومات میں مت شامل ہوؤ۔

انترویو یا بیان مت دو۔

ممنوعہ اشیاء مت لے جاؤ یا مت لاؤ۔

زیارت پادری سے الگ قیام مت کرو۔

ہندی حکام یا سفارت پاکستان کو عرضی مت دو۔ لن سے سلسلہ جینیائی مت کرو۔

لیڈر کی حکم عدولی مت کرو۔

یہ ہدایت نامہ خبردار لور مت سے بھرا ہوا تھا۔

اپنی نوعیت میں یہ ہدایت نامہ ہدایت نامہ نہ تھا بلکہ حکم نامہ تھا۔ اگر اس حکم نامہ کے ساتھ ساتھ ایک ہدایت نامہ بھی شامل کر دیا جاتا تو ہمیں سہولت ہو جاتی۔ اب ہندی مشکل یہ تھی کہ کس سے پوچھیں کہ اپنے ساتھ کیا کیا لے کر جائیں۔

جج دفتر میں دوسری بار جانے کی میری صحت نہ پڑتی تھی۔ پھر بھی اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہاں جا کر کچھ اچھوت مل جائے گا تو میں یقیناً جانے کی جرات کر لیتا۔

لونا

اس ضمن میں سب سے پہلے ہمیں ایک خان صاحب ملے، بولے ”دیکھو بھئی۔ لور کچھ لے کر جاؤ یا نہ جاؤ ایک لونا ضرور لے جانا“۔

ہم نے کہا ”خان صاحب لونا اتنا اہم ہے کیا“۔

خان صاحب بولے۔ ”تم یہ سمجھ لو بھئی کہ وہاں ڈیرے پر دو کیونگے رہتے ہیں۔ ایک لیڈرین پر دوسرا لوتے پر۔ اس لئے ہم تم سے بولا ہے کہ تم لونا ضرور لے کر جانا۔

ہم نے کہا ”کوئی دوسری چیز بتائیے جو ساتھ لے جانا ضروری ہو“۔

خان صاحب بولے ”دوسری چیز یہ ہے کہ ایک ڈنچر اور تالا ساتھ لے جاؤ“۔

”وہ کس لئے خان صاحب؟“

”وہ اس لئے کہ جب تم لونا سرہانے رکھ کر سو جائے گا اور صبح جاگے گا تو دیکھے گا کہ لونا وہاں نہیں ہے۔ کوئی لونا لے جائے گا۔ اس لئے جب تم سوتے لگو تو لوتے کو ڈنچر

سے باہر کر چار پائی سے تان لگا دو تاکہ لوٹا محفوظ رہے۔"

"لوٹا اتنی اہم ہے کیا؟" - اشفاق نے پوچھا۔

"بہت۔" - خان صاحب بولے۔ "دیکھو وہاں جا کر لوگ دو کام کرتا ہے یا تو

نمازیں پڑھتا ہے یا لیٹرین جاتا ہے۔"

پانی اچار

دوسرے صاحب جو ہمیں ملے وہ بولے "دیکھیے جناب آپ کو وہاں پینے کے پانی کی بہت تکلیف ہوگی۔ لہذا اور کچھ لے جائیں یا نہ لے جائیں۔ ایک بڑا سا دائرہ ضرور لے کر جائیں۔ تاکہ آپ کو ٹھنڈا اور صاف پانی پینے کو ملے۔"

"انتظامیہ وہاں ٹھنڈے پانی کا بندوبست نہ کرے گی کیا؟" - اشفاق حسین نے

پوچھا۔

"مشکل ہے۔" - انہوں نے جواب دیا۔ "انتظامیہ کو اور بھی کام ہوں گے جن سے فرصت نہیں ملتی۔"

"مثلاً۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"مجھے انتظامیہ کو سب سے بڑا کام تو انتظام کرنے کا ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔

اس لئے وہ پانی والی کی طرف توجہ نہ دے سکے گی۔"

تیسرا آدمی جو ہمیں ملا ٹھیکہ دار پنجابی اور تاجر تھا بولا "جناب آپ کچھ اور لے کر جائیں یا نہ جائیں لیکن کوئی کھانے پینے کی چیز ضرور لے جائیں۔"

"رائزین کے کھانے کا انتظام انتظامیہ کے ذمے نہیں ہو گا کیا؟"

"اوسوں۔ کھانے کا انتظام اپنا ہوتا ہے۔ وہاں حضرت نظام الدین کی مہنتی میں

صرف دو تھور قسم کے ہوٹل ہیں۔ جہاں کھانا قلم جاتا ہے۔ لیکن دو ہی دنوں میں یا تو ڈائریا ہو جاتا ہے اور یا کچھش۔"

"میں تو پتہ ہوں۔" - اشفاق حسین کھرا کر بولا۔

"اگر یہ بات ہے تو آپ نہ جائیں۔" - وہ بولا۔

یہ سن کر اشفاق حسین تو سر ہکا کر بیٹھ گیا۔

”کھانے کی کس قسم کی چیز لے جائیں وہاں“۔ میں نے پوچھا۔
 ”ہم تو جناب سائڈ بیف کا ایک ڈبہ لے گئے تھے۔ ایک بوقلمون اپنی مالک مرے کی
 ایک چٹنی کی اور وہاں جا کر ہم نے چھلی کے ڈبے اور اینڈے خرید لئے تھے۔ ساتھ ایک سٹو
 رکھ لیا تھا“۔ جب ہم دلی پہنچے اور اس مقام کا جائزہ لیا جہاں ہمیں قیام کرنا تھا تو جلد ہی
 ہمیں معلوم ہو گیا کہ جن مطلوبات سے ہم لیس ہو کر گئے تھے سب کی سب حرف بحرف
 درست تھیں۔

سکہ بند:

لوٹنے کی جگہ ہم ایک بڑا مک لے گئے۔ لیکن السوس ہے کہ ڈنچر نہ لے گئے۔ وہ
 مک ہمارے پاس صرف ایک دن رہا۔ اگلے روز اپنی جگہ پر موجود نہ تھا۔
 انتظامیہ وہاں انتظامات میں واقعی اس شدت سے مصروف تھی کہ پانی، چائے یا
 کھانے کے متعلق سوچنے کی اسے فرصت نہ تھی۔
 لیڈر ان کرام خالص سوئی صلیڈر تھے۔ ان کا برٹاؤسکہ بند لیڈروں کا ساتھ۔ وہ
 الگ کمرے میں ٹھہرے جو ڈائریں سے سو دو سو قدم پر تھا۔ وہیں سے ہدایات بگواتے
 تھے۔

کبھی کبھار تشریف لاتے اور نہایت اخلاق اور محبت سے کہتے ”آپ خیریت سے تو
 ہیں۔ امید ہے آپ کا وقت آرام سے گزر رہا ہو گا۔ اگر آپ کو کوئی تکلیف ہو تو آذر لہ کرم
 ہمیں اطلاع دیں۔ ہم خدمت میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں گے“۔
 بے شک ان کا رویہ خالص لیڈر نہ تھا۔

مجھے زندگی میں بہت سے لیڈر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہم لوگ غولہ غولہ لیڈروں
 پر الزام دھرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ لیڈر وہی روپ دھاندلے پر مجبور ہو گاتے ہیں وہ کلہا پند
 کرتے ہیں۔ اگر یہ کلہا پند کرتے ہیں تو وہ سرخ رنگ پند کرتے ہیں تو وہ سرخ رنگ اتقید کر لیں گے۔ اگر
 سبز پند ہے تو سبز اتقید کر لیں گے۔

مجھے یاد ہے۔ ہمارے ایک بہت بڑے محبوب لیڈر تھے۔ وہ ایک محل نما مکان میں
 رہتے تھے لیکن چونکہ تھے مزدوروں کے لیڈر اس لئے انہوں نے اپنا ڈرائنگ روم سرورٹ

کوارٹر میں بنا رکھا تھا۔ جوں اترنا ٹوٹی ہوئی کرسیاں رکھی جاتی تھیں۔ سٹی کے پیالوں میں چائے پیش کی جاتی تھی۔ ٹرے کی جگہ چنگیر استعمال ہوتی تھی۔

مزدوروں کو علم تھا کہ رہائشی محل میں چاندی کے برتن استعمال ہوتے ہیں پھر بھی وہ سرورٹ کوارٹر کے انتظام پر بہت خوش تھے اور اکثر یہ کہتے مزدوروں کا لیڈر ہوا تا۔ وہ کیا لیڈر ہے۔

وہاں دلی میں بھی اپنے لیڈر پر بے حد خوش تھا۔ لیڈر ہوا تا۔ وہ۔ سہلان اللہ۔ کیا حسن اخلاق ہے۔ کیا مٹھی زبان ہے۔ آج کے دور میں لیڈر کے لئے مٹھی زبان سے بہتر کوئی وصف نہیں۔

شکوہ شکایت

اس تکی حمام میں اسی بچہاں کے قریب دائیں مقیم تھے۔ ان میں رنگ رنگ کے لوگ موجود تھے۔ لیکن چند ایک خصوصیات کسی نا کسی حد تک سب میں موجود تھیں۔ وہ سب سادہ مزاج تھے، مخلص تھے، جذباتی تھے، اسلام پسند تھے۔ بیشتر نمازی تھے۔ کچھ ماہد بھی تھے۔

ان میں سب سے بڑا صیب یہ تھا کہ انہوں نے زندگی سے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔

فیس میں غلطی نہ رہا ہوں۔ زندگی سے امیدیں تو ہر کوئی استوار کرتا ہے۔ لیکن جو امیدیں مسلسل پھری فیس ہوتیں انہیں امیدوں کی فرست سے خلع کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ صرف امیدیں بانٹنا جانتے تھے خلع کرنا نہیں جانتے تھے۔ لہذا ان امیدوں کی دھ سے دکھی تھے۔ شکوہ شکایت سے یوں رس رہے تھے جیسے چیز کا تاجا بروڑے سے رستا ہے۔

شکوہ شکایت کرنے والوں میں ایک غولہ یہ ہوتی ہے کہ وہ مل بیٹھے ہیں۔ شکایت کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی شے دلا بھی ہو۔ چونکہ بار بار کی جاتی ہے۔ لہذا عادت بن جاتی ہے۔ وہ اس لئے فیس کی جاتی کہ اسے کوئی دور کرے۔ نہ نہ۔ اگر دور ہو جائے تو پھر شکایت کرنے کی لذت ہی ختم ہو جائے۔ جب شکایت کرنا لذت وہ ہو جائے تو پھر

وہ آرٹ فلر آرٹ میک بن جاتی ہے۔ رورڈ کر نہیں ہنس ہنس کر کی جاتی ہے۔ تفریح کے طور پر کی جاتی ہے۔ ٹھیک ٹاک کے طور پر کی جاتی ہے۔

ڈائریں فرصت کے وقت درشتوں کے چار پائیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ ایک گروپ خستہ خوں کے پاس اپنا پیروہ جمالیتا۔ دوسرا پچیس چوکی کی جانب، تیسرا برآمدے میں۔ اور وہیں ٹھیک ٹاک شروع ہو جاتا۔

اس ٹھیک ٹاک کے تین موضوع تھے۔ ایک لیڈر ان کرام اور ان کے انتظامات۔ دوسرا بھند اور اس کا رویہ اور تیسرا بھند پاک کا موازنہ۔

چائے اور سقاوے :

ترکی حمام میں صبح سویرے ایک لڑکا ہینکل پر ایک صندوق رکھے آ پہنچتا۔ صندوق سے صندوق نکالتا۔ چائے کا دوسرا سلائن نکالتا۔ صندوق نکالتا۔ کیتلی چولہے پر رکھتا۔ چائے نکالتا اور پھر اینڈرے اہل کر ٹھیک کر ایک پلیٹ میں سجا دیتا۔ پتہ نہیں یہ انتظامیہ کا انتظام تھا یا وہ لڑکا از خود آ جاتا تھا۔ انتظامیہ کتنی تھی ہمارا انتظام ہے لڑکا کتنا تھار خود آتا ہوں۔ ہر حال چائے کوڑک ہوتی اور اینڈرے ہارڈ بائیل۔

اس قیام گاہ میں کئی ایک خوبیاں تھیں۔ ایک تو بہت فراخ تھی۔ دوسرے سارے ڈائریں ایک ہی کمرے میں سما گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ اس کے ارد گرد دو سوچ میدان تھا جس پر گھاس لگی ہوئی تھی۔ چوتھے یہ کہ اس عمارت سے ملحقہ چار بڑے خستہ خانے تھے۔ ہاتھ روم نہیں۔ خستہ خانے جو پرانی طرز کے بنے ہوئے تھے جیسے پرانے زمانے میں کنوؤں کے ساتھ سقاوے بنے ہوا کرتے تھے۔ ان خستہ خانوں کی خوبی یہ تھی کہ ان میں ہر وقت پانی چلتا تھا۔ کینٹی کے ننگے کی طرح نہیں بلکہ کنوئیں کے سقاوے کی طرح۔ پانی کا دھلا دھلا تھا۔ بوند بوند میں نہیں۔ اور یہ پانی ننگے کی طرح ابلا ہوا نہ ہوتا بلکہ ٹھنڈا پانی ہوتا۔

وقت صرف یہ تھی کہ ۸۰/۸۵ آدمیوں کے لئے صرف چار خستہ خانے تھے لیکن وقت صرف ان لوگوں کے لئے تھی جو صبح صبح نہانے کے عادی ہوتے ہیں۔ بے شک اس رہائش گاہ میں بڑی خوبیاں تھیں۔ نقص صرف ایک تھا۔ کہ دن کے وقت وہ قابل رہائش نہ تھی

پہلے دو ایک دن تو تمام زائرؤں کی توجہ حضرت امیر خسرو اور حضرت نظام الدین کی درگاہ پر مرکوز رہی۔ پھر سیر و تفقہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس کے بعد حضرت امیر خسرو کا عرس آگیا۔ عرس کے بعد سب لوگ خرید و فروخت میں مصروف ہو گئے۔ ہر زائر کے پاس قربانیشوں کی ایک لسٹ تھی جسے وہ بار بار کھولتا پڑھتا اور پھر منبہال کر جیب میں رکھ لیتا تھا۔ ان لسٹوں میں سب سے زیادہ قربانیش گمراہیوں کی تھیں جنہیں پورا کرنے کے لئے بھی جان کی بازی لگانے کو تیار تھے۔

مرد سے زیادہ معصوم اور جنتی مخلوق میں نے آج تک نہیں دیکھی۔
مرد دن بھر کام کرتا ہے تاکہ گھر کے افراد کا پیٹ پل سکے۔ بیوی کی قربانیش پوری کر سکے۔ بچی کو اس کی ماں کے چو کے مطابق چیز دے سکے۔ بیٹے کا پیلا ٹھانھ سے کر سکے تاکہ بیٹے کی ماں کی ناک نہ کٹے۔ اور یہ سب کام وہ صرف ایک بات کے عوض خوشی خوشی کرتا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ مجھے گھر کا بڑا لکھو۔ بڑا لکھنے کے بعد چاہے مجھے اپنی خدمت میں لگائے رکھو۔ کو چودھری پھر چاہے اپنے جوتے صاف کر دو۔ جھاڑو دلاؤ۔ لیکن کو چودھری۔

میں گھر کا بڑا ہوں۔ میں تھلے لئے محنت کروں گا۔ مشقت کروں گا۔ کما کر لاؤں گا۔ جھولی بھروں گا۔ خیر و امیرے ہوتے ہوئے کوئی کمانے کی فکر نہ کرے۔ جان من تم کیوں توکری کرو۔ میں جو ہوں۔ جب تک میں جیتا ہوں۔ تم سب بیٹھ کر کھو، بیو عیش کرو۔

آج کی بیوی کہتی ہے۔ نہیں میں آزادی چاہتی ہوں میں توکری کروں گی۔ میاں کہتا ہے نہیں تم توکری نہیں کرو گی۔ میں جو ہوں۔

اے احق تو اسے توکری کرنے سے کیوں روکتا ہے۔ اسے کو بی بی کر توکری۔ میں گھر بیٹھ جاتا ہوں تو توکری کر۔ خود بھی کھا مجھے بھی کھلا۔

قدت اللہ شباب دورے پر برما گئے تو اسے حنا ہو کر آئے کہ حد نہیں۔ بولے میرا بی چاہتا ہے برما میں جا کر مقیم ہو جاؤں۔

میں نے کہا "وہاں کی زندگی بہت پسند آئی"۔
 بولے "بہت"۔

میں نے کہا "کیسی ہے"۔

بولے "مردوں کے لئے جنت ہے"۔

میں نے پوچھا "وہ کیسے"۔

بولے۔ "سدا کام عورت کرتی ہے۔ دکان چلاتی ہے۔ کاروبار کرتی ہے۔

محنت مزدوری کرتی ہے کھانا پکاتی ہے بچے پالتی ہے گھر کا رکھ رکھاؤ کرتی ہے۔ رکشا چلاتی ہے"۔

"اور مرد کیا کرتا ہے" میں نے پوچھا۔

بولے "جھولے میں بیٹھ کر چٹا رہتا ہے"۔

ہاں تو سکھوت کیمپ کی اس پتلا گلوں میں ہرزائوں کی جیب میں بھی کی فرمائشوں کی ایک

فرست تھی جسے وہ یوں سنبھل سنبھل کر رکھتا تھا جیسے جنت میں داخل ہونے کا پردانہ ہو۔

ہرزائوں جیسے بچائے کی دھن میں لگا تھا۔ کم کھانا تھا۔ رکشے کی بجائے پیدل چلتا تھا۔

ہسوں کے انتظار میں دھوپ میں سوکھتا تھا۔ تاکہ کڑھائی والی کشمیری چادر کی گنجائش نکالے۔

قریب لری کا یہ خبط عرس کے انتظام پر رونما ہوا۔

میں اکیس بائیس

ایک روز ہم سب درختوں تلے بیٹھے کھیاں اڑا رہے تھے کہ ایک زائر دوڑا دوڑا آیا کہنے لگا "لیڈر صاحب ہمارے ہیں"۔ یہ پیغام سن کر زائرین بہت خوش ہوئے۔ کہجے کہ شاید ہندوستانی کرنسی کا چھ گالے کا"۔

جب ہم لیڈر صاحب کے کمرے میں پہنچے تو پتہ چلا کہ عرس کے متعلق اعلان ہو گا۔

لیڈر نے اپنی شیریں آواز میں اعلان کیا کہ عرس ۲۰ تاریخ کو ہو گا۔ اور عرس میں

اندرا کے خاص حکم کے تحت ہند کا ایک وزیر شرکت کرے گا۔ اور پاکستان زائرین سے ملاقات کرے گا۔

لیڈر صاحب نے سب کو تائیدی کہ عرس میں باقاعدگی سے شمولیت کی جائے۔ جلوس کی شکل میں حاضری دی جائے۔ اور چادر چھائی جائے۔

اسی روز دوسرے کے وقت ایک صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے ایک چھاپا ۱۰ پروگرام زائرین میں بڑے اہتمام سے پٹایا۔ اس پروگرام میں عرس کی تقریب کے لئے ۲۱ تاریخ مقرر کی گئی تھی۔ پھر شام کے وقت دو چار اصحاب ایک اور چھاپا پروگرام ہاتھ گئے جس میں عرس کی تقریب ۲۲ کو دکھائی گئی تھی۔ اس بات پر میں بوکھلا گیا۔

مجھ میں نہیں آتا تھا کہ عرس کی تقریب ۲۰ کو ہوگی ۲۱ کو ۲۲ کو۔ سدا دن میں لوگوں سے پوچھتا پھرا کہ بھائی عرس کی تقریب کب ہوگی۔

رات کو ایک بزرگ صودت زائر مجھے پریشان حال دیکھ کر بولے ”آپ ناحق پریشان نہ ہوں۔ عرس کی تقریب ۲۰ کو بھی ہوگی ۲۱ کو بھی ۲۲ کو بھی۔ اور کچھ ہتھ نہیں شاید ۲۳ / ۲۴ کو بھی ہو۔“

میں نے کہا ”جناب بے شک عرس کی تقریبات چار ایک دن ہوتی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ختم کس روز ہو گا۔“

بزرگ مسکرائے۔ بولے ”ختم ۲۰ کو بھی ہو گا ۲۱ کو بھی ہو گا اور ۲۲ کو بھی۔“

کرتا دھرتا

یہ سن کر میں ہانکلی ہو کھلا گیا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔“

وہ بولے ”یہ ممکن تو نہیں مگر دلچ ہے۔ یہاں عرس کرنے والی چار ایک پارٹیاں

ہیں۔ ہر پارٹی کا دعویٰ ہے کہ ہم نمائندہ پارٹی ہیں۔ وہ رجسٹر آپ نے دیکھے ہی ہوں گے۔“

”رجسٹر۔“ میں نے چلا کر کہا۔ ”ہاں رجسٹر۔ جی جی اس روز حرم شریف

پر لوگ رجسٹر اٹھائے میرے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ کہتے تھے دھنسا فرما جائیں۔“

”ہاں۔۔۔ بزرگ بولے ”ہر پارٹی رجسٹرر دھکھلا کر دلتی بھرتی ہے۔ تاکہ ثبوت کے طور پر پیش کر سکے۔

”کس بات کا ثبوت۔“ میں نے پوچھا۔

”یہی کہ چونکہ اہلے رجسٹر میں زیادہ تعداد میں دھکھلا ہیں اس لئے ہم نمائندہ پارٹی ہیں۔“

”نمائندہ پارٹی حلیم کئے جانے پر کیا ہوتا ہے۔“

”بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ مسکرائے۔“

”مثلاً۔“

”مثلاً چودھری کجے جاتے ہیں۔ مرکز ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ کرتا دھرتا

بن جاتے ہیں۔ یہ کیا کم ہے۔“

”کم۔۔۔“ میں نے فقہ لدا۔ ”دیا میں بیشتر جھگڑے کرتا دھرتا بننے کی خاطر

وجود میں آتے ہیں۔ مگر صاحب۔۔۔“

”مگر کیا۔۔۔“

”اہلے ہاں تو خیر سب کو کرتا دھرتا بننے کا بخلا چڑھا ہوا ہے۔ لیکن۔ یہ تو بہت

ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔“ وہ بولے۔

”بہت میں ویسے ہی کسی اقلیت کی آواز نہیں ابھر سکتی۔ پھر مسلمان کی۔ یہاں کرتا

دھرتا بننے کے لئے آپس میں رجسٹر بازی کرتا۔“

”دیکھ لو۔“ وہ ہنسے۔

”میں نے سنا تھا مسلمان نا مساعد حالات میں کھرتے ہیں مساعد حالات میں

صیسی۔“

”غلط سنا تھا۔“ کسی نے پیچھے سے کہا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو اشفاق حسین کھڑا تھا۔

میں نے کہا ”یہ سنا تم نے۔ یہاں تو عروسوں کا کیونگا ہوا ہے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ بولا ”کسی ایک میں حاضری دے دیں گے۔“

"اونوں"۔ میں نے جواب دیا۔ "عرس میں حاضری نہیں ہوئی"۔
 "تو کیا ہوتا ہے۔ اس نے پوچھا۔

"ہلکا لگہ ہوتا ہے۔ حاضری تو ایک ذاتی چیز ہے جو فرد سے متعلق ہے، بھوم سے متعلق نہیں"۔

"قوالی تو بہر حال نہیں گے آپ"۔ بزرگ بولے۔

"قوال تو بے سرے ہوتے ہیں"۔ اشفاق حسین بولے۔

"پڑے ہوں بے سرے"۔ میں نے کہا۔ "صرف احساس حاضری کو خود پر طاری کر کے گائیں۔ بس اتنی سی بات ہے"۔

"مطلب یہ ہوا کہ تمہارا عرس پر جانا بے بھر ہو گا یہی نا"۔ اشفاق حسین نے کہا۔

"بھڑکی ہو گا"۔ میں نے جواب دیا۔

عرس کے روز تمام ڈائریں حضرت کے حوالہ پر حاضر رہے۔ صرف اشفاق حسین اور میں غیر حاضر تھے۔

تفریحات:

عرس کے بعد ڈائریں آزاد ہو گئے۔ ہر کوئی اپنی طبیعت کے مطابق مصروف ہو گیا۔

کچھ لوگ تفریح کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ جگہیں دیکھنے میں وقت گزارنے لگے۔
 معدومے چند ہندی فلموں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

پشتہ کرنے کے بعد وہ سیدھے کسی سینما ہال کا رخ کرتے۔ تین ساڑھے تین روپے ادرا کر کے ایر کنڈیشنز ہال میں جا بیٹھتے۔ ایک پر قصا موم، دوسرے بنی کئی ثقافت سے بے نیاز بیو گڈ ٹائم کی دلدادہ انجمن ہیروئیز۔ ایک ہال سے نکلے دوسرے میں جا بیٹھتے۔
 تین فلم دیکھ کر بھی پاکستان کی ایک فلم کے گیلری کٹ سے زیادہ فریج نہ آتا۔

کچھ لوگ جگہیں دیکھنے کے شوقین تھے۔ وہ صبح سویرے نکل جاتے۔ اوڑوں پر بسوں کا انتظار کرتے اور پھر ہادی ہادی جگہیں دیکھتے پھرتے۔ ہاپوں کا مقبرہ، جنتو منتر،

قطب کی لاٹ۔ جب وہ شام کو تکی حمام میں واپس پہنچے تو گھاس پر بھی ہوئی چار پائیوں پر بیٹھ کر آگرے کا تذکرہ پھینک دیتے۔

آگرہ اور مغل

”میں کہتا ہوں جی سدا تصور ہمارے لیڈروں کا ہے۔ انہوں نے کوشش ہی نہیں کی۔ ورنہ ہمیں آگرہ جانے کی اجازت ضرور ملتی“ ایک کہتا۔
 ہر مرتبہ ملتی ہے جی۔“ دوسرا ہاں میں ہاں ملاتا۔
 ”دو سال ہوئے میں آیا تھا یہاں۔ ہمیں آگرہ لے کر گئے تھے۔“
 ”اوجی لیڈروں کی بے پرواہی ہے۔ ورنہ آگرہ جانے کا پروگرام طے کرنا کیا مشکل ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ چھوٹی دائرہ می دلا کہیں سے آ نکلا۔ ”آگرے کی اجازت کا کانڈ پیچھے سے ہی اپنی شیٹ نہیں ہوا۔ اب سفارت کا دفتر کیا کر سکتا ہے بھلا۔“
 چھوٹی دائرہ می دلا تو جوان ہمارے لئے ایک معرہ تھا۔ وہ ایک بے چین جوان تھا۔ حرکت مسلسل حرکت اس کے لئے زندگی تھی۔ قیام سوت۔ وہ ابھی یہاں ہوتا ابھی وہاں جا پہنچتا۔ ابھی ادھر ہوتا پھر جو دیکھتے تو ادھر کھڑا ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر بات سے متعلق ہر تفصیل سے واقف تھا۔

”بہر حال ایسیسے والے کوشش کر رہے ہیں کہ آگرہ کی اجازت مل جائے۔“

”یہ بات تو لیڈروں کو پہلے سے طے کر لینی چاہئے تھی۔“

”ہناؤ بھئی صاحب۔ لیڈر ان کرام کو اتنی فرصت کدیں۔“

”کیوں وہ کیا بنگی پر جتے ہوئے ہیں جو فرصت نہیں ملتی۔“

”ہاں بنگی پر جتے ہوئے ہیں۔“

”کون سی بنگی ذرا ہمیں بھی پتہ چلے۔“

”دعوت کی بنگی۔“

”دعوت کی بنگی۔ کیا مطلب۔“ بھی بولنے۔

”آج اور دعوت ہے۔ کل اور چائے ہے۔ کبھی نکلی کے ہاں کبھی بکراہی کے ہاں، کبھی خاگانی کے ہاں۔ انہیں آگرہ جانے کی طلب نہیں۔“

”واہ کیا جگہ ہے آگرہ۔ کھلی سرجہ ہم گئے تھے۔ دیکھ کر ہی خوش ہو گیا۔“

”اوسوں۔ اب وہ ہات نہیں رہی۔ لرو گرد کار خانے ہوا کر بھلت سرکار نے برہاد کر دیا۔“

”کیا مطلب۔“

”بھی جنہوں سے دھوئیں اٹھتے ہیں۔ دودھ سبک سرسودھ لایا چارہ ہے۔ وہ چمک نہیں رہی۔“

”یار ہم بھی گئے تھے۔ وہاں سدا گائیڈ مل گیا۔ زبردستی ساتھ ہو لیا۔ بات بات پر مغلوں کی سزا کرتا رہا۔ عیاش تھے، شرابی تھے، غلطے تھے۔“

”منہ پر ایک تھپڑ دیا ہوتا۔“

”چلو مانا کہ بھی کچھ تھے لیکن دیکھو تو کہتے بڑے بلڈرز تھے۔“

”یار دیکھو بھائی جو قہیر کے حوالے ہوتے ہیں وہ بناتے ہیں توڑتے نہیں۔“

”دیکھو بھئی کے دیتے ہیں ہم تو جانیں گے۔ آگرہ دیکھ کر رہیں گے۔“

”جاذ گے کیسے۔“

”بس میں بیٹھ کر۔“

”اور جو پکڑے گئے تو۔“

”ہمیں کون پکڑتا ہے جی۔ جس نے جانا ہو ہمارے ساتھ چلے۔ منع جائیں گے۔ شام کو لوٹ آئیں گے۔“

”اوسوں۔ ایسا نہ کرنا۔“ چھوٹی دلازمی دلا بولا۔ ”ایسیسے والے اجازت لے رہے ہیں۔ انشاء اللہ بھی جائیں گے۔“

”ایسیسے والے۔“ ایک نے قہر لگایا۔ ”ایسیسے والوں پر امید نہ رکھو۔ وہ تو بس بیٹھ رہتا چاہتے ہیں۔ کرنا کرتا نہیں۔ اگر ہمارے ایسیسے کام کے ہوتے تو پھر سمندر پار بسنے والے سکھ نہ ہوتے۔“

”میں بھائی تمہیں علم میں۔ ایسیسے والے بڑے باخبر ہیں۔“

"تو انہیں پتہ ہے کہ نوے زائرین کو انہوں نے تنگی حمام میں لاکر بند کر رکھا ہے۔ اندر خود جلتا ہے باہر کھیلوں کی بادش ہوئی ہے۔

"ضمیں ضیں۔ ضیں ضیں کھل ایمیڈیٹ خود آ رہے ہیں یہاں زائرین سے ملنے۔" چھوٹی دائرہ دلا بولا۔

"ساتھ فوٹو گراف لائیں گے نا۔"

اس پر ایک قہقہہ ہلکا ہوتا۔

شاہنگ

زائرین کی سب سے بڑی دلچسپی شاہنگ کی تھی۔ ہر آدمی شاہنگ میں مصروف تھا۔ شدت سے مصروف تھا۔ عام طور پر شاہنگ کے لئے زائرین کے گروپ بنے ہوئے تھے جو اپنے مل کر شاہنگ کرتے تھے۔ اور پھر شام کو تنگی حمام میں پہنچ کر اپنی اپنی چیزوں کی برسرعام نمائش کرتے تھے۔

ذرا دیکھو تو کیا لایا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ سینٹو جننا داس کا دل چیر کر لے آیا ہوں۔ ہاں یہ دیکھو جناب یہ اصلی کشمیری شل ہے۔ ذرا کڑھائی دیکھو۔ دو ہزار کی چیز پانچ سو میں مل لایا ہوں۔ سینٹو گھر جا کر ذرا دقت ظاہر نہ دیا تو میرا دم۔ ہم نے سالے کی مت بد لی۔

دوسرا گروپ بولا۔ ذرا یہ ساڑھی دیکھو مائیں بھڑی ہے اور یہ کڑھائی کا سماں۔ وہ سودا کیا ہے کہ جواب ضیں سینٹو پانچ ہزار سے چلا تھا۔ سواد ہزار پر لے آئے اسے۔ اس کی بولتی بند کر دی ہم نے بھی۔ ہم چاہتے تھے اور وہ اکیلا۔ چٹکتا ہی رہ گیا مبالغہ اتنے پر تو ضیں گھر نہیں چڑی۔

چند ایک زائر ایسے تھے جو اکیلے میں شاہنگ کر رہے تھے۔ وہ اپنی چیزوں کی نمائش ضیں کرتے تھے۔ الٹا چیز کو یوں چھپا چھپا کر رکھتے کہ کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔

اشفاق اور میری چار پائیوں کے ساتھ ہی ایک پشمان کی چار پائی تھی۔ وہ بد بد چار پائی کے تھے جہاں تک کہ سلمان جوں کا توں قائم ہے! یا ضیں۔

سلمان کو محفوظ دیکھ کر وہ آپ ہی آپ مسکراتا۔

باہر سے واپس آتا تو اندر داخل ہوتے ہی جھک کر چار پائی کے تلے جھانکتا تھا۔
 دونوں بھائی سوٹ کیس باہر سمجھ کر ان کے تالے آڑنا کہہ کھلے تو نہیں۔
 جب بھی تکی حمام میں بیٹھ کر ہوتی یا لوگ باہر نکلے ہوتے یا مصروف ہوتے تو وہ
 لوٹ بنا کر سوٹ کیس باہر نکالتا۔ چیزیں ایک ایک کر کے دیکھتا انہیں از سر نو دہ کر کے
 قرینے سے لگاتا۔

سلمان کو دیکھنا۔ اسے اتھنا پاتھنا از سر نو دہ کرنا، قرینے سے سوٹ کیس میں رکھنا
 اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ نہ اسے فلم دیکھنے کی آرزو تھی نہ جگمگ دیکھنے کی۔ اگر وہ
 جانے کے خواہش پر اس نے کبھی زبان نہ ہلائی تھی۔ ویسے بھی وہ خاموش طبیعت فرد تھا۔
 اس نے ہم سے کبھی بات نہ کی تھی۔ نہ ہی باہر درختوں تلے بیٹھی ٹیلیوں میں حصہ لیا تھا۔
 اسے دیکھ کر مجھے بیٹھ وہ دولڈ گریٹ بکچر یاد آ جاتی۔
 ایک اوجیز عمر کا آدمی۔ گردن جھکی ہوئی۔ کمر پر بوجھ اور درد گرد دیرانی ہی
 دیرانی۔ تصویر کے نیچے کچھشن میں لکھا تھا۔

FOR HE HAD GREAT POSSESSIONS

رقم

شاہک کی فرمائش کے دوران ہال میں رقم کی بات چل رہی تھی۔
 کوئی پوچھتا "یار تم اتنی رقم کیسے لے آئے۔"
 "تم لوگ نہیں" ایک آنکھیں چمکا کر جواب دیتا۔ "ہم اپنے ساتھ ایک روپیہ
 نہیں لائے جب روانہ ہوئے تھے تو دس روپے کا نوٹ جیب میں تھا قلیوں کو دینے کے
 لئے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔"

"پھر یہ اتنا سلمان کیسے خرید لیا۔"
 "بس جی ہم جب بھی آتے ہیں ایک ہڈی ساتھ لے آتے ہیں دس میں بڑا لڑکی۔
 جتنے پیسے کی ضرورت پڑی لے لیا۔"
 دوسرے بولتے۔ "ہم تو ہڈی بھی نہیں لاتے۔ اپنا کاروبار ہے لالہ اور پرہیز
 دیال کے ساتھ جتنا پیسہ مرضی ہے لے لیں۔"

تیسرا بولڈ "اپنا تو لاو حریجی ہے دلی میں آکر اسے لسٹ بنا کر دے دیجئے ہیں۔ خود ہی ساری چیزیں خرید کر دیتا ہے۔ اپنی نہ ہنگ لگے نہ پھگری۔"

ایک اور صاحب بڑے فخر سے کہتے "بھئی اپنے دو بیٹے ہیں دوہی میں۔ سینے کے سینے ہزاروں روپے بھیجتے ہیں اور سلمان کا تو کچھ پوچھو نا۔ از خود بھیجتے رہتے ہیں۔ ہم روکتے ہیں پھر بھی بھیجے جاتے ہیں۔ انہیں پتہ چلا کہ ابا ہند جا رہے ہیں۔ تو اپنے بنگ کو لکھ دیا کہ ابا کو ہند کی برانچ سے جو وہ مانگیں بھجوا دیا جائے۔ پانچ ہزار لکھوا چکا ہوں آج تک وہ تو دس دے رہے تھے۔ میں نے منع کر دیا۔"

سارے ہال میں صرف دو زائر ایسے تھے جو سلمان سے لا تعلق تھے۔ ایک اشفاق حسین اور دوسرے میں۔

ہند لوٹ

قیام کے تیسرے روز جب ہم دونوں کتابوں کے کھٹے اٹھا کر سیکڑٹ کیپ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے سیکورٹی والوں کی آنکھیں اٹل آئیں۔ انہوں نے لمبی نظروں سے ہمارا جائزہ لیا۔ پہلے تو حیرت سے چہرے مسخ ہو گئے۔ پھر مسکرائیں انہیں ابھریں اور بالآخر کھی کھی کھی کی دلی دلی ہنسی سنائی دی۔

حکام انہوں نے سوچا کہ یہ کون پاگل ہیں جو چیزوں کی بجائے کتابیں خرید کر لاتے ہیں۔ احقر کیس کے۔ پھر شاید انہیں خیال آیا ہو کہ ان کتابوں کی نوعیت کے بارے میں جتنا اشد ضروری ہے۔

سیکورٹی سے گزر کر جب ہم پولیس پوسٹ پر پہنچے تو سارے سپاہی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "بھگوان یہ کیا کتابوں کے بنڈل۔"

اپنی جگہوں پر پہنچ کر ہم نے کتابوں کے بنڈل اونچی جگہ پہنچ پر رکھ دیئے۔ اس پر ہال والوں نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا۔

ایک صاحب دور سے چلائے "شاپنگ کر کے آئے ہیں۔"

"جی۔" اشفاق نے کہا۔ "یوں کچھ لو کہ ہند کو لوٹ کر لے آئے ہیں۔"

یہ سن کر پولیس پوسٹ والوں کی توجہ اپنی بددقت کی طرف متعطف ہو گئی۔

”یہ کون سی دوا ہے صداج۔“ ایک نے اندر بھاٹک کر پوچھا۔
 ”صداج یہ ہندی دوا ہے۔“ اشفاق نے جواب دیا۔
 ”ہندی کی کتابیں ہیں یہ۔ کیوں صداج۔“
 ”نہیں صداج۔“ اشفاق بولا ”انگریزی کی کتابیں ہیں۔“
 اس پر وہ بوکھلا گئے۔

ایک ڈاکٹر چٹا ”آپ تو کہتے ہیں ہندو کو لوٹ لائے ہیں۔“
 ”ہا۔ لوٹ لائے ہیں۔ محمود غزنوی نے کیا لوٹا ہو گا۔“ اشفاق حسین اپنی طرف
 سے حراج پیدا کر رہا تھا لیکن پولیس والوں کی جان پر بنی تھی۔
 پولیس کا حوالدار جو دیکھنے میں حوالدار تو کیا سپاہی بھی نہیں لگتا تھا، ڈرتے ڈرتے اندر
 داخل ہوا۔ کبھی وہ کتابوں کے بندلوں کی طرف دیکھتا کبھی ہٹری طرف۔ آخر میں بولا
 ”صداج یہ لوٹ کا بل تو مست کم دکھتا ہے۔“

”خاص سونا پیش کم دکھتا ہے۔“ اشفاق حسین بولا۔ ”پر ہوتا انمول ہے۔ یہ
 کتابیں نہیں ہندوؤں کی بدھی ہے۔ عقل ہے۔ دانش ہے۔ ان کتابوں میں ہندوؤں کی
 دانش ہے۔“

حوالدار اس دٹا میں کتابوں کے بندل تک جا پہنچا تھا۔ اس نے دو ایک کتابوں کے
 نام پڑھے۔ ذہن سے لکرو پریشانی کے بادل چھٹ گئے۔ چہرے پر یوں مسکراہٹ پھوٹی
 جیسے چھپلے ہر بھرتی ہے۔ کہنے لگا ”صداج یہ تو ہومیو پتھی کی کتابیں ہیں۔“
 ”ہاں ہومیو پتھی کی کتابیں ہیں جیسی تو انمول ہیں۔“ اشفاق حسین نے جواب
 دیا۔

”یہ کتابیں ادھر پاکستان نہیں نہیں ملتیں کیا۔“
 ”ادھر پاکستان میں انگریزوں کی لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ جرمنوں کی لکھی ہوئی ملتی ہیں۔
 ہندوؤں کی لکھی ہوئیں نہیں ملتیں۔“

”ہندو انگریزوں سے ابھی لکھتے ہیں صداج۔“
 ”یورپی اپنے اپنے ملک کے تجربات لکھتے ہیں۔ وہ ہمارے جیسے ملک نہیں ان کی
 باتیں ہم پر نہیں ڈھکتیں۔ ہندو لکھنے والوں کی باتیں ہم پر تو ملتی ہیں۔“ اشفاق حسین نے

کہا۔

”اچھا صداج۔“ حوالدار کی گروں فخر سے اُتر گئی۔

”جس روز سے ہم کتابیں خرید کر لائے تھے دائرین کی نگاہ سے گر گئے تھے۔

سیکوریٹی کی نگاہ سے گر گئے تھے۔

دوکاندار خریدار

جب دائرین بازار سے سالان کی گھڑیاں خرید کر لاتے تو سیکوریٹی والے نیچی نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتے۔

عالم انہیں خوشی ہوتی کہ اتنے سارے خریدار ہند میں آ گئے ہیں۔

اگر حکومت ہند کو بھی یہ احساس ہوتا تو حالات قطعی طور پر مختلف ہوتے۔

پتہ نہیں ہندو کے ذہن پر کیوں پردہ پڑ گیا۔ حالانکہ ہندو ایک بہت سمجھدار اور زیرک قوم ہے۔

جب پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو گیا تو ہندو سمجھا کہ لٹیاؤب گئی۔ گلاب کے پھول میں کانٹا لگ گیا۔ ٹھنڈے ہند میں جھول پڑ گیا۔ اس کے دل میں صدیوں کی نفرت حقارت اور دبے غصے کا پھوڑا پھوٹ نکلا۔

اس نے کہا میں ایسا نہیں ہو گا۔ جلاؤ، کاٹ دو، بھس کر دو۔ وہ سمجھتے تھے کہ جس روز تقسیم کی کیر کھینچ دی گئی۔ بس اس روز پاکستان وجود میں آ جائے گا۔

نہ صداج۔ کبھی کبھی کھینچنے سے ٹک بن جاتے ہیں۔ پاکستان کبیر نے نہیں بنایا۔ تقسیم نے نہیں بنایا بلکہ ہندو کے غم و غصے اور انتہائی جذبے نے بنایا ہے۔

پاکستان کا استحکام

اگر تقسیم سے پہلے ہندو منظم طور پر مسلم کشی کی تحریک نہ چلاتے تو جنگ پاکستان کی کیر وجود میں آ جاتی لیکن وہ ایک بے جان کیر ہوتی۔ اس میں وہ نہرتا جو دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتا۔

ہندو میں بہت سی خصوصیات ہیں مثلاً ہندو کاروبار کرنا جانتا ہے۔ اس نے تقسیم نے نہیں بنایا بلکہ ہندو کے غم و غصے اور انتہائی جذبے نے بنایا ہے۔

میں بزنس انگریزی ہے۔ وہ مصنوعات پروڈیوس کرنا جانتا ہے۔ وہ بیچنا جانتا ہے۔ اس کے برعکس مسلمان صرف خریدنا جانتا ہے۔ نہ پروڈیوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے نہ بیچنے کی۔ جو منافع کی ہوس سے افتاد سرشار ہو جائے کہ اندھا ہوا جائے تو جان لو کہ وہ بیچنے کے فن سے کورا ہے۔ جس میں صبر و تحمل نہ ہو مجرمانہ ہو وہ بیچنے کے فن سے محروم ہے۔

اگر ہندو تشدد اور انتقام سے کام نہ لیتا تو بے شک تقسیم کی ٹیکر پڑ جاتی مگر ہندو اس طرح بیچتا۔ مسلمان خریدتا۔ ہندو پروڈیوس کرتا۔ مسلمان کنزیوم کرتا۔ ہندو مایہو بھی جاتا۔ مسلمان خریدار۔ یہ تعلق تقسیم کے باوجود قائم رہتا۔ روز بروز بڑھتا۔ حتیٰ کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو جاتے۔

سیدھی سی بات تھی جو ہندو کو یقینی طور پر سمجھل چاہئے تھی۔ لیکن ٹھہریے شاید قدرت کو منظور تھا کہ پاکستان قائم ہو جائے۔ اور استحکام حاصل کر لے اس لئے شاید اس نے ہندو کی عقل پر پردہ ڈال دیا ہو۔ اسے تشدد پر آمادہ کر دیا ہو۔ حالانکہ تشدد ہندو کی سرشت میں نہیں۔ وہ صرف افریق و تفریق جانتا ہے جسملنی تشدد نہیں۔ شاید پاکستان کے قیام کو چاہتہ ذکر کرنے کے لئے ہندو کو کشمیر پر غاصبات قبضہ کرنے پر مائل کیا گیا ہو۔

یہ جو آئے دن ہندو میں مسلم کش فسادات ہوتے رہتے ہیں شاید یہ اس لئے ہوں کہ پاکستان کے قیام میں سینٹ لگتا رہے۔

حیرت کی بات ہے کہ آج تک ہندو اس بات کو نہیں سمجھا کہ مسلمانوں کے خلاف فہم و دھیمے کے اقدامات پاکستان کو تقویت دے رہے ہیں۔ ہندو کو کمزور کر رہے ہیں۔ اللہ کے کاسوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ اگر لاکھوں مسلمانوں کو صرف اس لئے تہہ تنجا کر دیا جائے کہ وہ اللہ کا نام لیتے ہیں تو جس کا وہ نام لیتے ہیں اسے ضرور دھچکا لگتا ہے۔ اگر رام کا نام لینے والوں کو صرف اس لئے موٹی گاڑی طرح بھٹ دیا جائے تو رام کو یقیناً ناگوار گزرے گا۔

مدارج آپ تو بہت ذہین لوگ ہیں پھر اتنی سی بات کیوں نہیں سمجھتے آپ کی مسلمان اور پاکستان دشمنی پاکستان کے لئے باعث تقویت ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے استحکام کا باعث بنتی جا رہی ہے۔ اور ہندو کے اندر کاکینہ اور نفرت طود اسے ہی کھوکھلا کئے جا رہے ہیں۔

نبی سار

وہ محترمہ جس نے ہمیں نبی سار کی فرمائش کی تھی بڑی باعزت خاتون تھی۔ ساتھ ہی وہ عمر رسیدہ تھی۔ شاید عمر زیادہ نہ ہو لیکن انداز میں عمر رسیدگی تھی اور وہ تمام خواہش موجود تھے جو عمر رسیدگی سے انسان میں پیدا ہوتے ہیں۔ تحمل، دھما، طمران، دانش۔ ان کی رہائی ہم نے پہلی مرتبہ نبی سار کا نام سنا۔

دوا گلاس

خاتون نے کہا ”آپ دلی چارہ ہیں۔ ہو سکے تو وہاں سے نبی سار کے دو گلاس لے آئیں۔“

”وہ کیا ہوتا ہے نبی سار۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”نبی سار کے گلاس ہوتے ہیں۔“ محترمہ نے جواب دیا۔

”کھلونہ گلاس۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”میں نہیں۔“ محترمہ مسکرائی۔ ”کھلونہ گلاس لے کر میں کیا کروں گی۔ وہ

گلاس دراصل دوا ہیں۔“

”گلاس دوا ہیں“ اشفاق ہنستا گیا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”یہ گلاس ذیابیطس کے لئے بہت مفید ہے۔ رات کو گلاس

میں پانی بھر رکھو۔ صبح سویرے خمار منہ پانی پی لو تو ذیابیطس کے لئے بہت فائدہ مند ہوتا

ہے۔ "

"اچھا جی۔" اشفاق حسین نے حیرت سے پوچھا۔

"آؤ مسودہ ہے۔" وہ بولی۔

"خوب۔ لیکن یہ گلاس ملیں گے کہاں۔"

"دلی میں بنی سار گلاس کو بھی جانتے ہیں۔ آپ کسے بنی سار کا گلاس چاہئے۔ وہ بتا دیں گے۔ بس دو گلاس خرید لائیے۔"

اتنا چاہتے تھے میں مجھ سے بڑا حق شاید روئے زمین پر ملنا محال ہو گا۔ پتہ نہیں اتنا چاہتے وقت میں اتنا بے صبر کیوں ہو جاتا ہوں۔

اس وقت جب محترمہ نے کہا کہ بنی سار کو دلی میں بھی جانتے ہیں۔ تو مجھے خیال آیا کہ بنی سار ضرور امرت و حمار اقسام کی چیز ہو گی۔ پوچھیں گے تو راہ چلتے لوٹ رک جائیں گے۔ کہیں گے بنی سار۔ ہاں ہاں سیدھے چلے جائیں۔ پتہ۔ سے ہائیں ہاتھ مڑ جائیں۔ آگے بنی سار بازار ہے۔ سارے بازار میں بنی سار کے گلاس بچے ہوئے ہیں۔ جو نہا پسند آئے خرید لیجئے۔

ویسے بنی سار کا نام سن کر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی نیا سی قسم کی چیز ہو جو بد میں چلی کی پھاڑیوں میں اگتی ہو۔ لیکن ہے اس بوٹی پر پھولوں کی جگہ گلاس لگتے توں جنہیں نیا سی قوت کر لے آتے ہوں اور سر راہ مجمع لگا کر بیچتے ہوں جیسے بھرے ہاں عوام مردی کی دوائیاں بیچ جاتی ہیں۔

کوئی بات بھی تو ہو

دلی پہنچ کر پہلے روز ہی ہم نے اقبل ہوٹل میں ناشتہ کرتے ہوئے ہوٹل والے سے پوچھا "کیوں بھی یہ بتائیے کہ یہاں دلی میں بنی سار کہاں ملے گا۔"

"بنی سار۔" ہوٹل والے نے دہرایا۔

"اس پر بھی لوگ جو ہوٹل میں بیٹھے تھے ان کے کان کھڑے ہو گئے۔" بنی

سار۔ "وہ گنگائے۔"

"کیوں میر صاحب۔" ہوٹل والا چلا کر بولا۔ "بنی سار پتہ سے کہ

یکہ۔ ”

”میر صاحب نے سر اٹھایا۔ بولے ”اچھا بے جی سدا۔۔۔ ہوں نیکی سدا“ اور پھر چپ ہو گئے۔

ان کے انداز سے ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ نیکی سدا کے جملہ رموز و اسرار سے واقف ہوں۔

میر صاحب کے پیچھے بیٹھے ہوئے ہم صاحب بولے ”ہاں ہاں نیکی سدا ہم اس لفظ سے خاصے باتیں ہیں۔ اگرچہ یاد نہیں آ رہا اس وقت لیکن ہم نیکی سدا سے اچھی طرح واقف معلوم پڑتے ہیں۔“

ہم صاحب کے پہلو میں ٹیک دیا چلا تو جوان بولا۔ ”اقبال بھائی پریشانی کی بات نہیں۔ نوری ابھی آئیں گے ان سے پوچھ لیٹا۔ دلی کی کوئی چیز ہو اور نوری نہ جانے یہ نہیں ہو سکتا۔ نوری سے کوئی چیز چھپی نہیں۔ ہاں۔۔۔“

”ابو صاحب۔۔۔“ پھر وہ ہم سے مخاطب ہوئے ”گھبراہٹ نہیں ابھی نوری آئے گا دھر ہوٹل میں۔ اس سے ساری انفارمیشن لے لیں گے۔ آپ شرم کو کھانا کھانے آئیں تو ہم سے ساری معلومات لے لیں۔ بلکہ بہتر ہے گا کہ آپ آرڈر دے دیں۔ گلاس یہاں پہنچ جائیں گے ہوٹل میں۔ آپ کہاں خراب ہوتے پھریں گے یہاں دلی میں۔ کوئی بات بھی ہو۔“

”واہ کیا بات کی ہے۔“ ہم صاحب بولے ”بائل مناسبت۔“

میر صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ہاں یہاں آرڈر لے لو۔ یہی مناسب ہے۔“

”آرڈر ہی لیں گے۔“ ہوٹل والے نے کہا۔

میں نے سوچا واہ کیا اتنا جتنا تھا محترمہ نے۔ واقعی یہاں تو یہی نیکی سدا کو جاننے ہیں۔ چلو یہ فریضہ بھی ادا ہوا۔ کچھ لو کہ نیکی سدا کی فرمائش پوری ہو گئی۔

ترکی حمام اور کھیاں

اسی روز شرم کے وقت ہم کیمپ کے ہاں سے باہر گھاس پر بیٹھے کھیاں اڑانے کے

قتل میں مصروف تھے کہ نبی سدا کی بات چل نکلی۔

وہ کیمپ ہال دراصل قہیڑ ہال تھا۔ جو اس لئے بنایا گیا تھا تاکہ رات کے وقت اس میں کھیل دکھایا جائے۔

وہ ہال دن کے وقت استعمال کے قابل نہ تھا خصوصاً گرمیوں میں۔ ان دنوں دلی میں سخت گرمی تھی۔ ہوا مستقل طور پر بند تھی۔ وہ پینڈا مثل فین جو ہال میں عارضی طور پر فٹ کئے گئے تھے مکھوٹنے والے پتھے نہ تھے۔

صبح نو بجے تک ہال کی آب و ہوا خاصی اطمینان بخش ہوتی۔ پھر آہستہ آہستہ سورج اوپر آتا تو فین کی چھت گرم ہونا شروع ہو جاتی۔ گیلدہ بارہ بجے تک چھت سے گرمی کے ہبھکا کے نکلنے شروع ہو جاتے۔ تین بجے وہ ہال ترکی حمام میں بدل جاتا اور یہ کیفیت رات کے آٹھ بجے تک قائم رہتی۔

اس ترکی حمام کا ایک فائدہ ضرور تھا۔ دوپہر سے پہلے ہی لوگ ہال کو چھوڑ کر باہر درختوں کی چھوٹیوں میں آ بیٹھتے۔ یہں مجبوری کے تحت میل جول کا سلسلہ قائم ہو جاتا۔ باہر کوئی پکھانہ تھا۔ اندر کے پتھے دن کے وقت ہوا چلانے کے بجائے چھت کے فین کی گرمی کو سارے ہال میں پھیلاتے رہتے تھے۔

باہر گھاس پر چھت کے فین کی حدت تو نہ تھی لیکن وہاں لا تعداد کھیاں تھیں۔ سبھ میں فینیں آتا تھا کہ کھلے میدان میں صاف ستھرے گھاس میں کھیاں کیوں تھیں۔ نہ وہاں کھانے پینے کا سامان تھا نہ گندگی۔ اس کے باوجود وہاں کھیموں کی یوں پادش ہوئی تھی جیسے دلی میں کھیموں کی چراچونگی ہو۔ اس لئے لوگ ہاتھ کا پکھلا، اخیار کا کاغذ، کاپی یا کوئی اور چیز چلانے پر مجبور ہوتے چلائے جاتے پھر بھی بھن بھن کا جل ترنگ بےگے جاتا۔

اشفاق حسین اور میں ہال کے پرلے کونے میں مقیم تھے۔ یہ جگہ سٹیج کے قریب تھی۔ سٹیج کے پہلو میں قہیڑ کا گرین روم تھا۔ گرین روم میں پولیس کی نگہداشت رہتی تھی۔ پولیس کے کل چھ سات سپاہی تھے جو سدا دن ترکی حمام سے بچنے کے لئے باہر نکلیں چھوٹیوں میں چارپائیوں پر بیٹھ کر کھیاں اڑاتے رہتے۔ پھر رات کے نو بجے برآمدے میں جا بیٹھتے۔

ہوٹل سے نبی سدا کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بعد جب ہم ترکی حمام

میں پہنچے تو باہر گھاس پر سپاریوں کے پاس جا بیٹھتے۔
وہاں کھیاں اڑاتے اڑاتے پتے نہیں اٹھاتے کو کیا سوچتی کہ اس نے نیچی سدا کا تذکرہ
پھینک دیا۔

"نیچی سدا" ایک سپاری نے حیرت سے کہا۔ "نہ سدا اچ ہم نے تو آج تک یہ
نام نہیں سنا۔"

باقی سپاریوں کے بھی منہ حیرت سے کھلے تھے۔ "نیچی سدا۔"
میں نے وضاحت کرنے کے لئے کہا "یاد کوئی شیا ہی چیز ہے۔"
سپاری سوچ میں پڑ گئے۔

ایک ہوا "نہ سدا اچ ہمارے قہانے کے پاس ہی شیا ہی کا ڈاڑا ہے۔ وہاں ایسی کوئی
چیز نہیں۔"
سب نے اس کی بات میں بات ملائی۔

بے خبر باخبر

"داو۔" میں نے سوچا۔ یہ آبی کے بندہ کہتے بے خبر ہیں کہ بندہ سناہوں کی چیز
سے بھی واقف نہیں۔ وہ اقبال ہونٹل کے مسلمان کہتے باخبر ہیں۔ ہر کسی کو نیچی سدا کا نام
کس قدر مانوس لگا تھا۔ انہوں نے میں نام لیا تھا جیسے نیچی سدا روز مردہ کے برتنے کی چیز
ہو۔

"بس رات کو ہونٹل میں جانے کی دیر ہے۔" میں نے سوچا۔ نوری صاحب
میری اطلاعات دے گئے ہوں گے۔ صرف آرڈر دینے کی بات ہوگی۔ سو دسے دیں
گے۔ چلو بہت شرم ہوئی۔

رات کو پ۔ ہم اقبال ہونٹل کھانے کھانے کے لئے گئے تو پتہ چلا کہ نوری صاحب
کسی وجہ سے نہیں آئے۔

اگلے دن جب ہم ہونٹل میں پہنچے تو اتفاق سے نوری صاحب وہیں بیٹھے تھے۔ وہ ایک
اوپر عمر کا آدمی تھا۔ بہت سی چاق و چوبند۔ تیز اٹھا کہ بندہ بندہ قصص تھا اور گفتگو اتنی رواں
جیسے منہ میں زبان کی جگہ قہقہی لگی ہوئی ہو۔

میں دیکھ کر فوری صاحب کا۔ ”ہاں، بس اب اقبال کے سب چھوٹا، یا سب۔ ہاں ہاں بیٹی سار۔ مطلب ہے کہ ان گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں مل جائے گا۔ آپ کو کتنے چاہیں۔ ایک درجن سے کم کیا ہو گا۔ سوغات کے طور پر لے کر جانے ہیں نا۔ ہو جائے گا انتظام۔“

فوری صاحب کو دیکھ کر میں بہت چل گیا کہ پوچھ بچھ کے بغیر بات نہیں بنے گی۔ پھر تو ہم نے ہر دو چنے شخص سے پوچھنا شروع کر دیا۔

”صدا اچ آپ کو بیٹی سار کا پتا ہے۔“

”جناب بیٹی سار کہیں سے ملے گا۔“

بیٹی سار بیٹی سار بیٹی سار۔

سارنی دلی ہند سے بیٹی سار سے گونج اٹھی۔

ہم پر بیٹی سار ایسا سوار ہوا کہ ہم اپنی سدا بدھ کھو بیٹھے۔

بیماسکھیاں

در اصل ہم دونوں کا آپس میں اتفاق نہ تھا۔ ہومیو پتھی کا دروازہ ہونے کے بعد، اتفاق حسین پیدا لکھی طور پر ایک ایم بی بی ایس ہے۔ اس پر عقل اور سائنسی رویہ اس حد تک سوار ہے کہ ان دونوں بیماسکھیوں کا سدا لئے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ روز ہومیو پتھی کے مغزات دیکھتا ہے، من پر تلی بھاتا ہے۔ لگے کہ بڑی طرح چھاتی نکال کر چلتا ہے۔ اپنی زبان سے کہتا ہے، دیکھا ہومیو پتھی کا مغز۔ اس کے باوجود وہ مغزوں پر یقین نہیں رکھتا۔ جب تک کوئی بات سونی صد سائنٹفک نہ ہو وہ اس سے متاثر نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس عقل اور تجویز پر میرا بھروسہ ٹوٹ چکا ہے۔ جب تک میں نے زندگی برٹینڈرسل کے سیکھے سزم سے شروع کی تھی۔ جوانی میں عقل اور ویل کی دکان کی بھاتا رہا۔ لیکن اب نہ عقل پر بھروسہ ہے نہ سائنسی رویہ ہے۔

میرا خیال تھا کہ بیٹی سار کے متعلق ویڈیو سے پوچھو۔ دنیا سبوں سے پوچھو۔ نوکے مانے والوں سے پوچھو۔ بازار میں درنی بچھا کر قوت مردی کی گولیاں بیچنے والوں سے

پوچھو۔

اشفاق حسین کا خیال تھا کہ میں ان لوگوں سے پوچھو جو جانتے ہیں۔ سمجھتے ہیں۔ صاحب فکر ہیں۔ ڈاکٹروں سے پوچھو۔ تحقیق کرنے والوں سے پوچھو۔ ذہین اور کمر سے پوچھنا بے کار ہے۔

نتیجہ یہ تھا کہ وہ سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگوں سے پوچھتا تھا۔ میں دہقانی قسم کے عام لوگوں سے پوچھتا پھرتا تھا۔

دوبی دنوں میں سدری دلی بھری پوچھ بگم کی لیٹ میں آگئی۔ لیکن کہیں سے امید کی کرن نہ پھوٹی۔

ایک دن چلتے چلتے ہم دریا منچ میں بھٹاری کی دکان کے قریب سے گزر رہے تھے کہ اشفاق حسین بولا "ٹھہریا کیوں ناہم بھٹاری کی دکان سے پوچھیں۔"

اشفاق حسین کو دیکھ کر دوکان کی سدری سیل گر لڑا کھٹی ہو گئیں۔ اشفاق حسین کی بات سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ "بیٹی سدر۔" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر اوشا تشدد کر رہی۔ بولی "جا کر کسی سادھو سے پوچھئے۔ ہم نے تو ایسی بوٹی کا نام تک نہیں سنا۔"

"میں سمجھا شاید بھٹاری جی نے اسے پوچھنا کر لیا ہو۔" اشفاق حسین بولا

"اچھا۔" ایک بولی۔ "بیٹی سدر کسی دوا کا نام ہے کیا۔"

"بھڑکی لیک بوٹی ہے۔" اشفاق حسین کہا "جو شکر کی بھری میں بڑی منید ہے۔"

"منید بوٹیاں ہمارے کام کی نہیں۔" اوشا نے کہا "ہم تو ان بوٹیوں میں اٹریسٹ ہیں جو بیماریاں پیدا کریں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ پوچھنا تو وہی ہو سکتی ہیں جو بیماری پیدا کریں۔" اشفاق حسین کہتا ہوا۔

ایک معزز لالہ جی جو اس دوران میں دوکان میں داخل ہو چکے تھے۔ بولے "بوٹی کی تلاش ہے تو کسی آپرودیک مشور میں جا کر پوچھئے۔"

یہاں سے ہماری تلاش کو ایک نئی سمت مل گئی۔ ہم نے نیلی ساری کی پوچھ چھوڑ کر آپر ویڈیو دوکانوں کی پوچھ شروع کر دی۔

آپر ویڈیو کی پہلی ہی دوکان پر ویڈیو صاحب بولے ”میدل ایج نام تو سنا ہے نیلی سار کا لیکن اس کے بارے میں اتنا پتا معلوم نہیں۔“

قیصری دوکان پر ایک معزز ہندو بیٹھے تھے۔ بولے ”دیکھئے اگر نیلی سار کا گلاس ہوتا ہے تو آپ کسی لاپور ریم سے پوچھیں۔ ہند کے ہر علاقے کے لاپور ریم نئی دلی میں ملیں گے وہاں سے اتنا پتا مل جائے گا۔“

جسم اور ذہن

”لاپور ریم کے لئے تو نئی دلی جانا پڑے گا۔“ میں نے اشفاق حسین سے کہا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ظاہر تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اشفاق حسین کی ہمت پر حیران تھا۔ وہ ایک بیمار آدمی تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے بستری پر تھا۔ اس کے جسم اور ذہن میں چھ ماہ سے مسلسل لڑائی ہو رہی تھی۔

اس کا جسم بے حد سخت جان ہے۔ ذہن بے حد آرام پسند ہے۔ ایک کھدر ہے دوسرا ٹھنڈ۔ دونوں کی جھج جھج جھک جھک لگی رہتی ہے۔ جسم کتا ہے لے ہوئی میں اٹھنے لگا۔

ذہن کتا ہے اونٹوں۔ احمق ابھی حیرے کھٹے کھڑور ہیں جو اٹھا تو ایسا نہ ہو کہ ہڈی کڑک جائے۔ جو کڑک گئی تو پھر بچھری بیٹھنے سے بھی جائے گا۔ جسم کتا ہے دیکھ اب میں بہت بستریوں۔ اب تو اس کدو بازی کو چھوڑ۔ وہی کے ٹھونے کو پیسٹک۔ مجھے انڈا گوشت کھانا۔

ذہن کتا ہے نہ نہ نہ۔ جو تو نے احتیاط کو چھوڑ دیا تو حیرا کہاں ہو جائے گا۔ ابھی نہیں۔ ابھی کدو چلے گا۔ وہی چلے گا۔ بچکے تو صحت کے اصولوں سے واقف کیا۔ پریزیکی اہمیت کو نہیں جانتا۔

اس پر جسم آؤ کھا جاتا ہے۔ اچھا بچو کھا کدو۔ چھ مہینے اور کدو نہ کھلایا تجھے تو میرا نام بھی جسم میں۔

اس رات بلاوجہ اشفاق حسین کا بخار کم ہونے کے بجائے ایک درجہ بڑھ جاتا ہے۔

برٹریڈرسل نے کیا خوب بات کی تھی۔ بچوں کی تربیت پر اپنی شہرہ "اخلاق کتاب میں لکھتا ہے۔ "دو بچے جو زبان سے احتجاج نہیں کر سکتے۔ چہیت اور آنکھوں سے احتجاج کرتے ہیں۔"

اشفاق حسین کے سارے ہی مضمون عالم احتجاج میں ہیں۔
دراصل اشفاق حسین لیکن گیارہ کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس کے بیشتر افراد بیک وقت چھل بھی ہیں۔ پاگل بھی ہیں۔ ان میں قابلیت کی چنگاری جلتی ہے۔ جس سے دماغی کے شرلوے اڑتے رہتے ہیں۔

اشفاق حسین کا جسم اور ذہن برسرِ پیکار ہیں۔
اس کے بھائی احمد بشیر کا جو ایک جانا پہچانا جرنلسٹ ہے۔ ذہن دو مونی سانپ کی طرح ہے۔ جس کے دونوں سروں پر سر ہوتا ہے۔ کبھی ادھر سے ادھر چلنا شروع کر دیتا ہے کبھی ادھر سے ادھر۔

اس کی بھانجی پروین عارفہ جو ایک جانی پہچانی اویہ ہے۔ حرکت کی دماغی ہے۔ اس کے لئے ہائیکل کی صدق زندگی حرکت ہے۔ مسلسل حرکت اور سون موت۔ یہ نہیں میا کیوں ہوتا ہے مگر میا ہوتا ہے کہ جس میں خرابی رہا ہوتا ہے وہاں سانپ ضرور ہوتا ہے۔ جس میں قابلیت ہوتی ہے۔ وہاں گھسن گھسری ضرور ہوتی ہے۔

ہاں تو اس بات پر شہدے سے حیران تھا کہ دلی میں اشفاق حسین کا ذہن اور جسم ایک دوسرے سے تعلق کر رہے تھے۔ دونوں ہی ٹروس کا سفید جھنڈا گاڑے بیٹھے تھے۔

نئی دلی

میں نے کہا "اشفاق حسین ایسوریم کپڑے کے لئے نئی دلی چلنا پڑا۔ گا۔"
"وہاں تو چٹائی ہے۔" وہ بولا۔
"نہیں۔" میں نے پوچھا۔

”اوشا رتی تھی۔ نئی دلی میں ہماری برانچ ہے وہاں ضرور چلا۔ وہاں آپ کے مطلب کی چار ایک کتابیں مل جائیں گی جو ہمارے ہاں آؤت آف سٹاک ہیں۔“
یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھ میں چمک لہرائی۔ مدہم آواز میں بولا ”اس نے فون بھی کر دیا تھا۔“
”میں نے پوچھا۔“

”نئی دلی کی برانچ میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”یوں کرتے ہیں آئی شام نئی دلی جائیں گے۔ ایسوریم سے بجی سدا پوچھیں گے اور بسنداری کی برانچ سے کتابیں خریدیں گے۔“

نئی دلی سے میں سرسری طور پر واقف تھا۔ آخری مرتبہ جب میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ بالکل ہی نئی تھی۔ یوں جیسے نئی دائرہ سی ہوئی ہے یہاں ہے وہاں نہیں ہے۔ اوجھڑا کر اوجھڑا کر۔

ان دونوں نئی دلی بن رہی تھی۔ کچھ بن رہی تھی کچھ بننے والی تھی۔ لدا اکھڑی اکھڑی خالی خالی اجڑی اجڑی۔ او اس ویران تھی۔
شام کے وقت جب ہم رکشائیں بیٹھ کر نئی دلی کی طرف جا رہے تھے تو میں بی بی توجہ اور شوق سے گرد و پیش کو دیکھتا جا رہا تھا۔

سڑک بڑی عمدہ تھی۔ چوڑی تھی۔ دلی کی سڑکیں یہ ایسی تھیں۔ خصوصاً وہ جو شہر سے باہر کو جاتی تھیں۔ یہ سڑک تو نئی دلی کو باہر لے جاتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سبز تھا۔ مکانات تھے۔ لیکن اتنی اداسی کیوں تھی۔ منظر بے ہوش کیوں تھا۔ اتنا سکون کیوں تھا۔

پھر دفعتاً جیسے نگاہوں سے نہ وہ ہٹ گیا۔ اسے سڑک پر پر ٹریک اس قدر کم کیوں ہے۔ ہلے ہلے ہیں تو سڑکوں پر موٹریں کتوں کی طرح بھونچتی پھرتی ہیں۔ سڑک پر آدمی کم ہوتے ہیں موٹریں زیادہ۔ اور پھر ہلے ہلے ہیں سو سائیکل بھی تو تقریباً سائیکلسر نکال کر گھاواں گھاواں کرتے ہوئے پھٹکھلاتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ہر چند منٹ کے بعد گویا آواز کا ایک زلزلہ آ جاتا ہے گزر جاتا ہے تو شکر ہے میرے اٹھ کی آواز اندر سے اٹھتی ہے۔

ہمارے ہاں پرائیویٹ کاریں چلتی تھیں۔ دوڑتی ہیں۔ دیکھیں رکتی ہیں۔ چلتی ہیں۔
 رکتی ہیں۔ چلتی ہیں۔ ”رک پل“ کا بیج ڈالتی ہیں۔ موٹر سائیکل سٹاپ چال چلتے ہیں۔
 ہمارے ہاں سڑک پر جاؤ تو جلدی کا جھڑپہ چاہتا ہے جلدی۔ اور جلدی۔ اور جلدی۔
 جلدی چلو۔ جلدی پانچو۔ جلدی لونو۔ جلدی بیو۔ جلدی مرو۔

ٹھنڈی سڑک کالی سڑک

دلی کی سڑکیں اس لحاظ سے سب ٹھنڈی سڑکیں تھیں۔ نہ شدت سے تھیں نہ
 جلدی سے بل کھلتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے ۱۹۴۲ء کا لاہور یاد آ گیا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب سڑکیں آرام سے درختوں کی چھاؤں تلے ہوں یعنی
 رہتی تھیں جیسے شہزادیاں ہوں۔ اسی لئے تو ان دنوں لاہور کی ماں روڈ کو ٹھنڈی سڑک کہتے
 تھے۔ آج کل اسے کوئی ٹھنڈی سڑک نہیں کہتا۔ کیسے کہے بھلا۔

اس زمانے میں لاہور کے شوقین مزاج لوگ تانگلے یا خن میں بیٹھ کر شام کے وقت
 ٹھنڈی سڑک پر ٹھل ٹھلے جایا کرتے تھے۔ گھوڑے کی دھکی کی لے سنتے۔ فراغت سے
 گرد و پیش کی طرف دیکھتے اور موچھ مروڑتے۔ مقصود نہ کہیں جاتا ہوتا نہ پہنچتا ہوتا نہ کام نہ
 کلج نکل نکلج۔

آج کل تو سڑک کو کالی سڑک کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ یعنی نہیں دوڑتی ہے۔ ریس
 کرتی ہے۔ بچتی ہے۔ دھڑکتی ہے۔

دلی کی سڑکیں سب ٹھنڈی سڑکیں تھیں۔ موٹریں شرفانہ انداز میں چلتی تھیں۔
 موٹر سائیکل پیچھے نہ تھے۔ رکشے سڑک پر فٹ بل نہیں کھینچتے تھے۔ اور سائیکل رکھتے۔ وہ
 تو پہلے ہوٹک رہے تھے۔

اوسے یہ کیا دلی سڑکوں پر ایک ہی موٹر چلتی ہے کیا۔ ہند کی نی ہوئی موٹر۔ بھان
 اللہ بات ہوئی۔ اپنی چیز بھاڑ اپنی چیز بر تو۔ ایک ہم ہیں کہ اپنا کپڑا بھاتے ہیں اس پر دسلور کی
 مر لگاتے ہیں تاکہ کہتے تھے ”میلے ان پاکستان“ کوئی نہیں خریدتا۔

صاحبو! میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ ”اپنی چیز بھاڑ۔ اپنی چیز خرید“ کا شدت سے
 ناکل ہوں لیکن اس کا کیا جائے کہ اپنی سڑکوں پر رنگ برنگ اور طرح طرح کی موٹریں چلتے

ہوئے دیکھ کر فخر سے میرا سر اونچا ہو جاتا ہے اور دل سے آواز اٹھتی ہے۔ بارغ وہ ہوتا ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول اگے ہوں۔ ایک رنگ کے جنوں تو وہ بارغ تھوڑا ہوا۔ کھیت ہوا کھیت۔

دلی میں ہم چار پانچ دن رہے۔ ہم صبح شام سڑکوں اور بازاروں میں آوارہ گردی کرتے رہے لیکن ایک ایکسپڈنٹ بھی دیکھنے میں نہ آیا۔ چلو جاؤ نہ سہی جاؤٹے کے آچار ہی دکھائی دیتے۔ سانپ نہ سہی سانپ کی لکیر ہی سہی۔ یہاں تو سڑک پر ہر چند قدم کے بعد ایک ٹاکی لکیر نظر آتی ہے بلکہ لکیریں ہی لکیریں۔

اشفاق حسین نے مجھے کہنی ہلای بولا "یہ فلیشیں دیکھیں تم نے۔"

"کون سی فلیشیں۔"

وہ ہنسا "نظر نہیں آتیں کیا۔"

"میں تو ابھی سڑک کی جانب دیکھ رہا تھا۔"

"بڑی ماڈرن فلیشیں ہیں۔"

"یا اللہ یہ فلیشیں اور کبھی آئیں گی۔" میں نے آہ بھری۔

"کیوں خوبصورت نہیں کیا۔"

"بڑی خوبصورت ہیں دیکھنے میں۔ باہر سے۔"

"کیا مطلب۔" اس نے جیسی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"فلیشیں دیکھنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ رہنے سنے کے لئے ہوتی ہیں۔ جتنی

خوبصورت نظر آتی ہیں اتنی ہی غیر آرام دہ ہیں۔"

مجھے عمر کا دوست بیڑنگ یاد آ گیا۔ بیڑنگ انگریز ہے۔ لندن میں رہتا ہے۔

اس روز عمر کے گھرنگ کی دعوت تھی۔ مسعود، حماد، جہان اور میں بیٹھے تھے۔

حماد نے نگ سے پوچھا "ایر کنڈیشنر کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔"

وہ بولا "بہت برا اثر چڑھتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے۔" عمر نے پوچھا۔

"بولا۔ ایر کنڈیشنر نے ہمارے آریو کیلچر کی ایسی کی تھی پھر دی ہے۔" نگ

نے ایک آنسو میں غم درو کہہ دیا۔

صاحبو! میں اسلام آباد میں رہتا ہوں۔ دیکھتے ہیں بے حد خوبصورت شہر ہے لیکن ایر کنڈیشنرز طرز تعمیر پر بنا ہوا ہے۔ ایر کنڈیشنرز کی میں توفیق نہیں رکھتا۔ اس لئے ایک خوبصورت گھر میں گریسوں میں ہوں اشیائیں سے چڑا رہتا ہوں جیسے فرنیچر جن میں چڑا ہوا بارڈر بانڈ لگاؤ۔"

نئی دہلی کی ان فلمیوں کو دیکھ کر میرا ہی چہاں ان کمینوں کو جو ایر کنڈیشنرز کی توفیق نہیں رکھتے باری باری گلے لگا کر رو دوں۔

سڑک پر بس خاپوں کی وہی کیفیت تھی جو اس روز ممبئی کی بس میں سے نکل آئی تھی جب ہم قطب صاحب جا رہے تھے۔

نوجوان لوگ لڑائی پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ "لوہی آگئی نئی دہلی" رکشا والا بولا۔ ہم رکشا سے اتر کر پیڈل چلے گئے۔

بے شک فلمیں شہری فہمیت کے ذہب کی حصیں لیکن خاصیت پرانی نظر آتی تھیں۔ ماحول اور اس اور اس تھا۔ لوگ فٹ پاتھ پر جا آ رہے تھے۔ پھر بھی اسی چھٹی ہوئی تھی جب ہم پوچھتے پوچھتے ہینڈلری کی برانچ تک پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ یہ برانچ بھی ایر کنڈیشنرز طرز تعمیر کی نئی ہوئی تھی۔ اس وقت پاور فیل ہو چکی تھی۔ اندر شال پر کھڑی خاتون پیسے میں نہانی ہوئی تھی۔ مرد سٹارٹین گھبرا کر دوکان سے باہر نکل آیا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم واپس ہو گئے۔

ایسپوریم تلاش کرتے کرتے اندھیرا ہو گیا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو ایک ہی جگہ چار ایسپوریم واقع تھے۔ لیکن ان میں سے تین بند ہو چکے تھے۔ چوتھا بھی بند ہونے کو تھا۔ ہم نے دکاندار سے پوچھا۔

وہ بولا "ہاں مدارج ہوئے تو ہیں بنی سار کے گلاس لیکن اس وقت اندر سے پاس موجود نہیں۔"

"کہیں سے نہیں گے۔" اشفاق نے پوچھا۔

"سیٹائی کے متعلق ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ آپ آرڈر لکھوا جائیں۔ شاید اس

پندرہ دنوں تک آجائیں۔"

"جناب ہم تو پر دیکھی ہیں دو ٹیک دن میں واپس چلے جائیں گے۔ آپ یہ بتائیں کہ

”ہیں یہ گلاس کہاں سے مل سکتے ہیں۔“

لالہ جی بولے ”دیکھیے سیدھی بات ہے یہ گلاس لکڑی کے بنے ہیں۔ چاندنی پونک کے پاس ایک لکڑی کا بازار ہے۔ آپ وہاں چلے جائیں۔ ممکن ہے آپ کو وہاں سے مل جائے۔“

یہ سن کر ہمیں خود پر بے حد غصہ آیا۔ کہ ایلو سیدھی بات تھی اور ہم نے اسے خولہ خزانہ الیہما رکھا ہے۔ ہم یہ سمجھتے رہے کہ یہی سار ایک بوٹی ہے۔ کتنی اہمیت اسے تھی۔ ابھی بوٹی کا گلاس بھی بن سکتا ہے۔ گلاس تو لکڑی کا بنتا ہے چاہے وہ لکڑی بوٹی کی ہو۔ بھارتی کی ہو یا اور خست کی ہو۔ ہر حال وہ لکڑی ہے۔ لکڑی بازار سے چور اتار کر مل جائے گا۔ اب ہمیں اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ اس قدر سیدھی بات تھی جو ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ اس پر اشفاق اور میں شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ اگرچہ بھلاہ اس کا اعتراف نہیں کرتے تھے لیکن اندر ہی اندر شرمندگی اور خفت کا کانا لگا ہوا تھا۔

پھر یہ بھی ہے کہ پیدا چل چل کر ہم تک چکے تھے۔

انکالہا فاصلہ ہم کبھی نہ چلے تھے۔

نئی دہلی کی تمام تر دوکانیں بند ہو چکی تھیں حالانکہ ابھی پوری طرح سے رات نہیں پڑی تھی۔

نئی دہلی ایک دیرانے میں بدل گئی تھی۔ مجھے تو اس دیرانے سے خوف آنے لگا تھا۔

اب ہم ٹیکسی یا رکشا کی تلاش میں تھے۔ سوک پر نہ کوئی ٹیکسی تھی نہ رکشا۔ پرائیویٹ کٹر بھی کبھی کبھار گزرتی۔ جب بھی کوئی رکشا رکستا تو ہم اس کی طرف اٹھ بھاگتے۔ وقت یہ تھی کہ اس وقت کوئی ٹیکسی رکشا ہا ہوں کے مقبرے کی طرف جانے کے لئے تیار نہ تھا۔

نئی دہلی کی اداسی اور دیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔

گل مہر پارک

ایک روز شام کے وقت جب ہم صوب دستور تری محکم سے باہر نکل کر کے درخت تلے بیٹھے
 کھیل لڑا رہے تھے تو ایک ڈائریکٹر ہمارے ہمارے آئے ہوئے "آپ سے کوئی ملے آیا۔"

آئے نہ آئے

"مجھ سے بھلا کون ملے آئے گا۔" میں نے سوچا۔

دلی میں صرف ایک آدمی تھا جسے میں نے دلی آنے کی اطلاع دی تھی۔ پہلے خط میں
 لکھا تھا۔ میرے دلی آنے کے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ دوسرے خط میں لکھا تھا "میر خضر"
 کے ڈائریکٹر میں میرا نام شامل ہو گیا ہے۔ ابھی پروگرام ملے نہیں ہوا۔ تیسرے خط میں لکھا
 تھا۔ ہم سترہ اگست کو لاہور سے روانہ ہوں گے۔ اسی رات امرتسر سے دلی کو بذریعہ ریل
 پہنچیں گے۔ یہ ریل گاڑی اٹھارہ کی صبح کو دلی پہنچے گی۔ اور جہاں تک مجھے علم ہے ہم وہاں
 کے مقبرے کے قریب جو سکاؤٹ کیمپ ہے۔ وہاں ٹھہریں گے۔ اور خبردار جو میرے آنے
 کی اطلاع کسی ادب والے یا بے ادب کو دی۔ ورنہ خطرناک نتائج ہوں گے جو قتل و غارت
 تک پہنچ سکتے ہیں۔

آخری خط میں روانہ ہونے سے ایک دن پہلے حوالہ ڈاک کیا تھا۔

جب گاڑی دلی شیشن میں داخل ہوئی تھی تو میں نے چوری چوری پلیٹ فارم کا
 جائزہ لیا تھا۔ اس امید پر کہ شاید فکر شیشن پر آیا ہو۔ اسے وہاں نہ پا کر میں نے بے نیازی

سے کہا تھا۔ نہیں آیا تو کیا ہوا لیکن ہوا تھا۔ کچھ کچھ۔ اس کے بعد تین دن چوری چوری میں یہ امید لگائے بیٹھا رہا کہ آئے گا۔ جب وہ نہ آیا۔ تو میں نے خود کو حوصلہ دیا آئے نہ آئے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے خاصا فرق پڑ گیا تھا۔

دوسرے دن ایک صاحب یکپ میں آئے وہ کسی دوست سے ملنے آئے تھے۔ میں نے انھیں فکر کا فون نمبر دیا کہ اسے فون کر کے اطلاع دیں۔ کہ ہم آئے ہوئے ہیں اور یکپ میں رہائش پذیر ہیں۔

تیسرے دن بھی فکر نہ آیا تو میں اطلاع فکری آمد کی امید کو گل کر کے چنہ گیا۔ اس لئے اس روز مجھے یہ خیال ہی نہ گزرا کہ شاید فکر آیا ہو۔

فکر تو سہی میرا پرانا دوست۔ اگرچہ عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا ہے لیکن پیدائشی بڑھا ہے۔ اندر آگ جلتی ہے۔ اوپر داکھ کا ڈھیر ہے۔ اندر سے وہ فکری فکر ہے باہر سے تو سہی ہی تو سہی ہے۔

ہم دونوں

فکر تو سہی برصغیر کا بابا بچپانا شاعر۔ نثر نویس۔ طنز نگار اور کالست ہے۔

فکر اور میں پرانے دوست ہیں۔

ہم دونوں کی تخلیق ایک ہی خمیر سے ہوئی ہے۔

دونوں ہی داستانوں کی کٹھن ہیں۔

دونوں نے احساس کستری کی دلدل میں ڈوبتے ابھرتے۔ ڈوبتے ابھرتے زندگی بتائی

ہے۔

دونوں کو ”میں تو کچھ بھی نہیں“ نے کھالیا۔ سدا دیا، بنا دیا۔

دونوں ہی دہلے پتے پھٹنے کالے۔ میڈیا کر۔ نہ گنتی میں نہ شمار میں۔ نہ تین میں نہ

تیرہ میں۔

دونوں ہی غربت کے مارے ہوئے۔ دونوں کو پیٹ بھرنے کے لئے سب کچھ

کھولا۔

دونوں کی گردیں ہلکی ہلکی۔ شانے جھکے جھکے۔ بشرے سے سے۔ فکر کے پاس ایک

اور حوری مسکراہٹ تھی۔ کات بھری مسکراہٹ دو دوسروں کی نسبت خفا کو زیادہ کاتتی تھی۔ اب بھی ہے میرے پاس وہ بھی نہیں تھی۔

دونوں غصے سے جلتے ہوئے۔ میرا بھڑک اٹھنے والا اس کا دم پخت۔ دونوں ہی ادب لطیف کے پیر تھے۔ وہ کام ہی کام میں نام ہی نام۔ تقسیم سے پہلے ادبی ماہنامہ ادب لطیف مونیوں پر آؤ دیکھئے دانشوروں اور ادبی نوریوں میں شنشیلہ کی طرح بڑا زمان تھا۔

یہ سب لفظ چودھری کی وجہ سے تھا۔ ادب لطیف چودھری برکت علی کا لاؤ لایا تھا۔ جسے وہ سینے سے لٹائے پھرتا تھا۔

چودھری برکت علی

چودھری برکت علی بھی بچپن سے تھا۔ اوپر سے سولہ موز باپ اندر سے بچنے میں داری۔ ایک طرف گن گن کر چلنے والا کنڑو کا نڈر جو پٹی پٹی جوتا ہے دوسری طرف کپالڑے خانے والا تھی۔

ایک طرف گن گن کر جاکینٹرو دوسری طرف چھلکا چھلکا ہے۔

ایک جانب غصے سے بھرا ہوا بھوت۔ جو کچھتی اڑاتا ہے۔ پان ہت اندر کر خوش ہوتا ہے۔ بات نہ پر دے دیتا ہے۔ دوسری جانب رضائی میں منہ دے کر آنکھ پونپنے والا زود پٹیل۔

خیر اور میں دونوں برکت علی کی شخصیت کے دونوں پاؤں کے اٹھنے پس رہے تھے۔

بہر حال ایک بات واضح ہے اگر چودھری برکت علی نہ ہوتا تو ممتاز مطلق ممتاز مفتی نہ ہوتا۔

بہر طور ہم دونوں فکر اور میں ایک ہی کشتی پر سوار تھے۔ یہ کشتی چودھری برکت علی تھا۔

یہ کشتی ڈاکٹری تھی ڈولتی تھی ڈولتی تھی۔ اجمرتی تھی۔ لیکن منزل کی طرف چلے چاری تھی۔

بھگوڑے :

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فکر اور میں دونوں ہی بھگوڑے تھے۔ خبر سے بھگوڑے۔

فکر کی منزل اوپ تھی۔
میں محض اتفاقاً اوپ میں آ نکلا تھا۔

وہ گھر سے اس لئے بھاگا تھا کہ دنیا کو بدل دے۔ امیری غریبی کا فرق مٹا دے۔
حقانے داری مرغی کو جیو سدا بن کی سوکھی روٹی میں بدل دے۔ جیو سدا بن کی سوکھی روٹی
پر مکھن لگا دے۔

فکر بڑا اسیبا فاصل طے کر کے لوب لطیف میں پہنچا تھا۔ اس نے راستہ پالیا تھا اس لئے
سمجھتا تھا کہ منزل کچھ دور نہیں۔
وافعہ تقسیم کے فسادات شروع ہو گئے۔

شرقی پنجاب سے خون کے بجھا کے اٹھے اور لاہور پر چھا گئے۔
مسلمانوں کے قتل و غارت کی خبروں نے لاہور میں ہلچل مچا دی۔ امرتسروں نے
لاہوریوں کو چوڑیاں بھجیں۔ لاہور سے شہر کی کھیتوں کے پھٹے کی طرح پھڑ گئے۔ بھمن بھمن
بھمن بھمن۔

لاہور میں ہندوؤں کا رہنا خطرناک ہو گیا۔
فکر گھبرا گیا۔ اب کیا کرے۔ وہ ہندو حقانہ مسلمان۔ وہ جو جگ کو سمجھانے کے لئے
گھر سے نکلا تھا۔ جگ کے غیظ و غضب کے دھارے میں بے بس نکلا بن کر برہ گیا۔
جبجورا اسے شرط تھی بن کر ہند میں پتا نہ لگتی پڑی۔

تقسیم کا اثر فکر پر بھی ہوا اور مجھ پر بھی۔ اس کا مذہب پر اعتماد اٹھ گیا۔ میں نے
زندگی میں پہلی بار شدت سے محسوس کیا کہ میں مسلمان ہوں۔ وہ سوشلسٹ بن گیا۔ میں
مسلمان بن گیا۔

ہند میں فکر نے کھل کر اپنے قلم کا نشتر چلایا اور وہ پیار کے چھلکے کھولنے کے عوض
حلاپ کا کالم لکھ بن گیا۔ میں وہی نور دین کا نور دین بن رہا۔

جب ایک زائر نے مجھے اطلاع دی کہ مجھ سے کوئی ملنے آیا ہے تو میں حیران ہوا۔
مجھ سے بھلا کون ملنے آئے گا۔ فکر کو تو میں اپنے ذہن سے خارج کر چکا تھا۔
ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ فکر تو سوسے میرے رویہ و آکھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر
دی ادھوری مسکراہٹ تھی۔

"ارے۔۔ تو فکر ہے کیا۔" میں نے چلا کر کہا۔ "نہیں میں نہیں مانتا۔ تو تو کوئی
بوزھا کھوسٹ ہے۔ تو فکر نہیں۔ تو تو مجھ سے بھی زیادہ بوزھا ہے۔"
وہ چپ چاپ مسکراتا رہا۔

فکر کے پاس ازلی طور پر افسوس کے لئے کچھ بھی نہیں۔ نہ الفاظ نہ اشارہ نہ آواز
_____ غالی غولی ایک چپ۔ جس پر وہ ادھوری مسکراہٹ یوں لگی رہتی ہے جیسے کھوئی ہو
لنگولی۔

"چھوڑ بھئی یہ بزدلیہ پن۔ تو۔ تو مجھ سے چند وہیں سل بھونتا تھا۔ لیکن اب تو
مجھ سے کہیں بڑا دکھتا ہے۔"

ادھوری چپ اور اس پر لگی ہوئی ادھوری مسکراہٹ۔
"آپ کس سے ملنے آئے ہیں جناب والا۔" میں نے بڑے اخلاق سے پوچھا۔
چپ اور گہری ہو گئی اور مسکراہٹ پر نم۔
میری باتیں کانپنے لگیں۔

"اور لکھ" میں نے طنز کی دھار چلائی اور چٹا قبضی اور کتر پیادو کے چھلکے۔ جو
دوسروں کو بچ کی دلو دکھاتے ہیں ان کا یہی مشر ہوتا ہے۔ احمق بند میں رہتا ہے تو ہندو بن
کر رہ۔ جیسا ویس ویسا بھیں۔"

بڑی مشکل سے وہ بولا "میرا خط آج ہی ملا ہے۔ ابھی۔"
فکر کے ساتھ اس کا ہون بٹا تھا۔ اپنے باپ کے دوست کے سامنے وہ ادب وہ
احرام سے کھڑا ہوتا جا رہا تھا۔
"یہ تمہارا بیٹا ہے کیا۔" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اس کی بھی ایسی کی تہنی پھیر دی تو نے۔“ میں نے غصے میں کہا۔ ”خود کو نہ بچایا اسے تو بچا لیا ہوتا۔“

”اسے کیا ہے“ اس نے مدہم آواز میں کہا۔

”اس پر اوپ و احکام کی اوس جو پڑی ہے۔ دیکھنا نہیں اس پر اپنا اثر نہ ڈالنا تو یہ مس فٹ نہ ہوتا۔ شوخی ہوتی، شرارت ہوتی، بغاوت ہوتی۔ یہاں خرافت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ یہ کیا آج کل کا رنگ ہے۔“

”تیرا بیٹا کیا ہے۔“ وہ بولا۔

”مجھ ایسا نہیں۔ مجھ سے بہتر ہے۔“

”یہ بھی مجھ سے بہتر ہے۔ لڑکی ادھوری مسکراہٹ چٹکی۔“

”یہ بتا مجھ سے ملنے میرے گھر آئے گا۔“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”آؤں گا“

”کب۔“

”کل شام کو۔“

بھیلی اور کھیاں

اگلے روز شام کو اشفاق حسین اور میں نئی دلی میں گل مر پارک کی طرف جا رہے تھے۔

نئی دلی نہ نئی دیکھتی تھی نہ پرانی نہ وہاں رونق تھی۔ اداس، خاموش، دیرین۔ وہی صاف ستھری ٹیلیفون وہی کالی دیرین سڑک۔ وہی دو کائیں جو کھلی تھیں لیکن باہر سے یوں لگ رہا تھا جیسے بند ہوں۔ وہی شاہنگ سنٹر جس میں شاہنگ کی گما جمی نہ تھی۔ صرف سنٹر ہی سنٹر رہ گیا تھا۔

ہمارے ہاں تو شاہنگ گڑی بھیلی کی طرح ہوتی ہے اور شاہنگ کھیاں کی بھین بھین۔

یوں لگتا تھا جیسے نئی دلی کی ملاکیت میں گڑ مرچاٹوں میں رکھا ہوا تھا اس لئے وہ دو کائیں بھین بھین سے محروم تھیں۔

نئی دلی کی بات نہیں۔ سدی دلی میں حتیٰ کہ چھائی چوک میں بھی دوکانیں تو مال سے بھری ہوئی تھیں۔ گڑکی جیلیاں سرچاؤں میں نہیں باج دھری تھیں پھر بھی بھین بھین نہ تھی۔

دہائی خدا کی۔ یہ کون سا دس ہے جہاں آج بھی دوکاندار گاہکوں کو خود بازار ہے ہیں۔ ان کی توجہ مال کی طرف منحطف کر رہے ہیں۔

ہمارے ہاں تو دوکاندار آگے پیچھے رہتے ہیں۔ ان کا رویہ ہندو ایسا ہوتا ہے کہ خریدنا ہے تو خرید نہیں تو راستہ ناپ۔ کھسکاں نوں کھنا۔

وہ دن گئے جب دوکاندار راستہ روکتے تھے پھٹکی جی ادھر آؤ۔ کیا چاہئے۔ اب تو خریدار دوکاندار کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ پتہ مرتبہ بازار تو ایک مرتبہ بنو اب دیکھتے ہیں۔

وہ پرانا دور ڈھانڈا اور سپلائی کا دور تھا۔ آج دنوں دوکاندار ضرورت مند تھا کہ خریدار آئے۔ اب خریدار ضرورت مند ہے لیکن یہ ہندو کیسا دس ہے کہ دوکاندار ابھی تک منتظر میٹھا ہے کہ کب کوئی آئے۔

ہمارا رکشا شاہنگ سنٹر سے کلک کر ایک طرف چل پڑا۔ دیرانی بڑا سنی بڑا سنی بڑا سنی۔

نئی دلی کے مضامین بالکل ہی دیرانی ہیں۔ بے شک لوگ تو بھتے ہوں گے لیکن اتنے صراطِ مستقیم لوگ۔ نہ جھگڑے نہ شور نہ شرابانہ ہمارا ہی نہ گھما گھمی۔ اتنے امن پسند اتنے سکون زدہ۔ دیر تک رکشا والا منتظر رہا کہ کوئی گزرے تو وہ گل مرہ پادک کاراستہ پتہ پانچے۔

محلے اور پنچکے

ہمارے ہاں اسلام آباد میں بھی سڑکیں دیرانی ہوتی ہیں۔ اصولی طور پر جہاں پنچکے ہوں گے وہاں دیرانی ہوگی جہاں محلے ہوں گے وہاں چمچل پھل ہوگی۔

اسلام آباد میں ایسے علاقوں میں پٹے چاڑ جہاں کوثر واقع ہیں تو رونق نظر آئے گی۔ یہ رونق لوگوں کی ہوگی۔ بنگلوں کے علاقوں میں رونق سڑکوں پر ہوگی۔ لوگوں کی صفیں ہلکے کاروں کی۔

نئی دہلی کی اس سڑک پر نہ لوگوں کی رونق تھی نہ کاروں کی۔ کبھی کبھار کوئی اکابر کا موٹر سائیکل دہلی چلا نظر آتا۔ اسلام آباد کے موٹر سائیکل دہلی چال سے محروم ہیں وہ صرف سرپٹ سے واقف ہیں۔ سوار دہلی کو کسر نشان سمجھتے ہیں۔ اور اگر موٹر سائیکل سرپٹ دوڑنے کے ساتھ ساتھ چنگھاڑتا جائے تو وہ باعث فخر ہے۔

بڑی مشکل سے ہمیں کل سرپٹک ملا۔ یہ علاقہ واقعی کل سر تھا۔ وہاں کل بھی تھے اور سکوت کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔

علاقہ خوبصورت تھا۔ چھوٹے چھوٹے پنے ہوئے تھے جو دیکھنے میں خوبصورت نہ تھے لیکن ان سے سکون الطمینان اور گھریلوں کی خشبو آ رہی تھی۔

پھر وہی نمبروں کی مشکل درپیش آگئی۔ جو پیشہ سے میرا متقدر ہے۔

اگر مجھے ۲۸۶ نمبر دیا جاتا ہو تو ۲۸۳ تک نمبر صاف چلے جائیں گے۔

پھر دفعۃً کلی ختم ہو جائے گی۔ اگلی اگلی ۳۰۱ سے شروع ہو جائے گی۔ زندگی بحر میری تلاش کی کندلب بام سے دو چار ہاتھ پہلے ٹوٹ جاتی رہی۔

پورے دو گھنٹے ہم تلاش میں سرگرداں رہے۔ آخر میں ایک گناہم کوٹنے سے فکر کا گھبراہٹ ہو گیا۔ اس کوٹنے کو نمبروں کے تسلسل سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔

رکشہ کا شور سن کر فکر باہر نکل آیا۔ چہرے پر وہی اوجھری مسکراہٹ۔

گھربڑا مقبول تھا۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

”اسنے عمدہ گھر میں رہتا ہے ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔

”دیکھ لے۔“

”کتنا کراہیہ دیتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرا بچا گھر ہے۔“ وہ بولا۔

میں نے دوبارہ گھر کا جائزہ لیا۔ ”فوضوں میں نہیں ملتا۔“

”نہ مان۔“

”بیاز کے چھلکے چیرنے والا کالست اور اپنے گھر میں رہے۔ میں نہیں مانا۔ نہ تو

روز نامہ طلب اتنا دیا لو ہے اور نہ حکومت ہند۔ حکومتیں تو لکھنے والوں کو صرف جھجھوڑتی

ہیں۔ لکھنے والو جاگو اور قوم کو راست دکھانے کا فریضہ ادا کرو۔ اللہ اللہ خیر سما۔ انہوں نے

لکھنے والوں سے کبھی نہیں پوچھا کہ یہی رات کو کھانے کے لئے روٹی ملی تھی کیا۔
اشفاق حسین ہنسا۔ بولا "نہیں نہیں ہیانا کہو۔ جب لکھنے والا مر جاتا ہے تو کونکوں
انفوس کا پیغام بچا پتی ہیں۔"

"یہ فکر مرنا بھی تو نہیں۔ حکومت کو پیغام بچھانے کا موقع ہی نہیں رہتا۔"

"اس گھر میں تو اکیلا رہتا ہے کیا۔" میں نے فکر سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولا۔ "میرا بیٹا میرے ساتھ رہتا ہے۔"

"بڑا خوش قسمت ہے تو۔"

وہ کس لئے۔ "فکر نے پوچھا۔

"اس لئے کہ تیرا بیٹا تیرے مکان میں رہتا ہے۔ اس کے برعکس میں اپنے بیٹے کے

مکان میں رہتا ہوں۔ تھری پوزیشن پیئر ہے۔"

ہم ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ ایک کھلا سا کمرہ تھا جو آج کل کے ڈرائنگ روم
اور پرانے زمانے کی بینک کا احتیاج تھا۔

کمرے میں چار اسٹول بیٹھے تھے۔ فکر نے میرا تعارف کرا دیا۔ پروفیسر وحید بچپن
حسین بلراج کو مل اور درانی۔ بلراج کو مل کو تو میں پہلے سے جانتا تھا لیکن بچپان نہ سکا۔ ہم
چالیس سال کے بعد ملے تھے۔ چالیس سال کے بعد تو انسان کا نام ہی چم رہ جاتا ہے باقی
سب بدل جاتا ہے۔"

دوست اور پھل

ایک گز ہوا اس بات پر فکر کیا کرتا تھا کہ اس کا کھانا چالیس سال پرانا ہے۔
ایک دن ایک شخص نے پوچھا۔ کیا گزشتہ چالیس سال کے دوران کھانا
مرمت بھی کرایا۔

گز ہوا بولا۔ ہاں مرمت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔

تسلی ہار مرمت کروائی۔

گز ہوا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سراخا کر بولا۔ سات مرتبہ اس کا دست نیا لگوا دیا۔ اور
کچھ لو چار مرتبہ پھل ہوا ہو گا۔

ہم سب گلزارے کے اس کھڑاے کے صدق ہیں۔ میں وہ ممتاز ملحق نہیں ہوں جو چالیس سال پہلے تھے۔ فکر وہ فکر نہیں جو چالیس سال پہلے تھا۔ دستے بھی بدلے گئے۔ پہل بھی بدلے گئے۔ صرف نام وہی ہے۔

مجھے یاد ہے بلراج کوئل۔ ایک کوئل سانو جوان تھا جسے نکلیں نکلیں کا جنون تھا۔ اب وہ غلی بلراج تھا۔ لیکن چہرے پر وہی معصومیت تھی۔ سادگی تھی وہی غلوس تھا۔ یہ بھی حیرت کی بات تھی کہ بلراج کوئل چالیس سال زندگی میں لت پت رہنے کے باوجود اپنی معصومیت پر قرار رکھے ہوئے تھا۔

آؤر ذوبلی

۱۹۳۸ء میں ذوبلی نے میرا ہمسہ بنایا۔ بنا چکا تو میں دیکھ کر ہکا بکارہ گیا۔ میں نے کہا "اے او آرٹسٹ کے بچے یہ کیا بنا دیا تو نے۔"

ذوبلی نے کچھ جواب نہ دیا۔

میں نے ٹھہرے میں کہا "میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔"

یو لا "میں سمجھا میرے بیٹے سے پوچھ رہا ہے چونکہ میں آرٹسٹ ہوں آرٹسٹ کا بچہ

نہیں ہوں۔"

میں نے کہا "اے او آرٹسٹ یہ کیا بنا دیا تو نے۔"

یو لا "تھرا سر بنایا ہے۔"

"لیکن یہ چہرہ بھی تو دیکھ۔"

"کیوں چہرے کو کیا ہوا ہے۔"

یہ تو کسی جرائم پیشہ کا چہرہ ہے۔"

"اچھا۔" وہ یو لا۔

"میرے چہرے میں شر تو نہیں۔ اس میں تو شر ہے۔"

ذوبلی کہنے لگا مجھے تو جیسا دکھا میں نے بنا دیا۔

"لیکن میرا چہرہ ایسا تو نہیں۔"

"ایسا نہیں تو ایسا ہو جائے گا۔ ہم لوگ تو اندر کے انسان کو دیکھتے ہیں۔"

آج ۳۳ سال بعد اس ہسٹ کو دیکھ کر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا پورا روزِ روزِ اس بت کے رنگ میں اُٹھتا جا رہا ہے۔

ایک روز بھائی جان نے مجھے سرکارِ قبلہ کا بیاض دیا۔ بولے "مفتی جی اسے اپنے پاس رکھئے۔"

بھائی جان ایک بزرگ تھے۔ جن سے میں پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں ملا تھا۔ میری زندگی میں وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے میرا رخ بدل دیا۔

میں نے کہا "بھائی جان یہ سرکارِ قبلہ کا بیاض ہے۔ مجھے رکھنے کے لئے نہ دیجئے۔" بولے "وجہ۔"

اندر کا باہر کا

میں نے کہا "پہلے بھی ایک بار میں نے غلام محمد کے سرکارِ قبلہ کی بیاض اپنے پاس رکھی تھی۔ بڑی ندامت اٹھانا پڑی تھی۔"

بھائی جان نے پرچھا "وہ کیسے۔"

اس پر میں نے انہیں سدا و اتحد سنایا۔

میں نے کہا "جب آج سے پچاس تیس سال پہلے میں ساہیوال میں سکول مانتا تھا۔

وہاں ایک صاحب تھے جن کا نام غلام محمد تھا۔ میرا دوستانہ ہو گیا۔

غلام محمد ستار بہت خوب بھارت تھا۔ خصوصاً جب وہ نماز سے فارغ ہوتا۔

غلام محمد کھانا کرتا تھا۔ نماز میں بیٹھی بیٹھی ادا کر لیتا ہوں لیکن مجھ میں وہاں تک کی صلاحیت نہیں۔ دماغ اتنا میری ستار پر ختم ہے۔ ایسی منتیں کرتی ہے۔ بازے کرتی ہے۔ روتی ہے۔ سسکیاں بھرتی ہے۔ اتنی التجائیں کرتی آتی ہیں اسے کہ اللہ میں سن کر ٹوہ تشلیل اسے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

باقی جب غلام محمد نماز سے فارغ ہوتا تو وہیں مچھلے پر بیٹھے بیٹھے ہوں ستار چینی تاکر

سارا کھرا اچھڑوں سے بھر جانا۔

ایک روز میں نے غلام محمد سے کہا۔ ”یہ جو تو نے گیتوں کے بول کاپی میں لکھ رکھے ہیں جنہیں تو سننا پر بجاتا ہے۔ یہ بڑے پرائیوٹ ہیں ایک دن کے لئے یہ کاپی مجھے دے دے۔ میں نقل کر لوں۔“

”نہ۔“ وہ ہلکا۔ ”یہ کاپی نہیں دوں گا میں۔ یہ میرے سرکار قبلہ مرحوم کی کاپی ہے۔ یہ بڑی پاکیزہ چیز ہے۔“

میں نے چار ایک دن مسلسل غنتیں کیں تو غلام محمد مجھے کاپی دینے پر آمادہ ہو گیا۔

میں کاپی گھر لے گیا۔

ان دنوں میں ایک بہت بڑے گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ آدمی رات کے وقت پڑوسوں نے شور مچا دیا۔ بولے ”اٹھ بھلی۔ کوئی شخص کھنڈ بھر سے تیرے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔“

میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے غلام محمد کھڑا تھا۔ کہہ رہا تھا وہ کاپی مجھے واپس کر دے ابھی اس وقت۔

میں نے پوچھا ”کیوں کیا ہوا۔“

غلام محمد کہنے لگا ”سرکار قبلہ نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا۔ کہتے ہیں جا جا کر کاپی واپس لا۔ تو نے ہماری چیز کو پیشاب کے ٹنکے میں کیوں ڈال دیا۔“

واقعی میں پیشاب کے ٹنکے کی طرح ناپاک ہوں۔

بھلی جان مسکرائے بولے ”مفتی جی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج آپ وہی ہیں جو آن سے چھٹالیس سال پہلے تھے۔“

میں نے عرض کی کہ میں تو اس سے بھی بد تر ہو گیا۔ روز بروز میرا پھرا ڈوبی کے بت کے مطابق ہوتا جا رہا ہے۔

بولے ”کیا مطلب۔“

میں نے کہا ”جناب میرے چہرے پر شر کا منہر ابرہتا جا رہا ہے“

بھلی جان بولے ”اللہ کی قسم بڑی رحمت ہے۔“

مجھے غصہ آگیا۔ بولا "جناب شر کا بھرتا رحت ہے کیا۔"

بولے "مطلقاً جی جب اندر کا شر باہر چرے پر آجائے تو کچھ لوگ اندر پا کیزہ ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی آپ وہ نہیں ہیں جو چنانچہ سلی پہلے تھے۔"

اس روز غی دلی کی گل مر کاٹنی میں نہ میں وہ تھا۔ نہ فکر وہ تھا۔ نہ بلراج کوئل وہ تھا جسے ہم جانتے تھے۔ لیکن ہم تینوں سمجھ رہے تھے کہ ہم وہی ہیں۔

بلراج دریا ایک جاٹ طبیعت کا اور جیز عمر کا آدمی تھا میں اسے نہیں جانتا تھا لیکن اسے دیکھ کر یوں محسوس کر رہا تھا جیسے جانتا ہوں۔ جیسے وہ لہنا ہی ہو۔ جانتا چمپا ہو۔ جذبات کا لدا ہوا رکھ رکھو کا کچلا ہوا۔ پیرہاں۔ مگر پانکا سا مستحضر۔ دور سے دیکھو تو مسخڑ۔ قریب جاؤ تو پیٹو۔

ہو فی سرحدید صاحب جوان تھے۔ خوش شکل تھے کچھ زیادہ ہی محبوبیت کے مالک تھے۔ کلف لگا ہوا تھا۔ گردن میں ذرا سا ٹم ویسے بڑے پلاسٹ۔ وہ ہم میں سے نہیں تھے۔ وہ میلے کو چارے تھے۔ ہم میلے سے لوٹ رہے تھے۔ بچتے حسین بین بین تھے۔ انہوں نے میرا جائزہ لیا۔ پھر چرے بولنے لگے۔ ان کے چہروں کو دیکھ کر مجھے وہ محترمہ یاد آگئی۔

میرے ایک ملنے والے صاحب تھے۔ ان کا ہم شیم تھا۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ ہی سٹاڑ تھے۔ شیم کی ملاقات ایک بیکم ختم کی محترمہ سے تھی۔ محترمہ شیم صاحب سے میری تعریفیں سن سن کر مجھ سے ملاقات۔ کا اشتیاق رکھتے تھیں۔

ایک دن اتفاق سے سرراء ملاقات ہو گئی۔ محترمہ سے میری طرف دیکھا۔ ان کی نگاہ میں تحیرت چمکی۔ پھر انہوں نے ہونٹوں کا ہنرہ دایا اور شیم صاحب سے سرگوشی میں بولیں "یہ ہیں ممتاز مطلق؟"

مگر اور کوئل کے سوا حاضرین کے چہروں پر وہی تاڑ تھا لیکن فکر کو کچھ پتہ نہ لگا۔ وہ مجھ پر کچھ زیادہ ہی رعبا ہوا تھا۔ جوں جوں وہ محبت کا اظہار کرتا جاتا توں توں حاضرین کے چہروں پر محترمہ کا اظہار اور بھی ابھرتا۔ ظاہر تھا کہ ان کی توقعات بری طرح سے بخروا ہوئی تھیں۔

شکر ہے میرے ساتھ اشفاق حسین تھا لہذا ان کی توجہ اشفاق پر مرکوز ہو گئی اور میں

نے اشفاق حسین کی اوت میں پناہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔

محرومی، پتھر

فکر کے جذباتی اضطراب کو اور کوئی راستہ نہ ملا تو وہ بولا "ملتی کی آمد کو منایا جائے۔" یہ سن کر حاضرین جو اجازت لینے کی سوچ رہے تھے پھر سے جم کر بیٹھ گئے۔

فکر بولا "ملتی تو شریک ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "میں محروم ہوں۔"

"واقعی میں محروم ہوں کیا۔"

چھوٹے چھوٹے واقعات انسان کی زندگی کے دھارے کو اس طرح موڑ دیتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے واقعہ نے مجھے بیٹھ کے لئے محروم کر دیا تھا۔

کالج کے زمانے میں مجید ملک کی ہمیشہ سے میرا جذباتی نکلنا ہو گیا پہل محترمہ نے کی تھی۔ مجید ملک نے مجھ سے پوچھا کہ پہل کس نے کی تھی۔ میں نے کہا سدا قصور میرا ہے۔

اسے میرے بیان پر یقین نہ آیا۔ مجھ سے سچ انکوائے کے لئے وہ مجھے سسر لے گیا۔

شلفہ اس زمانے میں لاہور کا پاش ہوئی تھا۔ وہاں جا کر اس نے ونکی کا آرڈر دیا۔ میں نے معذرت کی۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر شامل نہ ہوئے تو ہمارے تعلقات ختم سمجھو۔

میں سمجھ گیا کہ بات انکوائے کے لئے مجھے پلار ہا ہے۔ میں پتھر ہو گیا۔ میں اپنا بیان نہیں بدلوں گا نہیں بدلوں گا۔ اس روز میں نے پہلی مرتبہ پی تھی۔

بحرِ صبر بھی پی۔۔۔ پتھر بن گیا۔

یوں وہ چیز جو چمکا کر چھیننے اڑتی ہے میرے لئے پتھر سا ہو کر رہ گئی۔

"ہیں اجازت ہے۔" فکر نے پوچھا

"بالکل۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ۔" وہ اشفاق حسین سے مخاطب ہوا۔

"میں بیمار ہوں۔" اشفاق حسین بولا۔

فکر نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ یوتھ لے آ۔

حاضرین کے چہرے کھل گئے۔

جب ہم امرتسر میں سکھ کے ماتھے پر ہال بازار کا پتھر لگا رہے تھے تو لوگوں کو شدت سے مصروف دیکھ کر میں نے کہا تھا۔ یہ لوگ مصروفیت کے خول میں کیوں رہتے ہیں۔ نہ بلا گناہ سودا ہٹ نہ ہٹاؤ۔ اتنی مصروف اور لو اس زندگی۔

سکھ ڈرائیور بولا۔ ”مہراج یہ دن کے وقت یونہی رہتے ہیں۔ بندگلی کی طرح جب رات پڑتی ہے تو سب الٹا چلتا ہو جاتا ہے۔ بندگلی مکمل کر پھول بن جاتی ہے۔“
”وہ کیسے سردار۔“ میں نے پوچھا تھا۔

”مہراج رات کو بوقت جو مکمل جاتی ہے۔“
وقت مکمل تو سدا گھر موجود تھا۔ یہی بچے تھے۔ کوئی بندش نہ تھی۔ حجاب نہ تھا چوری نہ تھی۔ مجھے کاٹھڑا یاد آ گیا۔

جھول کا جھولنا

کاٹھڑے کی پہاڑیوں میں آدراہ گردی کے دوران یوندا ہادی شروع ہو گئی۔ بادش سے بچنے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اشفاق سے ایک پہاڑی گھردندہ نظر آیا۔ میں ہناد لینے کے لئے اندر چلا گیا۔ اہل خانہ نے میرا خیر مقدم کیا اور میں بیٹھ گیا۔
وہ ایک چھوٹا سا گھرا تھا۔ ایک طرف چار عورتیں بیٹھی کچھ بن رہی تھیں۔ دوسری طرف ایک مرد بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

وہ سب بیٹھے گیت گارہے تھے۔ عورتیں کام کرتے ہوئے مل کر ایک بول کہتیں۔ پھر مرد اکیلا دوسرا بول کہتا۔

ہر چند منٹ کے بعد ایک عورت اٹھ کر تنگے سے چالوں سے بنی ہوئی خانہ ساز شراب جھول نکالتی اور ہر فرد کے سامنے پڑا ہوا آنچورہ بھر دیتی۔ جسے سب ایک سانس میں پی جاتے اور پھر سے کام میں مصروف ہو کر گانا شروع کر دیتے۔
میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

گھر میں غربت کے ڈھیر لگے ہوئے تھے لیکن کتنی بے غم تھی۔ کتنی خوشی تھی۔ کتنی معصوم سستی تھی۔

اس وقت فکر کے ڈرائنگ روم کی اس گھردندہ بھی کیفیت تھی۔ فکر ایک

دوست کی آمد پر چٹک رہا تھا اور اس چٹک و قیام بخشنے کے لئے صبح کمونٹ کا سارا لے رہا تھا۔

عاضن ملت کی پی رہے تھے۔ اس خانہ خوش تھے کہ گھر رونق سے بھرا ہوا تھا۔

فکر کے گھر میں جس شخص نے مجھے سناڑ کیا وہ اس کا نوجوان بیٹا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ نوجوان ہے۔ چونکہ وہ سادگی، معصومیت اور خلوص سے یوں چپ چاپ کر رہا تھا۔ مجھے جلیبی شیرے سے چپ چاپ کرتی ہے۔
فکر کو دیکھ کر میرا جی چلا رہا تھا کہ رو دوں۔

تو نے کے ایک میر غشی کا بیٹا ہے جس کس خوشی غشی کے تحت شعر و ادب لود ہوتا ہے۔
کر گھر سے لگا تھا۔ بچپن ہی میں سارے کنبے کے بیٹے پالنے کی چٹا آ پڑی تھی۔ ذمہ داری کی اس گھڑی کو اٹھا تو لیا لیکن شعر و ادب کی لست نہ چھوڑی۔

ادب کی دلچسپ پڑا رہا، پڑا رہا۔ یہاں تک کہ کھانا بن گیا۔ سارے بند و بس میں شہرت پائی۔ طہ و مزاج کے بحر چلا آ رہا، چلا آ رہا۔ اور آخر تھک کر بیٹھ گیا۔
خالی غوی نام سے سارے کوئی کب تک کھڑا رہے۔ جب ادیب تھک کر بیٹھ جائے تو ابھی کھانا اٹھنے کے لئے اسے سہارا لینا پڑتا ہے۔

بدیشی میڈل

جب فکر مجھے اپنے میڈل اور امتیازی نشانیت دکھار با تھا تو میری آنکھیں پر نم ہوئی جا رہی تھیں۔ کاش کہ ان امتیازی تمغوں میں ایک ہند کی طرف سے دیا ہوا تمغہ بھی ہوتا۔ فکر ایک ہندی ادیب ہے۔ صحافی ہے۔ اس نے ساری زندگی ہند کی خدمت میں بسر کر دی ہے اور وہ امتیازی تمغہ جو وہ اپنے دوست کو دکھار با تھا ایک انجینی ملک کا دیا ہوا تھا۔
ایک سماعت کے لئے میرے دل میں خیال آیا کہ شاید فکر نے اسی لئے اس طرح کمونٹ کا سہارا لیا تھا کہ وہ بدیشی تمغہ مجھے دکھائے۔

فکر کی کہانی ایک عام سی کہانی ہے ایسے ہر بڑے ادیب کی کہانی ہے جس نے اپنی تجربے کا سہارا لیا۔ یہ کہانی بڑی دکھ بھری کہانی ہے۔

ہندو ایسوں، فن کاروں، گانگیوں کا بے حد قدر دان ہے۔ پاکستان سے فنکار ہند جاتے ہیں۔ انہیں ہندو ملکوں پر بٹھا لیتا ہے ان کے وارے نیارے جاتا ہے ان کی دھوم مچاتا ہے حتیٰ کہ فن کار بولکھا جاتا ہے۔ ایسے محسوس کرتا ہے جیسے سوتے جاگتے کا قصہ بیت رہا ہو۔ بے شک ہند فن کا دھراج ہے۔ فنکار کا پروانہ ہے لیکن شرط یہ ہے وہ فنکار باہر سے آیا ہوا ہو۔ پاکستان سے آئے تو کیا کہنا۔۔۔ مدارج آپ کے اپنے دیس میں جو جو گئی بیٹھے ہیں۔ ان کی طرف بھی نگاہ کرم ہو جائے تو کیا حرج ہے۔ ان سے اتنی بے مروتی تو نہ کیجئے کہ وہ اپنے دوستوں کو بیرونی ممالک کے بخشے ہوئے قہقہے دکھانے پر مجبور ہو جائیں۔

میں ہند کی اس پالیسی کا بڑا مستحق ہوں۔ سبحان اللہ کیا فن کی قدر دانی ہے۔ یہ اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن تھوڑی سی فن کار کی قدر دانی بھی ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

بو قلم خالی ہو گئی تو ہم اٹھ بیٹھے۔ ”اچھا ابھی اب اجازت۔“
حاضرین رخصت ہو گئے۔

فکر کا بیٹا ہارے لئے رکشا لانے کے لئے اپنے سکون پر چلا گیا۔
فکر نے بدنی محبت سے میرا ہاتھ دایا۔ بولا۔ ”کچھ لکھیے گا۔“
میں نے پوچھا ”کیا“

افیون کی لت

”مغرب۔“

”دلی کا۔“

”ہاں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔“

”پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔

”تو نے زندگی بھر لکھا۔“

”اس نے سر اثبات میں ہلایا۔“

”مجھ سے بہتر لکھا۔“

”نہیں۔“ انصوری مسکراہٹ بوڑھے چہرے پر پھر سے نکلی تھی۔

"میں نے کمائیاں لکھیں۔ جھوٹی کمائیاں۔ پتہ ہے میری بیوی کیا کہتی ہے۔"

"کیا کہتی ہے۔"

"کہتی ہے بس کرب۔"

"کیوں۔"

"کہتی ہے کیوں جھوٹی کمائیاں لکھ لکھ کر اپنی عاقبت بگاڑ رہا ہے۔"

"یہ بھی کی کہتی ہے۔ میری گھر والی۔" وہ بولا۔

"تو نے تو ہند کی ساج کو نکھارنے کے لئے لکھا۔"

"ہاں۔" وہ بولا "اسی خیال سے۔"

"پھر کیا پایا۔"

"کھو یا تو نہیں۔" وہ بولا۔

"کھو یا بالکل کھو یا۔ کھو دیا۔" میں نے کہا۔

"کیا۔" اس نے پوچھا۔

"خود کو کھو دیا۔"

"اچھا۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"فکر۔" میں نے کہا "بڑے بڑے لکھنے والوں نے لکھا۔" ہم تو ان کی خاک پا

ہی نہیں ہیں۔"

"سچ ہے۔" وہ بولا۔

"پھر کیا ہوا۔"

"کچھ بھی نہیں۔"

"میری اہارامقدر ہے۔ حیرے پاس دکھانے کے لئے بدیشی تحفے ہیں۔ میرے پاس

وہ بھی نہیں ہیں۔"

بڑوں کی شو بھا

"اچھا۔" اس نے آہ بھری۔ "تو تو سر ہند نہیں لکھے گا۔"

"کیا پتہ کچھ دوں۔ یہ جو اطعون کھانے کی لت پڑی ہے۔ اس کے ہاتھوں مجبور ہو

” جاؤں “

” اچھا ہو گا۔ “ وہ بولا۔

” تیری خوش فہمی نہ مٹتی۔ “

” اور میرے پاس ہے ہی کیا زندگی بتانے کے لئے۔ “ اس نے جواب دیا۔

” سچ کہتا ہے تو۔ “

” ہمارے حق میں لکھے گا۔ “ اس نے پوچھا۔

” سمجھئے۔ “

” نہیں ہند کے۔ “

” ہند ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ میری کیا حیثیت ہے۔ نہ میری نہ میرے ملک کی۔ میرا ملک ایک چھوٹی سی بناو گا۔ ہند مجھے عظیم ملک کے متعلق میں کیا لگو سکتا ہوں۔ صرف ایک درخواست ہے، ایک منٹ، ایک جی۔ “

” وہ کیا۔ “ اس نے پوچھا۔

” وہ یہ کہ ہے ہند سدراج۔ تم بڑے دو تو آدمیوں سے میرا سلوک کرو جو بڑوں کو شہباز دیتا ہے۔ “

رکشا کے شور نے ہمارا سلسلہ کلام کاٹ دیا۔

لکھنے محبت سے میرا ہاتھ دایا اور وی او سوری مسکراہٹ پھر سے ہلکائی۔

واپس پر نئی دلی ہانگلی خوب تھی۔ کانیں بند تھیں۔ فٹ پاتھ پر ۱۹۸۰ کا آؤی جھل رہا تھا۔ سڑکیں چپ چاپ یعنی ہوئی تھیں جیسے آرام کر رہی ہوں۔ تیلیں جل نہیں سک رہی تھیں۔ جہانگاہ بھی نو بجے تھے۔ راستے میں اشفاق حسین اور میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اسلام آباد کی قبروں سے ہات شروت ہوئی پنڈی کی قبروں تک پہنچی۔

دوست، رکشا ڈرائیور بولا ” سدراج آپ پنڈی سے آئے ہیں۔ “

ہانگل۔ ” ہم نے جواب دیا۔

وہ خاموش ہو گیا۔

جب ہم حضرت نظام الدین کی درگاہ پر پہنچے تو رکشاک گیا۔ رکھنے کا ڈرائیور بچے اترا۔

وہ ٹیک نوجوان ہندو تھا۔ معصوم۔ محنتی۔ جذباتی۔
وہ ہمارے سامنے آکھڑا ہوا۔ بولا ”مدراج۔ کیا بچی آپ راولپنڈی کے ہیں۔“

اشفاق حسین مسکرایا۔ بولا ”ہاں ہم پٹنی کے ہیں۔“
نوجوان بولا۔ ”مدراج آپ بخول تو نہیں کر رہے۔“
”ہاں نہیں۔“ اشفاق حسین نے کہا۔
”تم نے پٹنی دیکھی ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں مدراج میں نے نہیں دیکھی پر میں اسے جانتا ہوں۔“
”وہ کیسے۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

نوجوان بولا۔ ”جی میری نانی سداون پٹنی کی ہاتھں کرتی رہتی ہے۔ سداون ہمیں بتاتی رہتی ہے یہ لنی کاٹا ہے۔ اس پر پل ہے۔ اس طرف ہلے۔ اوہر گوالنڈی ہے۔ میری نانی کا گوالنڈی میں گھر تھا۔ میں نے وہ گھر نہیں دیکھا۔ پر مجھے سب پتہ ہے۔ اوہر دروازہ تھا اندر ویزا تھا۔ پھر براہِ اندازہ اور جی۔۔۔“ اس کا گلا جذبات سے بندھ گیا۔

دعنا وہ ہمارے دو برو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مدراج میرے ساتھ ہمارے گھر چلو۔ اوہر پاس ہی ہے۔ بہتی دور نہیں۔ میری نانی روز مجھ سے کہتی ہے جیون لال جو تیرے رکھنے پر کوئی پٹنی کی سولری بیٹھے تو اسے گھر لے آتا یہاں۔ اوہر میرے پاس میں اس کی کھاتہ کروں گی اسے اپنے ہاتھ کے جھے ہوئے دھکی لسی پلاؤں گی۔ بس تو اسے لے آ۔ چلو مدراج میرے گھر چلو۔“ اس نے مسکائی۔

ہم دونوں نے اسے بہت سمجھایا۔ بھائی پر اس نے متیں جلدی رکھیں۔ ”بھگوان کے لئے میرے ساتھ چلو جی۔ جو نانی کو پتہ چلا کہ پٹنی کی سولری لے کر میں گھر نہیں لایا تو۔“

”بڑی مشکل ہے پیارے۔“ اشفاق حسین بولا۔ ”ہم جھکے ہوئے ہیں۔ میں تیار

ہوں۔ ہمیں معافی دے دے۔ یہ لے اپنے پیسے شاپاٹے۔"

"نہ سدا راج۔" وہ مایوس ہو کر رکشا میں بیٹھ گیا۔

"پیسے تو لے جا۔" میں نے کہا۔

"نہ سدا راج۔" وہ رکشا سٹارٹ کر کے ہولا "جو نانی کو پتہ چل گیا کہ میں نے

چنڑی کی سواری سے پیسے لئے ہیں تو وہ مجھے گھر سے نکال دے گی۔" یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گیا۔

ہم دونوں چپ چاپ کھڑے اسے دیکھتے رہے، دیکھتے رہے۔

راگ ودیا

اشفاق حسین راگ کارسیا ہے۔

بے شک راگ کا شوق اللہ کی دین ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہ شوق ایک حد سے بڑھ جائے تو پتھری بن جاتا ہے۔ اشفاق کا یہ شوق عرصہ دراز سے بیماری بن چکا ہے۔ راگ کے شوق میں سب سے پہلے آپ اپنی قوت سماع کو جنگلات ہیں۔ کانوں میں یہ صلاحیت پیدا کرتے ہیں کہ وہ شدہ سر کو پہچانے اور آپ اس سے لطف اندوز ہوں۔ پھر بپ شدہ سر کی حس پیدا ہو جاتی ہے تو آپ پر ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ ہر غیر شدہ سر آپ کے لئے شور و غوغا کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اور پھر آپ کے گرد و گرد شور و غوغا کا ایک جنگل جاگ اٹھتا ہے۔ بے سری کرشت آوازوں کا سمندر۔ سمندر میں آپ ڈبکیں کھاتے ہیں۔

مصور زیادہ دیکھتے ہیں۔ موسیقار زیادہ سنتے ہیں۔ زیادہ دیکھنے کی افتاد اس قدر قیامت خیز نہیں جتنی زیادہ سننے کی۔ وہ آوازوں جو میرے لئے خوش کن ہیں۔ اشفاق حسین کے لئے بامٹ کوفت ہوتی ہیں۔ جسے میں گانا سمجھتا ہوں اشفاق حسین کے لئے وہ بے جگم شور ہے۔

اشفاق حسین کے کمرے میں دن کے وقت ڈبل بیڈ کے ایک حصے پر وہ خود لیٹا ہوتا ہے دوسرے پر اس کی ستار لیٹی ہوتی ہے۔ جب وہ ماحول کی آوازوں کی بے رہ بھلی سے کھبرا جاتا ہے تو اپنی ستار اٹھا لیتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں ستار یا تو ہچکیوں کے لئے کر رہتی ہے اور یا شورش پھیل ہاتس کرتی ہے۔

بیماری میں وہ اس کی واحد ساتھی ہے۔

اشفاق حسین کو مدتوں سے یہ شکایت تھی کہ اس کی ستار بولتی نہیں۔ بولے بھی تو اس کی آواز میں وہ لہجہ پیدا نہیں ہوتا جو جانے ان جانے میں ایک جوان عورت اپنی آواز کے زیر و بم سے پیدا کر سکتی ہے۔ کرتی ہے تاکہ توجہ کا مرکز بنے۔

گوگلی مہارانی

جب ہمارا ہندو جانے کا پروگرام نکلا تو اشفاق حسین کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔ حالانکہ ان دنوں وہ بیمار تھا اور اسے خوف و امن گیر تھا کہ شاید وہ سفر کی تکلیفیں برداشت نہ کر سکے گا۔

بار بار وہ اپنی ستار کو دیکھتا۔ بیمار سے اسے تسلی پانا جیسے تسلیاں دے رہا ہو۔ وہ اپنی ستار کو بیٹھ سے ایک جیتا جاگتا ساتھی سمجھتا ہے۔ میں اس کی ستار کو مہارانی کہا کرتا ہوں۔

ایک دن میں نے پوچھا ”آج کل مہارانی کی طرف بڑی توجہ ہے خیریت تو ہے“
 ”بالکل نہیں“ وہ بولا۔ ”خیریت بالکل نہیں۔ سکون نہیں بیچوں ہے بیچوں۔“

”وہ کیوں۔“ میں نے پوچھا۔

”دونوں ہی تھڑے ہوئے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”اس نے ستار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔“ اور میں بھی۔

”جین بیچوں کیوں۔“

”پتہ نہیں“ وہ بولا۔ ”میں اسے تسلیاں دے رہا ہوں۔ یہ مجھے تسلیاں دے رہی ہے۔“

”ہاں سمجھا۔“ میں نے ویسے ہی کچھ کہنے کو بات چلا دی۔ ”تمہارے ہند جانے کی وجہ سے یہ اداس ہوئی۔ جدائی۔“

”نہیں“ وہ بولا۔ ”الٹا یہ خوشی سے ناچ رہی ہے کہ میں ہند جاؤں گا۔ گزشتہ تیس سال سے اس کی زبان میں نکست ہے۔ بے چاری بولتی تو ہے پر بول نہیں سکتی۔ باتیں تو

کرتی ہے لیکن زبان سے نہیں اشدوں سے۔ کیا کرے مہدائی کو آج تک تاریں میسر نہیں آئیں۔ اب میں دلی جاؤں گا وہاں سے تاجے کی تاریں لاؤں گا پھر تم سننا اسے یوں بولے گی جیسے جوانی سے چور شید بولتی ہے۔ "

اشفاق حسین سر میں مینڈھ کا عاشق ہے۔ میں بھی مینڈھ کا شوقین ہوں۔ اگرچہ میں مینڈھ کو ویسے نہیں سنتا جیسے اشفاق حسین سنتا ہے۔
دراصل اپنے تمام دوستوں میں میں سب سے کم سنتا ہوں۔ اس لئے سب سے زیادہ سکھی ہوں۔

میرا دوست اشفاق احمد بھی مجھ سے زیادہ سنتا ہے اس کا کان بہت حساس ہے۔ راہ چلتے چلتے وہ کسی نا کسی کا ڈائیلاگ بن کر اسے ذہن میں ریکارڈ کر لیتا ہے۔ چہ نہیں اپنے ذہن میں اس نے ریکارڈ سسٹم کیسے بنا رکھا ہے۔ اس کے ذہن میں بیسیوں بولیاں محفوظ ہیں۔

پھر وہ محمد حسین تھا جو دیائے آواز کا بادشاہ تھا۔ وہ ظالم مکالمے میں مینڈھ لگانا جانتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ریڈیو پر ایسے ایسے رول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا کہ جواب نہیں۔ وہ آواز کے اسے شیزہ سمجھتا تھا کہ آج تک میں نے محمد حسین صاحب کا کلام نہیں دیکھا۔

شگیت کا گھر

بہت جاتے وقت اشفاق حسین صرف اس بات پر خوش نہ تھا کہ وہاں سے اپنی ستار کے لئے تاریں لائے گا۔ یہ عقد تو وہ ستار کے لئے لانا چاہتا تھا۔ اپنے لئے اس کا پروگرام خاصا وسیع تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ بہت سے پرانے گانوں کے کیسٹ لائے۔

مثلاً وہ کئی ایک ستار نوازوں کے شگیت لانا چاہتا تھا۔ عہد انگریز۔ معمر خان، ولایت خان، ان کے والد عتایت خان، ڈی وی پلا سکر کی سلا شگیت کا کیسٹ لانے کی اسے بے حد لگن تھی۔ ڈی وی پلا سکر جانے پہچانے گانے، وشنو ڈیگمبیر کا بیٹا تھا جو ۳۲ سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا اور جس کی گائیکی کا کوئی نمونہ اس کے پاس نہ تھا۔

ان کے علاوہ اسے بسم اللہ کی شبنلی لائے کی آرزو تھی۔ اندر رکھے کا طبلہ۔ انکا لہا چو ڈا ہر دگر ام۔ میں نے اشفاق حسین سے پوچھا۔

”بھئی بند جا رہے ہیں۔“ وہ بولا۔

”میں نے کہا“ یاران گانگیوں کی چیزیں یہاں پاکستان میں نہیں مل سکتیں کیا۔“

”یہاں ہڈیوں میں۔“ انہوں نے۔ ”اس نے سرنگی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

”لیکن ہیں۔“ انہوں نے پاس موجود ہیں۔ وہ دیکھتے نہیں۔ ریکارڈ کرنے کی اجازت

بھی نہیں دیتے۔“

”وہاں بعد میں بازو میں ملیں گی کیا۔“

”بالکل۔“ اس کی ہاتھیں کھل گئیں۔ بولا ”ہند کو کیا سمجھتے ہو تم۔ ہند موسیقی کا

گھر ہے۔“

”اچھا۔۔۔ بے شک ہند موسیقی کا گھر ہے۔ لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی۔“

”کیا۔“ اس نے پوچھا۔

”پھر موسیقی کے بڑے بڑے گانگ مسلمان کیوں ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”بے شک بڑے بڑے گانگ مسلمان ہیں۔“

”کیوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”ہندو راگ کو مانتا ہے۔ مانتا ہے مسلمان نہ مانتا

ہے نہ مانتا ہے لیکن بڑے بڑے استاد مسلمان ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔“

”چتہ نہیں۔“ وہ بولا۔ ”لیکن ہند موسیقی کا گھر ہے۔“

”وہ تو ہے۔ ہندو بہت قدر دین ہے نا اس لئے۔“

”دلی میں پورا ایک دن میں کیسٹوں کے پنڈو پر لگاؤں کا تم برا تو نہ مانو گے۔“

اشفاق حسین نے پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے تو صرف ایک کام ہے ہوسٹیل کی

کتابیں خریدنا۔ اس کے بعد جو جی چاہے کرنا۔“

”اس کے بعد صرف دو کام ہیں بچی سدا اور راگ و دیا۔“ اشفاق نے جواب

دیا۔

”اور وہ جو پروین سلطانہ ہے۔“ میں نے اسے طعنہ دیا۔

”ہاں پروین سلطانہ۔“ اس نے آہ بھری۔ ”یار مفتی۔ زندگی میں میری صرف

ایک خواہش ہے کہ میں پروین سلطانہ کا انٹرویو لوں اور پھر دنیا کے موسیقی سے اب متعارف

کراؤں کے اندھو دیکھو۔ دیکھو کہ شدھ سرکس طرح جسم میں داخل ہو گیا ہے۔ دیکھو کہ گلے کا معراج کیا ہے۔ سنو اور سر دھو۔ وہ جذباتی ہو گیا۔

لنا کا دلش

کاش کہ میں بھی کلن والا ہوتا۔ میں نے کہا۔

”اونوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اپنے حق میں بددعا نہ کرو۔“

”میرا جی چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔

”کیا۔“ اس نے پوچھا۔

”میرا جی چاہتا تھا کہ جب دلی کے شیشوں پر اتروں تو دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ

لوں اور پھر آنکھیں بند کر کے ہونٹ ہلائے بغیر کہوں۔۔۔“ اے نا حلیشگر کے دلیس

میں تجھے پر ٹام کرتا ہوں۔ میرا سلام قبول کر۔“

”لنا تو بہشتی میں رہتی ہے۔“ وہ بولا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ تو میرے دل میں رہتی ہے۔ زندگی میں جتنا سکھ

جتنی خوشی مجھے لانا نے دی ہے۔ کسی اور فرد واحد نے نہیں دی۔ جوانی میں اس نے مجھے دل

کی دھڑکنیں دیں۔ بڑھاپے میں دل کا سکون دیا۔ ظالموں نے اسے مندر سے نکال کر

فیشن پر ٹیڈ میں بٹھا دیا ہے۔

”کیا مطلب۔“ وہ بولا۔

لنا کو موسیقی سے نکال کر پاپ گانوں میں ڈال دیا۔ حمیس پہہ نہیں اشفاق حسین

میرے دل میں ہندی فلم سازوں کی کتنی عزت تھی۔ پہلے پیمیشل تھیزز تھے۔ پھر پرمات

آئی۔ بہشتی ناکیز آئیں۔ اور وہ ظالم سراب مووی۔ انہوں نے خلی ڈرامہ ہی نہیں وہ وہ

حکیت لکھائی کہ جواب نہیں۔

”بند کیا کرے۔“ اشفاق حسین بولا۔ ”نئی روش بناری کی طرح آئی

ہے۔“

”اونوں۔ میں نہیں مانتا۔“ میں نے کہا ”میرا دل نہیں بلتا۔ بندو اور شدھ

حکیت چھوڑ دے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

دریا سچ میں چلتے چلتے دفعتاً اشفاق حسین رک گیا بولا "یار بڑی بھول ہوئی۔"

"کیا" میں نے پوچھا۔

دلی چکچکے پر میں نے قمیص یاد نہ کرایا کہ د کے دلش کو سلام کرنا ہے۔

اس روز ہم دونوں راگ و دیبا کی تلاش میں نکلے تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ ہند میں راگ و دیبا کی تلاش کا سوال ہی پیدا نہیں ہو گا۔ راگ و دیبا تو ہندی روح ہے پھر تلاش کا کیا مطلب۔

قدر دان ہند

مجھے یاد ہے۔ لاہور اورینٹل اے فیئر میں محلل موسیقی جی ہوئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے نیلے پر جھوم نے پورش کر رکھی ہو۔ تل و حرے کی جگہ نہ تھی۔ چوٹی کے گلوکار اپنے فن کی نمائش کر رہے تھے۔ سائمن بڑے شوق سے سن رہے تھے۔

دفعتاً گانچک بانگرین کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس اسٹیج کے قریب ایک معرور معزز لالہ جی دونوں ہاتھ جوڑتا ہے پر رکے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بانگرین نے شور مچا دیا۔ بیٹھ جاؤ۔ لالہ جی بیٹھ جاؤ۔

اس کے باوجود لالہ جی جوں کے توں کھڑے رہے۔

جھوم نے پھر شور مچا دیا۔ بیٹھ جاؤ لالہ جی بیٹھ جاؤ۔

لالہ جی لو لے۔ "مہراج کیسے بیٹھ جاؤں۔"

جھوم سے آواز آئی۔ "کیوں کیا تکلیف ہے۔"

لالہ جی بولے۔ مہراج جب گئی دبوٹا کھڑے ہوں تو میں کیسے بیٹھوں۔"

میں سمجھتا تھا کہ ہند میں گئی دبوٹا کے لود گرد سبھی ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں گے۔

حلاش کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔ لیکن دو گھنٹے سے ہم دلی میں ملے ملے پھر رہے تھے۔

مہراج یہ بتائیے کہ راگ و دیبا کی دکان کدھر ہے۔ راگ و دیبا کا نام سن کر کوئی بھی توجہ نہ دیتا تھا۔ فوجوان حیرت سے ہمیں دیکھتے۔ انکے ہونٹوں پر حنسن کھین۔

در اصل ہم غلط توقعات لے کر ہند پہنچے تھے۔ پھر دوسرے دن جب ہم بھٹلاری جی کی دوکان تلاش کر رہے تھے تو دریا گنج میں پانی کی ریزی کے سامنے ایک سکھ کی دوکان نظر آئی جس میں موسیقی کے ساز سجے ہوئے تھے۔ اشفاق حسین رک گیا۔ دوکان کے اندر ایک بانٹا سکھ نوجوان مصروف کار تھا۔

”سرور جی۔۔۔“ اشفاق حسین نے کہا۔ ”ستار کی تاریں ہوں گی آپ کے پاس۔“

جتنی مرضی ہے لو سدا ج۔“ سکھ نے جواب دیا۔

لیکن سرور جی چاہیں تانبے کی۔

”بالکل تانبے کی۔“ وہ یوں بولا جیسے تاریں کسی اور چیز کی بنتی ہی نہ ہوں۔

”واو“ اشفاق حسین بولا۔ ”یہ کام تو چلتے چلتے ہی ہو گیا۔ نہ بنگ لگی نہ

پیشکشی۔“

”کتی تاریں چاہیں آپ کو۔“ سکھ نے دو چار تاریں اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”اونوں۔“ اشفاق حسین بولا۔ ”اتنی ہی نہیں۔ پانچ دس سال کی ذخیرہ

اندوزی تو ہو سرور جی۔“

”اچھا سدا ج۔“ سکھ ہنسا۔ ”وہاں نہیں ملتیں کیا۔“

”وہاں کہیں۔“ اشفاق نے پوچھا۔

”اوہر پاکستان میں۔“ وہ بولا۔

”اونوں۔۔۔ اوہر تانبے کی نہیں ملتیں۔“

”ایک بات پوچھوں سرور جی۔“ میں نے کہا۔

”بگھوٹی کچھ۔“ وہ پنجابی پر اتر آیا۔

”آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔“ سکھ ہنسا۔ کہنے لگا۔ ”سدا ج

جو سیبوں کے ٹوکے میں اندر رکھ دو تو پتہ نہیں چلے گا کیا۔“

”اچھا۔“ اشفاق حسین ہنسا۔ ”میں سمجھا کہ آپ نے ہندی باتوں سے اندازہ لگایا

ہو گا۔“

”صرف ہاتھ سے نہیں۔ برسات سے پتہ چلتا ہے۔ چل سے۔ ڈھال سے۔ رنگ سے۔ بولی سے۔ پھر آپ تو میرے گرائیں ہیں مدارج۔“

”ارے۔“ اشفاق حسین چلایا۔

”ہم بھی کچھل پنڈی سے ہیں۔“ سکھ ہنسا۔

اشفاق حسین نے اسے چھیڑا۔ بولا، ”ہم تو اسلام آباد سے ہیں۔“

سکھ بولا۔ ”لو مدارج وہ کیا دو ہیں۔ پنڈی اور اسلام آباد۔ پنڈی مجھ لوگوں کے اے اسلام آباد اس کا ڈریک روم ہے۔“

پھر وہ کاروباری انداز سے بولا ”مدارج جو زیادہ تاریں لیتی ہیں تو کھل آ جلا۔ میں منور سے نکال رکھوں گا۔ جیسی مرضی ہو لے لینا جتنی مرضی ہے لینا۔“

دکان سے باہر نکل کر اشفاق حسین بولا۔ ”میں نے کہا نہ تھا ہندو عکیت کا گھر ہے۔ دیکھ لو پکلی ہی دکان سے تاریں مل گئیں۔“

”ہاں گئے۔“ میں نے جواب دیا۔

بیگمات

اسی روز شام کے وقت جب ہم جامع مسجد کے قرب و جوار میں آلودہ گردی کر رہے تھے تو اشفاق بولا۔ ”یار تھک گئے۔“

”تھک گئے ہو تو چلو واپس چلتے ہیں۔ پکڑوں رکشا۔“

”اوسوں۔“ وہ بولا۔ ”ابھی سے واپس چلے جائیں کیا۔“

”تو پھر“

”دراودر یہاں بیٹھتے ہیں۔ دم لے کر آگے چلیں گے۔“

ہم دونوں ایک تھوڑے پر بیٹھ گئے۔

اشفاق نے کہا ”یار ادر عورتیں نظر نہیں آ رہیں۔“

”عورتیں تو بہت سی دیکھی ہیں میں نے۔ پر وہ نظر آنے والی نہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ ہنسا۔ ”وہ عورت ہی کیا ہوگی جو نظر آنے والی نہ ہو۔“

”ہاں ہند میں تو نظر آنے والی عورت دیکھنے میں نہیں آئی۔ درکنگ دوسن ہیں۔ جو درکنگ زیادہ ہیں دوسن کم کم۔“

”نہیں یار۔“ وہ بولا۔ ”یہ چاندنی چوک کا علاقہ ہے۔ شاپنگ سنٹر ہے۔ شاپنگ سنٹر میں عورت نہ ہو۔“

”دیکھ لو نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہمارے ہاں تو شاپنگ سنٹر میں بیگمات ہی بیگمات ہوتی ہیں۔“

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم نے آزادی کے دور میں بیگمات پروڈیوس کی ہیں۔ ہند نے اسٹو پروڈیوس کیا ہے۔ دونوں میں چنداں فرق نہیں۔“

اشفاق حسین ہنسا۔ بولا ”یار تھوڑی سی بیگمات بھی پروڈیوس کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ بازاروں میں رونق ہو جاتی۔ اب دیکھ لو یہاں ہم کس قدر روکے پیچھے بیٹھے ہیں۔“

اسنے میں ایک سائیکل رکشا گزرا جس میں ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی تھی۔ میں نے اشفاق حسین کو کہنی ماری۔ ”لو اپنی روکھ پھیک دور کر لو۔“

وہ ہنسا۔ بولا یار اس منظر سے تو روکھ پھیک اور بڑھ گئی ہے۔

”اس لئے کہ برقعہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”یہ برقعہ تو بالکل ہی برقعہ ہے۔“

”ہمارے ہاں بھی تو برقعے ہوتے ہیں۔“

”وہ برقعے اور یہ برقعہ اور۔“

”کس طرح۔“

”ہمارے ہاں تو برقعہ حسن کو اور بھی نمایاں کرتا ہے وہ تو ڈیکوریشن ہوتا ہے اور یہ

اس نے تو سرپوش کی طرح ڈھانپ رکھا ہے۔ مستور کر دیا ہے۔ اور پھر یہ خاتون تو خود برقعہ ہی بیٹھی۔ برقعے کے لوہے برقعہ۔“

میں اس وقت اوپر سے ایک سرٹلی سی آواز سنی دی۔ اشفاق چو نکا۔ ”یہ کیسی

آواز ہے۔“

”باجہ ہے۔“ میں سننے لگا۔

"اعلیٰ قسم کا باج ہے۔" وہ بولا "آرمن لگتا ہے۔"

ہم اٹھ بیٹھے۔ چوہدرے پر بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ نیمٹل سنگیت کہنی۔

"یہ تو دکان معلوم پڑتی ہے۔ چلو پوچھیں۔" وہ بولا۔

اوپر ایک بست بڑا کرا تھا جس میں سنگیت کے سارے تھے۔ ہارمونیم۔ طبلے۔ ستاریں۔ ایک بانگہ دو فلڈیز سے باتیں کر رہا تھا۔

"آؤ مدراج آؤ۔ بیٹھو۔" اس نے ہم سے کہا۔

ہم بیٹھ گئے۔

"میں ذرا امن سے فارغ ہو جاؤں۔" وہ بولا۔

وہ دونوں ستار کی خریداری کی بات کر رہے تھے ایک جرمن تھا ایک انگریز۔ انگریز باتیں کر رہا تھا۔ جرمن چپ چاپ بیٹھا مسکرائے جا رہا تھا۔

کچھ دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ پہلے تو اشفاق حسین چپ چاپ سنتا رہا۔ پھر دخل در معقولات سے بولا۔ "ایک بات بتائیے۔"

انگریز چلا۔

اشفاق حسین نے کہا۔ "آج کل یورپ میں ستار کیوں مقبول ہوتی جا رہی ہے؟"

سکھ نے جواب دیا۔ "مدراج میں پانچ سال پیرس میں رہ کر آیا ہوں۔ وہاں بھی بھاری ایک دکان ہے۔ ہم یہاں سے ستاریں منگواتے تھک جاتے تھے۔ وہاں یہ صورت تھی کہ آئی اور کی، آئی اور کی۔"

انگریز بولا۔ "یہاں مغرب کی دھن لگی ہے وہاں مشرق کی دھن سوار ہے۔"

جب فلڈیز چلے گئے تو اشفاق حسین نے تاروں کی بات پھیر دی۔

سکھ نے کہا۔ "مدراج۔ جتنی تاریں کہو۔"

اشفاق نے کہا "جرمنی کی بنی ہوں۔ تانپے کی ہوں۔"

"بالکل جرمنی کی۔" سکھ نے کہا۔ اور پھر تاروں کا ایک پلندہ لا کر بتا دے

سامنے ڈھیر کر دیا۔

اشفاق حسین نے اپنی مرضی کی تادریں جن لیں۔

جب ہم وہاں سے پیچھے اترے تو اشفاق نے فخر سے کہا۔ ”میں نے کہا نہ تھا یہ ہند ہے اور ہند سنگیت کا گھر ہے۔“

ستار کی تادریں اتنی آسانی سے مل گئیں تو ہم سمجھے کہ بڑے بڑے گائیکوں کی چیزیں بھی آسانی سے مل جائیں گی۔ لیکن اس روز ہم چاندنی چوک کے قرب و جوار میں دو گھنٹے سے سرگرداں پھرتے رہے لیکن کسی دکان سے شددہ سنگیت کے کیسٹ نہیں مل رہے تھے۔

کیسٹ بازار

ہمیں یوں سرگرداں دیکھ کر ایک لالہ جی رک گئے۔ کہنے لگے آپ کیسٹ ڈھونڈ رہے ہیں تو کیسٹ بازار میں جائیے۔ انہوں نے ہمیں راستہ سبھا دیا۔

کیسٹ بازار کو دیکھ کر اشفاق حسین کی امیدیں پھر سے جاگ اٹھیں۔ کہنے لگے۔ ”اب آئے صحیح جگہ۔ اب سمجھ لو بات میں گئی۔“

پہلی دکان سے پوچھا تو دکاندار نے بات سننے بغیر ہی سر ہلا دیا۔ اور خود دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جب پچھلی دکان پر بھی یہی ہوا تو ہم شیشا گئے۔ ساتویں دکان میں ہم آرام سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جب دکاندار غلط ہوا تو اشفاق حسین نے پوچھا۔ ”مساراج ہمیں کچے راگ کے کچھ نمائے چاہیں۔ کہاں سے ملیں گے؟“

دکاندار بولا۔ ”کچے راگ کے کیسٹ اوھر تو نہیں ملیں گے۔ یہاں تو مسداج ملے گی میوزک ہے جتنی مرضی ہے لے لو۔“

”تو کہاں ملیں گے۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”وہ تو جی رہیں ہیں میں ملیں گے۔ اوھر دلی میں ہیں۔“

”ہند تو موسیقی کا گھر ہے مسداج۔“ میں نے کہا۔

”ہو گا مسداج۔“ دکاندار بولا۔ ”پر اوھر تو فلم گیت کے سوا کوئی شے

”نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جنگ چلنے لگے فلسی کیسٹ ہی دے دیجئے۔“

”جون ساماگو مہدرج۔“

”کلا جھریا کا دے دیجئے۔“ میں نے کہا۔

”کلا جھریا۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”وہ کون ہے جی۔ ہم نے تو نام نہیں

سنّا۔“

میں نے کہا۔ ”مہدرج وہ مشہور گانے والی تھی پرانے زمانے کی۔“

”نہ مہدرج۔ پرانے زمانے کے نہیں چلتے۔ اور تو نئے زمانے کے چلتے ہیں۔“

پاپ میوزک۔“

کیسٹ بازار میں کوئی میں بائیس دکانیں تھیں۔ ہم نے کوئی دکان نہ چھوڑی۔ ہر جگہ

سے وہی جواب ملا۔

دفنہ اشفاق حسین کے پاؤں لٹکوانے لگے۔ بولا۔ ”نہیں بیٹو

جائیں۔“

سکرٹ اور پونی ٹیل

ہم پھر سے ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھ گئے۔ دیر تک ہم چپ چاپ بیٹھے

رہے۔ باہر سے اسے تھکا دیا تھا اس لئے وہ چپ تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ اگر کوئی بات کی تو وہ

توڑ جائے گا۔

دفنہ ساتھ والی کھلی سٹیکوں کا ایک غول نکلا۔ چھوٹی چھوٹی

خوبصورت صاف ستھری زندگی سے بھرپور۔ صندب پچیاں۔

ان بچوں نے نیلے رنگ کے کالٹن کے سکرٹ پہن رکھے تھے۔ لوہر سفید بلاؤز،

سفید سوزے اور جوتے۔ بال انگریزی اسٹائل کے۔

اسنے سارے خوبصورت بچے دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔

”ضرور کوئی انگلش سکول لڑا ہے۔“ میں نے کہا۔

”سہ ہو گئی۔“ اشفاق حسین بولا۔ ”بالکل ہی انگریزی۔ ذرا فرق جس تو

”نہیں۔“

”ہندو سے مجھے امید نہ تھی۔“ میں نے کہا کہ وہ اس قدر مغرب پسند ہو جائیں گے۔

”ہم کیا کم ہیں۔“ اشفاق نے کہا۔

”جب انگریز گیا تھا تو لاہور میں سات انگلیش سکول تھے۔ اب ۳۱۶ ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

وہ خاموش ہو گیا۔

دیر تک ہم خاموش رہے۔

پھر میں نے اسے چو لکایا ”کیا سوچ رہے ہو۔“

”میں سوچ رہا ہوں“ وہ بولا کہ ”جیسے میں راگ و دیا کا گھر سمجھ رہا تھا۔ وہ تو راگ و دیا کا قبرستان بن گیا ہے۔“

”کیوں۔“

”جس دیس کی چھیاں سکرٹ اور بلاؤز پہنتی ہیں۔ سفید رنگ کی جڑائیں پہنتی

ہیں اور پوٹی نیل جلتی ہیں وہاں ہندوئی راگ و دیا کا قبرستان نہیں بنے گا تو کہاں بنے گا۔“

زیارتیں

ایک روز صبح سویرے ہی چھوٹی واڑھی والا نوجوان ہال میں گھوم پھر رہا تھا۔
 چھوٹی واڑھی والا ایک جانب توجہ کر رہا تھا۔ اس کے گرد کارخ باہر کی جانب
 تھا۔ اندر کی جانب نہیں۔ جسے عام طور پر ایکسٹریورٹ کہتے ہیں۔ مقصد تھا۔ باؤنی تھا
 چاک وچو بند تھا۔ اس میں ذرا الجھک نہ تھی۔ برتاؤ میں بے تکلف تھا۔
 امرتسر کے شیشین پر وہ دفعتاً نمودار ہوا تھا۔ دلی تک اس نے ہمارے
 ساتھ سفر کیا تھا۔ دلی شیشین سے سکاؤٹ کیمپ تک ہمارے ساتھ آیا تھا۔ یوں دائرین سے
 گپ شپ ملتا رہا جیسے ہم میں سے ہو۔ پھر دفعتاً گم ہو جاتا۔
 پھر کسی روز بن بٹائے۔ بن بٹا کر دیکھ کر وہ گم ہو گیا تھا یا کیوں گم ہو گیا تھا یا کبھی رہا
 تھا۔ وہ نوھر اوسر سے دفعتاً یوں نمودار ہوتا اور ہم میں شامل ہو جاتا جیسے گم ہوا
 ہی نہ ہو۔ جیسے مسلسل ہمارے ساتھ رہا ہو۔

وہ آرہے ہیں:

ایک روز اس نے آکر اعلان کیا۔ ”وہ آرہے ہیں۔“ اس پر بھی چونکے۔ کون
 آرہے ہیں۔

”میں کہتا ہوں وہ خود آرہے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”وہ خود۔“

”کہیں آرہے ہیں“ دائرین نے پوچھا۔

"یہاں آرہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "خود۔ یہ کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں۔"

"یہاں کہاں۔"

"ڈائریں سے ملنے آرہے ہیں۔"

"کیا کہا ہم سے ملنے آرہے ہیں۔ ہم سے۔"

"ہاں۔ آپ سب سے ملنے آرہے ہیں۔"

"نہیں یاد بخول نہ کر۔" ایک صاحب بولے۔ "ہم سے ملنے کون آتا ہے۔"

"میں جو کہ رہا ہوں کہ وہ آرہے ہیں۔" چھوٹی دائی والی سنجیدہ ہو کر

بولی۔

"سچ کہ رہا ہے کیا۔"

"بالکل۔" وہ بولا۔ "انہوں نے خود فرمایا ہے کہ ہم جائیں گے۔"

اس پر سارے کیپ میں شور مچ گیا۔

"بھئی سنا تم نے۔ وہ آرہے ہیں۔"

"یار اوجھڑا حشر نہ جانا۔ وہ آرہے ہیں۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جانے کا۔"

"یہ کوئی چھوٹی موٹی بات نہیں۔ وہ ہر جگہ نہیں جاتے۔ ہاں۔"

"بالکل ٹھیک۔ سمجھ لو ہند میں وہ ہمارے ملے ہوئے ہیں۔"

"سولہ آنے بات کی تو نے۔"

میں نے کہا۔ "بھئی ہاں کے اندر صفائی دیکھ کر لو۔" ایک بزرگ بولے۔

"جنہیں ٹھیک ٹھاک رکھ لو وہ آرہے ہیں۔"

دوسرے صاحب بولے۔ "جنت اب اگر وہ دوپہر کے وقت آئیں تو بڑا اچھا

رہے۔"

"کیوں" کسی نے پوچھا۔ "دوپہر کے وقت کیوں۔"

"ہو وہ دوپہر یا سہ پہر کے وقت آئیں تو انہیں ہاں کے اندر بٹھانا۔ ذرا اس شور کا

مرا کچھ لیں۔"

"ہاں گرمی کے بجھا کے انھیں گے تو انھیں پتہ تو چلے گا نا۔"

"باہر بٹھانے میں کیا حرج ہے۔" ایک اور صاحب بولے "ڈراکھیوں کا ساں

بھی دیکھ لیں گے۔"

"اوصوں۔ ایسی باتیں ٹھیک نہیں" چھوٹی دائرہ والی سنجیدہ ہو کر بولا۔ "بھئی وہ

تو آپ سب سے ملاقات کرنے آئیں گے خود۔"

"کیوں ٹھیک کیوں نہیں۔ بھائی صاحب ہمیں جو جو تکلیفیں ہیں یہاں انھیں نہ بتائیں

تو کسے بتائیں۔ یہاں ہند میں ہمارا اور کون ہے۔"

"بھئی تکلیفیں ہوتی ہی ہیں۔" ایک معمر دائرہ بولا "ایسی بات ان سے کہنا مناسب

نہیں۔ ایک اعلیٰ عہدہ دار اپنی مصروفیات کو چھوڑ کر خود آپ سے ملے آئے اور آپ شکایات کا

دفتر کھول بیٹھیں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

خود:

"ہاگل ٹھیک کہتے ہیں یہ۔" ایک بزرگ دائرہ بولے۔

"ہاں ہاں ان کی بڑی کرم نوازی ہے جو ہم سے ملنے کے لئے آ رہے ہیں۔" ایک

اور معمر سید صاحب بولے۔

"یار ان سے آگہہ جانے کی بات نہ کی جائے۔"

"کیوں نہ کی جائے۔" ایک نوجوان نے کہا "اگر وہ ہند سرکار سے بات کریں

تویں ... " اس نے چنگلی بجا کر کہا "ہاں یوں اجازت مل جائے آگہہ جانے کی۔"

"وہ کر رہے ہیں۔ وہ کر رہے ہیں۔" چھوٹی دائرہ والی نے کہا۔ "وہ آپ

کے لئے کچھ کر رہے ہیں۔"

"پھر تو سمجھو آگہہ کی بات نہ کی جائے گی۔"

"ہاں بھئی اگر وہ کر رہے ہیں تو پھر کیسے نہ بنے گی۔ ضرور بنے گی۔"

"مشکل یہ ہے کہ چھوٹی دائرہ والی نے کہا کہ آپ کا آگہہ جانے کا کاغذ

اسلام آباد والوں نے بھیجا ہی نہیں وہ نہ کوئی بات ہی نہ تھی ان کے لئے۔"

”ہے نہیں کیوں نہیں بھیجا۔“

”کون پروا کر رہا ہے جی کاغذ بھیجنے کی۔“

”ہٹاؤ جی۔“ ایک بزرگ بولے۔ ”آخر اسنے سدرے اشتیاقات تو کئے ہیں نا۔

آکرے کی بات رو مکی تو کیا ہوا۔“

”ہاں جی۔“ ایک اور معمر صاحب بولے ”یہ کیا تم ہے کہ وہ ہم سے ملنے آرہے

ہیں۔ خود۔“

”ہاں ہاں بالکل بالکل۔ بڑی بات ہے جی۔“

چھوٹی واڑھی والے نے ان کے آنے کی خبر کا پتھر ایسا مارا کہ سداون دائرین کے

تالاب میں لہریں چلتی رہیں۔ ہر طرف ایک ہی سرکوشی چلتی رہی۔ وہ آرہے ہیں خود۔

میں نے دوڑ کر اندر اشتیاق حسین کو بتایا۔ میں نے کہا۔ ”سنا تم نے وہ آرہے ہیں

خود۔“

”کون آرہے ہیں۔“ اشتیاق حسین نے پوچھا۔

”بھئی دائرین سے ملنے آرہے ہیں وہ۔“

بڑی خوشی کی بات ہے ”بولا“ جم جم آئیں۔ پر ہم اپنا پروگرام نہیں بدل سکتے آج

کا۔“

”نہیں نہیں“ ہلدا پڑوسی بولا ”آج نہیں آرہے۔“

”تو کب آئیں گے“ اشتیاق حسین نے پوچھا۔

بڑے لوگ

”وہ۔“ چھوٹی واڑھی والا کہہ رہا تھا۔ ابھی تو انہوں نے آنے کا ارادہ کیا ہے۔

ابھی پروگرام مرتب نہیں ہوا۔“ معمر صاحب بولے۔

”اچھا اچھا۔“ اشتیاق حسین بولا۔ ”بسم اللہ جب جی چاہئے آئیں۔“

ایک بزرگ جن کی چادر پانی ہم سے کافی دور تھی وہیں سے چلا کر بولے۔

”اگر آئیں یا نہ آئیں۔ ملاقات تو ہر حال ہوگی۔“

”ملاقات ہر حال کیسے ہوگی؟“ پڑوسی بولا۔

”عرس کے روز بسر حال ہوگی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”بھائی صاحب عرس پر تو وہ بسر حال آئیں گے۔“

”لوٹوں۔۔۔“ ان کے قریب بیٹھے ہوئے صاحب بولے۔ ”عرس پر نہیں آیا

کرتے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے مسلمان کے تلواریں پر تو ضرور آتے ہوں گے۔“

”میں ادھر کنی بار آیا ہوں عرس پر۔ اجیر شریف بھی عرس پر حاضری دی ہے۔

میں نے کبھی دیکھا نہیں کسی کو عرس پر آتے۔“

”سنا ہے۔“ پڑوسی نے کہا ”حضرت امیر خسروؒ کے عرس پر ہند سرکار اپنا ایک

روز بے ضرور بھیجتی ہے۔“

”اچھا۔ بڑی اچھی بات ہے۔“

”لو جی بہت سے ہندو اور سکھ عرس پر آتے ہیں۔“

”ہاں جی عقیدت کی بات ہے۔“

”اس روز بھی تو ہندوؤں کا ایک ٹولہ کھڑا نہیں بھاٹا ہوا آیا تھا۔ حضرت نظام الدین

کے مزار پر۔“

”کیوں نہ آئیں ان کے در پر۔“ مہر صاحب بولے۔ ”نظام الدین اپنے زمانے

میں عوام سے بڑے چاک سے ملتے تھے۔ چاہے کوئی بھی ہو۔ ہندو ہو یا مسلمان ہو۔ لیکن

بادشاہ ملنے کی درخواست کرتے تو تیل دیتے تھے۔ بڑے آدمیوں سے ملنے سے گرج کرتے

تھے۔ بلکہ کھانا بھیجتے تھے کہ آپ اس دروازے سے داخل ہوں گے تو ہم اس دروازے سے

باہر نکل جائیں گے۔“

”ہانکل ہانکل۔“ بزرگ صاحب بولے ”شاید اب بھی وہ بڑے آدمیوں کو مزار

پر آنے نہ دیتے ہوں۔“

”پھر تو مشکل ہے۔“ ”نوجوان بولا۔

”کیا مشکل ہے۔“

”پھر تو شاید وہ نہ آئیں۔ خود۔“

”کیوں نہ آئیں۔“

”آپ خود ہی فرما رہے ہیں کہ بڑے آدمیوں کو حضرت عظام الدینؒ آنے نہیں دیتے۔“

”میں نے تو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ وہ عرس پر نہیں آتے۔ اس کے باوجود وہ یہاں آ رہے ہیں۔ ڈائریں کو ملنے۔“

اس پر ولہ ولہ کا شور مچ گیا۔

اگلے روز جب میں ہوٹل کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں مجھے چھوٹی دلازمی والا نوجوان مل گیا۔ بڑے ہچاک سے مجھے ملا۔

میں نے کہا۔ ”جناب آپ کس رہے تھے کہ وہ آ رہے ہیں۔“

”ہاں ہاں“ وہ بولا ”یقیناً آ رہے ہیں لیکن۔۔۔“

”کب آ رہے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”ان کی خواہش تو ہے کہ وہ ڈائریں سے آ کر ملیں۔ لیکن۔“

”لیکن کیا۔“ میں نے پوچھا۔

”بڑی مصروفیت ہوتی ہے انہیں۔ بالکل وقت نہیں ملتا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ مصروفیت تو ہوتی ہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”دیکھو۔“ وہ بولا ”اگر وہ خود آ سکتے تو شاید شیخ صاحب کو بھیج دیں۔“

”وہ کون ہیں شیخ صاحب۔“ میں نے پوچھا۔

”وہ اہلے کچلر اماٹی ہیں آپ نہیں جانتے انہیں۔“

”نہیں، مجھ میں بڑے آدمیوں کو کیسے جانوں گا بھلا۔“

”وہ ڈائریں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ ہاں۔“

”پھر تو عرس پر تشریف لائیں گے۔“

”عرس میں تو خیر نہیں آ سکیں گے۔“

”عرس بھی تو کچلر ہوتا ہے۔“

”ہاں ہوتا ہے لیکن وہ شائق سرگرمیوں میں حصہ لینے کا بہت شوق رکھتے

”پچھل اٹھنی جو ہوئے۔“ میں نے کہا۔
 ”نہیں نہیں۔“ وہ بولا ”آپ کو نہیں پتہ وہ بہت بڑے ادیب اور فن شناس
 ہیں۔“
 ”اچھا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”یہاں بڑے پچھل وفد آتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی دو
 شاعر آئے ہوئے ہیں۔“ اس لئے وہ بہت مصروف ہیں۔ بالکل فرصت نہیں۔“

فرض اور سبکدوش

دو ایک دن کے بعد سویرے ہی ہال میں شور مچ گیا۔ چلو بھئی چلو۔ جلدی
 کرو۔

”کیوں کیا ہوا۔“

”اپنا اپنا حصہ لے لو بھئی۔“

”حصہ۔ کیا حصہ۔“

”وہی۔ ہندی روپے میں رقم۔“

”اچھا توچہ کامل رہا ہے۔“

”ہاں لیڈر صاحب کا کہنا ہے ہمیں اس فرض سے جلد سبکدوش کر دیا
 جائے۔“

خود ہی سبکدوش نہیں ہونا چاہتے ورنہ ساری رقم ایک ہی وفد ہاتھ میں تھا
 دیں۔“ نوتوان بولا۔

”ہاں ہار۔ یہ قسطوں میں کیوں دیتے ہیں۔ رقم تو ہماری اپنی ہے۔“

”ایک ہی مرتبہ کیسے دے دیں۔ بھئی وہ ڈرتے ہیں کہ ہم ایک دم ساری خرچ نہ کر
 دیں۔“

اس پر سارے ہال میں قہقہہ گونجا۔

”یہ کیا آخری قسط ہے۔“ ایک نے پوچھا۔

”لوگوں۔“ ایک دائرہ جو رقم وصول کر کے آ رہا تھا، بولا ”صرف سو روپے دے

رہے ہیں۔"

"نکلنا حلالیٰ سو واجب الادا ہے۔" منتر صاحب نے کہا۔

"دوسرا سو تو آج مل رہا ہے نا۔"

"اور باقی پچاس کیا لاہور میں جا کر دیں گے۔" نوجوان بولا۔

"نمبر چالیس۔" باہر سے آواز آئی۔ پھر ایک صاحب داخل ہو کر بولے۔

"کیوں بھی کوئی ہے نمبر چالیس۔ حاضر ہو جائے اور لیڈران کے کمرے میں۔"

یہ سن کر میں چو نکلا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نمبر چالیس ہوں۔

لیڈران کمرے کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ سب آرام سے اپنی اپنی چادر پائی پر

دراز ہیں۔ اور خزان ایک کرسی میں بیٹھایوں روپے بانٹ رہا ہے جیسے اپنے پلے سے دھن کر رہا ہو۔

"آپ کے مزاج اچھے ہیں۔" لیڈر صاحب نے مجھے دیکھ کر نہایت اخلاق سے

کہا۔

"جی آپ کی بڑی نوازش ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں۔"

"نہیں جناب۔ تکلیف کیسی۔"

"کوئی تکلیف ہو تو آپ ہم سے کہیں۔" انہوں نے بڑے پیار اور دریا دہی سے

کہا۔

"یقیناً جناب یقیناً۔" میں نے یوں جواب دیا جیسے تکی حمام کی

بجائے میں شاہی بلاغ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور ٹیکر کی چھانوں میں بیٹھ کر نکلیں اڑانا میرا سوردلیٰ شغل تھا۔

آگئے آگئے

میں اس وقت پھوٹی داڑھی والا داخل ہوا "وہ آرہے ہیں۔ وہ آرہے ہیں۔"

وہ یوں انہیلا بھری سرکشی میں بولا جیسے حضرت امیر خسرو "بخس نہیں تقریف فرما ہو رہے

ہوں۔۔۔" انہوں نے۔ "وہ بولا "خود نہیں، فٹ سیکر ٹری صاحب کو بھیجا ہے۔"

لیڈرن کرام پک کر اٹھ بیٹھے۔ ایک سماعت میں جب دو ستار اپنے اپنے مقام پر قائم ہو گئے اور لیڈر صاحب کے چہرے پر ایک روحانی مجسم بچھل گیا۔ وہ سب دروازے کی طرف دوڑے۔

دروازے سے باہر ایک لونچا لبا ٹھنص کھڑا تھا۔ کھلا کھلا رنگ۔ متناسب خدو خصل۔ چہرے پر ذہانت اور کچھ کے واضح نشان۔ بدن متناسب۔ شلو اور قیص میں ملیوس۔ انداز میں ٹھہراؤ۔ چہرے پر سکون۔ وقار۔ احساس برتری۔

ہادی ہادی انہوں نے سب سے ہاتھ ملایا جب میری ہادی آئی تو میرے ہاتھ میں ایک ٹھنڈا ہے جان ہاتھ تھا۔ جیسے وہ اکیسویں لٹڈ سے خاص طور پر میرے لئے سپورٹ کیا گیا ہو۔

زائرین جذبہ شوق اور مسرت سے چٹک رہے تھے۔ آگے آگے آگے۔
وہ ہر ایک سے ہادی ہادی پوچھ رہے تھے ”مزاج اچھے ہیں۔“ یہ سوال شکم کم تھا اور اشد لائق زیادہ۔ انہوں نے کسی سے نہ پوچھا۔ کوئی تکلیف تو نہیں۔ پوچھ لیتے تو بھڑوں کا پھڑک جاتا۔

پچھتہ ہر حال معزز معائن کو دیکھ کر ہم اس قدر حیرت ہوئے کہ نہ گری یاد رہی نہ سمجھیں کی جہ اپونگی۔

جب وہ رخصت ہوئے تو تمام زائرین نے سوچا کہ خدا حافظ کہا۔

معر صاحب پوئے ”الحمد للہ کہ زیارت ہو گئی۔“

بے شک بے شک کی آوازیں گونجیں۔

”سلطنت کے سوا یہاں ہلکا ہے ہی کون۔“

وعدہ فل جلب

بڑی طاقت نے سوچ بچل کر کے حالات کو قابو میں لانے کے لئے فیصلہ کیا کہ صدر ایوب کو راہ راست پر لانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے حشر کو الگ کر دیا جائے۔ انہوں نے صدر کو صاف صاف کہہ دیا کہ قدرت اللہ شباب کو شعبہ اطلاعات سے الگ کر دیا جائے۔

صدر ایوب نے سوچا کہ اتنی سی بات سے بڑی طاقتوں کی خشتوری حاصل ہوتی ہے تو کیا حرج ہے۔

صدر نے قدرت کو بلا کر پوچھا۔ آپ کون سا ٹکڑا لینا پسند کریں گے۔

قدرت اللہ ہمانپ گئے۔ بولے۔ ”میں ریٹائر ہونا پسند کروں گا۔“

صدر کو یہ بات گوارہ نہ تھی۔

وہ تک مذاکرات جاری رہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ قدرت اللہ شہب کو ہائیڈ کا سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔

ایک سال کے بعد قدرت پھنسی پر آئے تو میں نے ان سے پوچھا۔ ”یہ نوکری کیسی

رہی۔“

بولے۔ ”دعزہ قل جاب۔“

”پھر بھی کتنی دعزہ قل۔“

بولے۔ ”اُمی دعزہ قل جاب مجھے آج تک نہیں ملی تھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس نوکری میں کیا ٹوٹی ہے۔“

بولے۔ ”ٹوٹیاں سی ٹوٹیاں ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”شفا۔“

بولے۔ ”شفا بولنا نہیں پڑتا۔“

”اور“

”مانا ملنا نہیں پڑتا۔“

”اور“

”ٹکسٹا نہیں پڑتا۔“

میں نے کہا۔ ”کچھ نوکرنا پڑتا ہو گا۔“

بولے۔ ”چار ایک کام کرنے پڑتے ہیں۔ ایک یہ کہ ڈیپلومک فنکشن کے لئے

ڈریس اپ کرنا پڑتا ہے۔ پھر حاضری دینی پڑتی ہے۔ سر جھکانا پڑتا ہے اور مسلسل مسکراتا

پڑتا ہے۔“

”اور دفتر میں کیا کرنا پڑتا ہے۔“

"منجیدگی سے سر اٹھا کر دیکھنا اور سر ملانا۔"

"اور۔" میں نے پوچھا۔

"جتنا کم بولواتے کامیاب۔ جتنے کم ملواتے باعزت۔ ذرا مشکل کام ہے۔"

"کیا۔" میں نے پوچھا۔

"کم بولنا مشکل کام ہے لیکن مجھے سوٹ کرتا ہے۔"

"آپ تو کہتے تھے بڑی اچھی نوکری ہے۔"

"ہے۔" وہ بولے "غیر فیل جاب۔ جو عبادت کرتا چاہے اس کے لئے بہت

سوزوں ہے۔ جو تصنیف کرتا چاہے اس کے لئے بہت محنت ہے۔ جو مطالعہ کرتا چاہے اس

کے لئے بہت اچھی۔"

"میں نے سنا ہے وہاں ذلت پات بہت ہوتی ہے۔"

"قدرت مسکرائے۔" اس کے سوا کچھ ہو نہ سکتی تھی۔

قدرت کی بات یاد آئی تو میں نے معزز صہبان کا از سر نو جائزہ لیا۔ وہ جلاب نظر

صورت، منہ بھرا غل، برتاؤ میں ٹھہرنا، سکون، خاموشی، جلی سی مسکراہٹ اور پردہ دار

انداز۔۔۔ میری ساری شکایات دور ہو گئیں۔ بے شک انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسے وہ

تھے۔

جب وہ چلے گئے تو لیڈر صاحب نے سب وزٹین کو اکٹھا کیا۔ بولے "آپ سب کو

یہ جان کر خوشی ہوگی کہ کل ہم دہلی کی زیارتیں کریں گے۔ آپ سب صبح دس بجے تیار ہو

رہیں۔ ہم نے بسوں کا انتظام کر لیا ہے۔ دس بجے دونوں بسیں یہاں پہنچ جائیں گی۔

بیکور ہٹی نے ہمیں اجازت دے دی ہے۔ ہر حال وہ لوگ جو ہمارے ساتھ زیارتوں پر جانا

چاہیں کوئی دقتی پروگرام نہ بنائیں۔

اگلے روز صبح دس بجے دونوں بسیں۔ بھوٹ کیمپ کے احاطے میں آکھڑی ہو

گئیں۔ وزٹین بسوں میں سوار ہو گئے اور ہمارا قافلہ چل پڑا۔

دم پخت

ابھی ہم سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ لیڈر نے بسوں کو روکنے کا حکم دیا۔ بسیں رک

گئیں۔ لیڈر صاحب باہر نکلے اور سکاؤٹ کمپ سے ملحقہ عمارت میں داخل ہو گئے۔
اس روز شدید گرمی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔

بس کھڑی ہو گئی تو ساری سواریاں گویا دم پنت ہو گئیں۔ پھر گرمی نے رنگ دکھایا۔ مزاجوں میں تھپی پیدا ہو گئی۔ کسی نے دل فٹھا کرنے کے لئے پھر سے آکرے کا ذکر پھینڈ دیا۔ بولا۔ "افسوس کی بات ہے ہم آکرے سے محروم رہے۔"

نوجوان ڈانز بولا۔ ہم محروم ہونے والے نہیں۔ ہم تو آگرہ دیکھ بھی آئے۔
"ارے۔۔۔" سب حیرت سے بولے "وہ کیسے۔"

نوجوان نے مونچھے مردوڑ کر کہا۔ "ہمیں کون روک سکتا ہے جی۔ بھلا کوئی بات ہے کہ دلی آؤ اور آگرہ نہ دیکھو۔"

"لیکن کیسے دیکھا۔۔۔" دو ایک نے پوچھا۔

"سوئے میں دیکھا ہو گا۔" ایک معمر صاحب بولے۔

"سوئے میں نہیں جناب جاگتے میں دیکھا۔"

"لیکن گئے کیسے۔"

"بس میں بیٹھے ٹکٹ خرید اور آگرہ جا بیٹھے۔"

"اور جو پکڑے جاتے تو۔"

"پکڑے جاتے تو پھر والے ادھر کمپ میں لے آتے اور کیا۔"

"کیسا رہا آگرہ۔" معمر صاحب نے پوچھا۔

"واہ کیا جنت بکلی ہے مغلوں نے۔"

"بہت بڑے معمار تھے۔ کیا کہنا ہے۔"

"اوھر دلی ہی میں دیکھ لو۔ چپے چپے پر مسلمانوں کی یادگاریں ہیں۔"

"انہیں دیکھ کر دلی والوں کو مسلمانوں کی عظمت کا احساس نہیں ہوتا کیا۔"

"ہوتا ہے ہوتا ہے۔ لیکن یادگاروں کو دیکھ کر انہیں فخر آتا ہے۔ کہتے ہیں ان کا

نام ونگھان مٹا دو۔"

اس پر بس میں قہقہہ گونجا۔

"بھئی وہ لیڈر صاحب کیا ہوئے"

”بھئی آتے ہیں۔“

”جب تک اپنا تو شیرہ چو جائے گا۔“

”ہاں بھئی دیکھو تو سہی کیا کر رہے ہیں لیڈر۔“

”میں جیوں۔“ بس سے باہر کھڑے زائر نے کہا۔ ”اندر ٹیلی فون کر رہے

ہیں۔“

”ٹیلی فون کر رہے ہیں یا پائے نکار رہے ہیں۔“

”برا حال ہو رہا ہے یار۔ اپنا تو۔“

”انہیں احساس بھی ہو کہ تیس آدمی اوھر گری میں اٹل رہے ہیں۔“

”کبھی لیڈر کو بھی دوسروں کا احساس ہوا ہے۔“

”ساتھیوں کا احساس ہو تو پھر وہ لیڈر کیسا۔“

”میں دلاؤں گا احساس“ نوجوان بولا۔

”تم کیسے دلاؤ گے میاں“ بزرگ بولے ”ساری قوم گزشتہ اتنے برس سے نہ دلا

سکی۔“

”وٹا یار ذرا آواز۔“

اس پر بھی ہادی ہادی چلائے گئے۔ ”لیڈر صاحب آجائے اپ۔“

”بہت ہوئی جناب۔“

”اپنا تو کھاتہ ہو گیا۔ دم پخت ہو گئے۔“

آواز میں سن کر لیڈر صاحب باہر نکلے۔ بولے ”مجھے غم نہ ہے کہ ..“

”ہونا چاہئے ضرور ہونا چاہئے۔“

”در اصل کنکشن نہیں مل رہا تھا۔“

”اوھر ہم سب ڈسکالٹ ہوئے بیٹھے ہیں۔“

”لیڈر صاحب نے فضا کا رنگ دیکھا تو چپ ہو گئے اور آکر بس کے اندر بیٹھ

گئے۔“

زائر چلائے ”چلو بھئی چلو۔ اپنا تو مریہ بن گیا۔“

ڈرائیوروں نے انہیں اشارت کیس اور تھقلہ پھر سے روانہ ہو گیا۔

کچھ بے کچھ:

اس وقت تقریباً گیارہ بجے تھے۔ سڑکوں پر کوئی رش نہ تھا۔ نئی دلی کی دکانوں پر بھی بھیڑ نہ تھی۔ بیومنٹ پر بھی اکاد کالوگ نظر آرہے تھے۔ پھر صرف بس سٹاپوں پر کچھ لوگ کھڑے نظر آتے تھے۔

”یار یہ دیر لائی سی کیوں ہے اوھر۔“ ایک نے پوچھا۔

دوسرا بولا ”شام کو رونق ہوتی ہے۔“

”شام کو۔۔۔“ اشفاق حسین نے دہرایا۔ ”ہم نے تو نہیں دیکھی۔“

”پتہ نہیں کیا بات ہے۔“ معر صاحب بولے ”بھیڑ ہے پر گھبراہٹ نہیں۔ لوگ

ہیں پر رونق نہیں۔ سوئریں ہیں پر سڑک اونگھ رہی ہے۔“

”بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

اس پر بس میں خاموشی طاری ہو گئی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایک صاحب بولے۔ ”ہم جاگناں رہے ہیں؟“

”زیادہ ترس کرنے۔“

”وہ تو ہے پر اس وقت کون سی زیارت پر جا رہے ہیں۔“

”کیا پتہ۔ لیڈر صاحب سے پوچھو۔“

لیڈر بولے ”جناب پہلے ہم حضرت قطب صاحب کے حوالہ اقدس پر حاضری دیں

گے۔ پھر قطب چیتا دیکھیں گے اس کے بعد شلو چراغ دہلوی کے حوالہ پر حاضری دیں گے

پھر حضرت باقی ہاشم اور آخر میں جناب محدث دہلوی صاحب۔ اس کے بعد جامع مسجد فتح گڑ

جواڑز واپس آنا چاہیں آ جائیں۔ جو وہیں رکنا چاہئے رک جائیں۔“

حضرت قطب صاحب کے حوالہ پر پہنچے تو اشفاق حسین نے مجھے کہنی ہلای بولا۔ ”یار

بڑا اچھا ہوا کہ یہاں آگئے میرا جی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر حاضری دوں۔“

”اچھا۔“ میں نے طنز کیا۔ ”تو تو بزرگوں کو بلاتا ہی نہیں۔“

”دراصل۔۔۔“ وہ بولا ”مجھے بزرگوں کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”مجھے بھی تو سمجھ میں نہیں آتیں۔“

"پھر تو ایک ہی بات ہے۔" وہ بولا۔

"ایک بات نہیں بڑا فرق ہے۔"

"کیا۔" اس نے پوچھا۔

"تو سمجھ کر رہتا ہے۔ میں بن کبے رہتا ہوں۔ یہ بزرگ لوگ اتنے بڑے ہیں اتنے

بڑے ہیں کہ میری جھوٹی سی سمجھ میں نہیں آتے۔ نہیں آ سکتے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔

"آج کی دنیا اپنی سمجھ کو بہت بڑا سمجھتی ہے۔ انکا بڑا کہ جو چیز اس میں فٹ نہ ہو اسے

نہیں مانتی۔"

اشفاق حسین خاموش ہو گیا۔

ہم دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

بادشاہ بغیر دربار

دفترا وہ بولا "اس حجاز شریف کی بات الگ ہے۔"

"وہ کیسے۔"

"میراجی چاہتا تھا کہ ایک بار پھر آؤں۔"

"اچھا۔ لیکن وجہ۔"

"پتہ نہیں" وہ بولا "یہاں آکر مجھے اک ان جہانی خوشی محسوس ہوتی ہے۔"

"اچھا۔"

"ہاں۔" وہ بولا "یہاں اک لطافت ہے۔ گھنٹی نہیں۔ وسعت ہے پابندی

نہیں آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ ہانک ویسے جیسے راتا کے دربار میں ہوتا ہے۔"

"اچھا۔" میں نے بات ختم کرنے کے لئے کہا۔

"تم نے کبھی سوچا ہے" وہ بولا۔

"کیا۔؟"

"کہ ہم اسے دربار کہتے ہیں۔ لیکن وہ دربار نہیں لگتا۔"

"کیوں۔"

”دربار وہ ہوتا ہے جہاں ایک بادشاہ ہو۔“

”بادشاہ تو ہیں وہ۔“ میں نے جواب دیا۔

”بے شک ہوں گے۔“ وہ بولا۔ ”لیکن وہاں وہ آکر درباریوں میں کھڑے ہو

جاتے ہیں۔ یوں جیسے ہم میں سے ہوں۔ انگ نہیں بیٹھتے۔“

”درویش کی یہی پہچان ہے کہ وہ ہوتے بادشاہ ہیں مگر انگ نہیں۔ بندوں کی سطوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔“

”بالکل۔“ وہ بولا ”اس لحاظ سے قطب صاحب بست بڑے درویش ہیں۔ بست بڑے۔“

ہمارے سامنے حضرت قطب الدین کے حزار کا صدر دروازہ تھا۔ وہی جوتے سنبھائے والا۔ وہی لمبی کلی۔ وہی بے رنگے بھکاری۔

کلی میں چلتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ اس روز تو شاہ بابا کا پیغام لایا تھا۔ اس حوالے نے میری ایک حیثیت پیدا کر دی تھی اس روز تو سور کے پر لگا کر آیا تھا آج تو کالا کوا ہوں۔ کیسے حضرت کے سامنے جا کھڑا ہوں گا۔ کیا کیوں گا۔

پھر شبیل آیا ہے کچھ بھی ہوں۔ کیوں نہ اپنا سلام پیش کر دوں۔

مجھے یاد آیا کہ بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر پہلے درود شریف پڑھتے ہیں تاکہ حضرت متوجہ ہوں پھر سلام عرض کرتے ہیں۔

حزار مہلک پر وہی روشنی تھی۔ وہی لطافت۔ وہی وسعت۔ میں ایک کونے میں سودا بند کھڑا ہو گیا اور درود شریف پڑھنے لگا۔

مجھے ایک ہی درود شریف یاد ہے جسے پڑھنے میں مجھے لذت حاصل ہوتی ہے۔ درود تاج میں نے درود تاج پڑھنا شروع کر دیا۔

میں اس وقت جب میں اپنا سلام حضرت کی خدمت میں پیش کرتا چاہتا تھا دلعت حزار مہلک میں شور و غل کا ایک دہرا چلتے لگا۔

لیڈر صاحب کی شکم و عاجز رہی ہو چکی تھی۔ میری بھڑبھڑی معدومیت کی پچھو ندیاں اڑ گئیں۔

ہماری دوسری زیارت قطب صاحب کی لاث تھی۔ قطب کی لاث کو میں نے اس زمانے میں دیکھا تھا جب میں لائل میں پڑھا کرتا تھا۔ اندازاً میں اسے ساٹھ پینسٹھ سال کے بعد دیکھ رہا تھا۔ لیکن جو خبی میں نے اس پر نگاہ ڈالی تو محسوس ہوا جیسے میں اس سے بے حد مانوس تھا۔ جیسے میں روزی اسے دیکھتا تھا۔

اتنی مانوسیت میں نے کبھی کسی جگہ کے لئے محسوس نہ کی تھی۔ پتہ نہیں اس لاث کا کیا افلاز ہے کہ وہ آپ کو یوں اپنائیتی ہے کہ حیرت یا اپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ایک ایک حجر مانوس تھا۔ دیواروں کا ایک ایک زاویہ مانوس تھا۔ دیواروں پر کندہ ایک ایک لفظ مانوس تھا۔ شاید اس لئے کہ زندگی میں ہم نے اس لاث کی تصویریں بد یاد دیکھی ہیں۔

میراجی چاہتا تھا اس عظیم عظمت کے سامنے چوکری مل کر بیٹھ جاؤں۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں گھر آ گیا تھا۔

وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ دروازے کے سامنے پائپ کا ایک جنگلا بنا ہوا تھا۔ میں اس جنگلے کے ایک پائپ پر بیٹھ گیا۔

اللہ کی شان ہے جس کی یہ لاث ہے۔ جسے دیکھنے پتہ نہیں کہاں کہاں سے لوگ آتے ہیں۔ وہ خود لاہور میں اندر کھلی کے بچکوازے ایک گہنم مکان کے نیچے گہنای میں پڑا سو رہا ہے۔ جہاں کوئی مقبرہ نہیں کوئی عمارت نہیں کھڑی کرنے والا کوئی حجر نہیں۔

ازمند پاس

مجھے ازمند پاس کی نظم یاد آگئی۔ کتنی عظیم نظم ہے۔ کتنا عظیم موضوع ہے۔

مجھے نظم پوری طرح تو یاد نہیں لیکن کچھ ایسا ہی مطلب ہے۔

”صحرا میں۔ حجر کے تھڑے پر ایک بت ایستادہ ہے۔“ نیچے عبارت کندہ

ہے۔

”میں ازمند پاس ہوں۔ دیکھو میرے ارد گرد دیکھو۔ یہ عالی شان عمارت پر شکوہ

محل عظیم، عالی شان ایوان یہ سب میں نے ہوائے ہیں۔ دیکھو میری عظمت کو دیکھو۔ میری ہیبت سے ڈرو۔“

پتھر کے اس بت کے ارد گرد جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ ریت ہی ریت پھیلی ہوئی ہے۔

تمام عظیم معملہ بلا خربت بن جاتے ہیں۔
صرف مسلم معملہ میرا ہیں۔ چونکہ ان کی تعمیرات کا رخ خود کی جانب نہیں ہوتا تھا۔

یہ پر ہیبت لاٹ یقیناً بت بن جاتی اور اس کا ہوانے والا ازمنہ پاس۔۔۔۔۔ اگر اس پر آیات قرآنی نقش نہ ہوتیں۔

آج محل میں کبھی یہ حسن یہ اندہ ہوتا اگر اسے ہوانے والے کا رخ محبوب کی جانب نہ ہوتا۔ ہر معملہ جس کی تعمیر کا مقصد ذات ہو ازمنہ پاس بن جاتا ہے۔

بولو مہاراج

پانچ ایک غیر ملکی سیاح بڑے فور سے لاٹ کو دیکھ رہے تھے۔ اس پر شوکت مہاراج کو دیکھ رہے تھے جو لاٹ کے متصل کھڑی ہے۔ بھارت کے نور ازم کے کارکنان سیاحوں کو لاٹ کی عظمت کے نکات سمجھا رہے تھے۔

میراجی چاہتا تھا کہ ان کھڑندوں سے چاکر پوچھوں۔

”مہاراج یہ آپ افسس کیا دکھا رہے ہیں۔

افسس اپنی دلی دکھائے۔ بیگنی چیزیں دکھانے سے فائدہ۔

جن مسلمانوں نے آپ کے دلش کو اتنی عظیم تعمیرات بخشی تھیں جنہوں نے دلی کے چپے چپے کو سجایا تھا۔ جنہوں نے آپ کے دلش کو تن من و حن سب کچھ دیا تھا۔ ان مسلمانوں کو آپ نے کیا دیا۔ انہوں نے پناہ گاہ کے طور پر ایک ٹکڑا زمین مانگا تھا۔ آپ نے فیس میں آکر خون کی ندیاں بہا دیں۔ لاشوں کے پٹھے لگا دیے۔ آج پچھتیس سال ہو چکے ہیں آپ کا عصر صفا نہیں ہوا۔ آپ کے سیکولر دلش میں فسادات کا تہا نہیں نوا۔“

”ذرا ان سیاحوں سے پوچھئے تو کیا یہ آپ کی دلی دیکھ رہے ہیں یا مسلمان

بادشاہوں کی ۔ یولو مدارج ۔ ”

سیلاب میں سوکھا

صرف قطب پنداری ایک ایسی جگہ تھی جہاں میرے خیالات میں کوئی نخل نہ ہوا۔
باقی تمام دیہاتیں حضرت باقی پانڈ۔ حضرت شاہ چراغ حضرت محدث دہلوی سب متکلم دعا
کے سیلاب میں بہہ گئیں اور میں سوکھا کا سوکھا رہ گیا۔
یہ سب میری ذات کا قصور ہے۔

میری ذات میں ایک بت ہے۔

میری عقیدت ابھرنے کے لئے تجلیہ مانگتی ہے۔

میرے مجددے شور و شغب کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

میری سرشاری عالم دربار میں رنگ نہیں لاتی۔

میری مانگ آوازی مٹکج نہیں۔

میری لگن اپنے اعمار کے لئے اشارے ڈھونڈتی ہے۔ وضاحت کی متحمل نہیں
ہوتی۔

میری دعا ایک منت ہے۔ ایک قرا ہے۔ ایک بیتی ہے۔ بے آواز ہے۔
الفاظ۔

میری معراج پردگی ہے۔ حوالگی ہے۔ معدومیت ہے۔

فرمائشیں

شام کا وقت تھا۔ تکی حمام ابھی تک اپن بھڑاس نکالنے میں شدت سے مصروف تھا۔ اندر بیٹھنا مشکل تھا۔ دائرین باہر گھاس پر چل پائیں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ کھیاں سورج کی آخر کرن کے ساتھ جا چکی تھی۔ باہر گھاس پر بیٹھنے کا یہ بہترین وقت تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا ہوا بند تھی، پھر بھی ہلکی ہلکی خشکی بوند بوند کر رہی تھی۔ اشفاق حسین اور میں دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ہم سے چند گزوں کے فاصلے پر دائرین کی محفل جی ہوئی تھی۔ با آواز باتوں کا تکر بندھا ہوا تھا جس میں قہقہے حیر رہے تھے۔

جھوٹکا

اشفاق حسین نے آہ بھری۔ "یار بات نہ بنی۔"

"کیوں۔" میں نے پوچھا۔

"کسی کی فرمائش پوری نہ کر سکے۔"

"کسی کی بات جھوٹا پی تو پوری ہو گئی نا۔"

"کیا مطلب؟" اس نے پوچھا۔

"بھئی ہو میو ویسی کی کتابیں لپٹے آئے تھے سول کنیں۔ بلکہ ساتھ ہمو نکاحی مل

کیا۔"

"جھوٹکا۔ کون سا جھوٹکا؟" اس نے پوچھا۔

"مکہوں کے ساتھ ساتھ اوشا مل گئی۔"

"اشفاق حسین ہنسا۔ تم اسے بھونکا کہتے ہو۔"

"اور کیا کہوں۔"

"نہیں یاد۔" وہ بولا۔ اس کے ساتھ انصاف کر۔"

"لوٹوں۔" میں نے جواب دیا۔ عورت کے ساتھ مرد کبھی انصاف نہیں

کر سکتا۔ فرشتے آکر کر لیں تو کر لیں۔"

"نہیں یاد۔" وہ بولا۔ "یہ غلط بیانی ہے۔ اوشا کی حیثیت لوٹتی ہے۔"

"جتنی لوٹتی چاہو اتنی لوٹتی کر دیتا ہوں۔ محبوبہ کی کر دوں۔"

"نہیں یاد۔" وہ مسکرایا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اچھا تو بڑی کی حیثیت ٹھیک رہے گی کیا۔"

"نہ سنس۔" وہ چلایا۔ یقین جانو میں نے اسے مرد کی حیثیت سے نہیں دیکھا

صرف فرد کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے آپ ملتے ہیں۔ کوئی

غرض نہیں ہوتی۔ کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ کوئی آرزو نہیں ہوتی لیکن وہ ایک خوشگوار اثر چھوڑ

جاتے ہیں۔ ایسا کہ سالہا سال زائل نہیں ہوتا۔ اوشا وہ اثر ہے۔"

کلی ڈیول

"بے شک۔" میں نے کہا۔ "بہر صورت۔ ہمیں کتابیں مل گئیں۔ ساتھ

مفت میں ایک خوشگوار اثر مل گیا۔ میری ستر کی بکریں مل گئیں۔ پھر تو کیوں آہیں

بھر رہا ہے کہ بات نہیں بنتی۔"

"میں اپنی بات نہیں کر رہا۔ میں تو بے کوٹ کر لئے جا رہا ہوں۔"

"کامیاب لیبیوں کو کبھی آہیں بھرتے دیکھا ہے تو نے۔" میں نے

پوچھا۔

"بہی میں اپنی صمیم دوسروں کی بات کر رہا ہوں۔"

"کیا ہے دوسروں کی بات۔"

"نہ نیچی سدا کی فرمائش پوری ہوئی نہ راگ و دیا کی۔ سکتے افسوس کی بات

"چھوڑ یاد دوسروں کو" میں نے کہا۔

"تو بڑا خود غرض ہے مفتی۔" وہ بولا۔

"ہوں۔" میں نے چھلتی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"بری بات ہے۔" وہ بولا

"بالکل نہیں۔" دیکھ جو اپنا نہیں بننا وہ دوسروں کا کیا بنے گا۔

"معتول بات۔ کتنی بات۔"

"بہی ام نے کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہے کہ نہیں۔"

"یہ تو ہے۔"

"تھ میں ایک صیب ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا۔" وہ بولا۔

"تم سو فی صد تدبیر پیے ہو۔"

"کیا مطلب۔"

"تدبیر پیے ہر بات اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ بھئی میرے کچھ باتیں اللہ کے ذمے ڈالنا بھی سیکھنا۔"

"میں نہیں سمجھا۔" وہ بولا۔

"میرا ایک بزرگ دوست ہے۔ وہ تین مرتبہ تدبیر کرتا ہے۔ تین دن دامن سے

کوشش کرتا ہے۔ پھر بھی کام نہ ہو تو وہ اس کام کو اللہ کے در پر رکھ دیتا ہے۔ کتا ہے۔ مجھ

سے تو یہ کام نہیں ہوا۔ اب میں اسے تیرے در پر رکھ رہا ہوں۔ چاہے تو کر دے نہیں تو

نہ سنی تیری مرضی۔ تو ملک ہے۔"

اشفاق حسین قندیلر کہ چلا۔ بولا "پار تو ٹیک کئی ڈیول ہے جو مجھے ایسے دوست

ملے ہیں۔ مجھے تو کبھی ایسا دوست نہیں ملا۔"

"ہاں ہوں۔ کئی ڈیول ہوں۔" میں نے کہا "دیکھ اشفاق حسین۔ ہم نے

جتنی کوشش ممکن تھی کر دیکھی۔ اب تو ان کالوں کو اللہ کے در پر رکھ دے۔ اسے منظور

ہوا تو ہو جائیں گے۔ نہیں تو نہ سنی۔ خود کو دیکھی نہ بنا۔ یہ کام نہ کر سکے تو چلو کوئی اور کام

کر لیں۔ "

ان کسی

"اور کام۔" وہ بولا۔ "اور کون سا کام۔"

"ایک اور فرمائش جو ہے اسے پورا کر لیں۔"

"اور فرمائش تو کسی نے کی ہی نہیں۔ کون سی فرمائش کی بات کر رہے ہو؟"

"ہے ایک فرمائش۔"

"میں کہتا ہوں اور فرمائش کسی نے کی ہی نہیں۔" وہ چمکیا۔

"وہ ایک ان کسی فرمائش ہے۔"

"بھئی یہ جو گمراہی ہوتی ہے۔ اول تو وہ فرمائش کئے بغیر رہتی نہیں۔ اور اگر نہ

سے نہ کرے تو دل ہی دل میں کہتی ہے۔ دیکھوں یہ میرے لئے کیا لاتا ہے۔"

اشفاق حسین قصبہ مارکہ ہنسا۔ کہنے لگا "یار میری گمراہی نے تو فرمائش کی تھی نور جہانی فرمائش۔"

"وہ تجھے یاد کیوں نہ رہی۔"

لاحول ولا۔ "وہ بولا۔ "وہ فرمائش یاد رکھنے والی ہوتی تو یاد رکھتا نا۔"

"کیا تھی وہ نور جہانی فرمائش۔"

وہ پھر قصبہ مارکہ بولا "کشمیری چادر مانگتی تھی۔ خالص کشمیری کڑھائی سے بھرپور

- ہزار ڈیڑھ ہزار سے کم کی نہیں اور اسے علم تھا کہ میرے پاس کل آٹھ سو روپے ہیں۔"

"ہنستا کیوں ہے۔" میں نے اسے ڈنکا۔ "یہ گمراہیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

انہیں خوش کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔"

"وہ تو کسی صورت خوش ہوتی ہی نہیں۔" اشفاق حسین نے جواب دیا۔

"ہوتی ہیں ہوتی ہیں۔"

"کیسے۔" اس نے پوچھا۔

"منہ زبانی باتوں کے جال بنو۔ بٹے جالو۔ طواب دکھاؤ جاگئے کے خواب۔"

جذباتی باتوں کے بارہو کر گئے ہیں ڈالو۔ ڈالتے جاؤ۔ ڈالتے رہو۔
 ”مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب کچھ۔“ وہ بولا۔
 ”ہوتا مجھ سے بھی نہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”پھر“ وہ ہنسا۔

”پھر یہ کہ شل لے جاؤ۔ کہو“ مسلمان یہ تیرے لائق تو نہیں۔“
 ”لیکن بزرگ روپیہ کہاں سے لاؤں۔“ اس نے پوچھا۔
 ”سو دو سو کی خرید لو۔ اس کی پرائس ٹکٹ پر ۲۰۰ کو ۵۰۰ میں بدل دو۔“ وہ مقہور
 مار کر ہنسا۔

”خسو نہیں۔ اتنی سی بات سے گھر جنت بن جائے گا۔“
 ”صرف ایک ہفتے کے لئے“ وہ بولا۔
 ”پھر بھی مرگا سوا نہیں۔ ایک ہفتے کی جنت صرف دو سو روپے میں۔ دیکھ میری
 جان! اس پیسے کو رشوت دیجے رہو دیجے رہو۔“
 ”پیسے۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”پیسے کون؟“
 ”گھر والی کی بات کر رہا ہوں۔“

اشفاق حسین اسے زور سے ہنسا کہ ڈائریں گھبرا گئے۔ وہ حیران تھے کہ یہ دو شخص جو
 الگ تھلک بیٹھے کھیاں اڑاتے رہتے ہیں ان کو کیا ہوا جو کڑ کڑ ہنسنے لگے۔

بن کے

”معمر ڈائری ہلے پاس چل کر آگیا۔ بولا“ خیر تو ہے۔“
 میں نے کہا۔ ”جناب خیر کہیں۔“
 ”کیوں کیا ہوا۔“ اس نے پوچھا۔
 ”جناب اس بات پر فس رہے ہیں کہ گھر واپس جائیں گے تو پٹائی ہوگی۔“
 ”کیوں۔“ معمر ڈائری نے پوچھا۔ ”پٹائی کیوں ہوگی۔“
 ”جناب یہی سار کا گھاس لانے کی قربانگی کی تھی گھر والوں نے۔ وہ نہیں

”بیجی سدا کا گھاس۔“ معر صاحب نے دہرایا۔ ”وہ جو لکڑی کا گھاس ہوتا ہے۔“

”ہانکل ہانکل۔“ اشفاق چلایا۔
 ”جو شوگر کی بیماری کے لئے ہوتا ہے۔“
 ”ہانکل ہانکل۔“ ہم دونوں چیخ اٹھے۔
 ”وہ گھاس تو میرا چھوٹا بھائی لے کر گیا تھا دوسرے۔“
 ”جی۔ کیا دلی سے لے کر گیا تھا۔“
 ”ہاں دلی سے۔“ وہ بولا۔
 ”کہیں مٹا ہے۔“

”بھئی ایک خراوے کی دکان ہے بلی مارا میں۔ بھلا سا نام ہے اس کا۔ اس وقت یار نہیں آ رہا۔“
 ”ہم اسے کیسے تلاش کریں گے۔“ اشفاق حسین پر پھر سے ہجوی چمانے لگی۔

معر صاحب بولے ”ہاں یار آیا۔ اس کی دکان ہندوستانی دوا خانے کے پاس ہے۔“
 ”کوئی پتا۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”بلی مارا چلے جاؤ۔ وہاں ہندوستانی دواخانہ پوچھ لو۔ ہندوستانی دواخانے سے خراوے کا پوچھ لو۔ انہیں اس گھاس کا علم ہے۔“
 معر صاحب چلے گئے تو اشفاق حسین بولا ”یار کہل ہو گیا۔ تین دن ہم پوچھتے رہے۔ تلاش کرتے رہے۔ کھجور ہوتے رہے پر کام نہ ہوا۔ اب گھر بیٹھے بیٹھائے ہو گیا۔“

میں نے کہا۔ ”دیکھ لے جس نے اپنی گھٹنوں پر کہہ کر اس کے دود پر رکھ دی کہ“
 ”لے تو جاؤں اور تیرا کام۔“ وہ بادشاہ بن گیا۔ جو اپنی گھٹنوں پر اپنے سر پر دھرے رہا وہ پانڈی بن رہا۔ تو نے وہ نہیں سنا۔“
 ”کیا۔“ اشفاق نے پوچھا۔

میں نے یہ بول سگھانے شروع کر دیے۔

لگ لگ کے نہ گئے

بن کے لگ جا

”یہ تو پہلی ہے۔“ وہ بولا ”مطلب ہے ہونٹ۔ لگ لگ کہتے رہو۔ کہتے رہو۔

نہیں گتے۔ نہیں ملتے۔ بن کو قتل جاتے ہیں۔“

”انہوں۔“ میں چلا یا۔ ”ہے تو پہلی پر ہونٹ نہیں۔ زور لگاتے رہو۔ لگاتے

رہو۔ کچھ نہیں ہوتا۔ مشکل اس کے در پر رکھ دو تو بن کے حل ہو جاتی ہے۔ میرا جی چاہتا

تھا کہ چلا چلا کر گھاؤں ساتھ والے تاج پاچوں۔

لگ لگ کے نہ گئے

بن کے لگ جا

نہ بیٹا نہ

اگلے روز ہم دونوں ملی ملاں کی خاک چھان رہے تھے۔ گلیاں ہی گلیاں بچ در بچ

گلیاں۔

مجھے پھر سے حاجی صاحب یاد آئے۔ وہی حاجی صاحب جنہوں نے ولی کی جامع مسجد

میں بیعت کے لئے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑے تھے۔

جب ملاں نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے کہا تھا کہ ”بیٹا تو میرے کہنے میں نہیں ہے۔ بے

شک جو جی چاہے کر۔ بس میری ایک بات مان لے۔ تو حید کے ساتھ ولی چلا جا۔ یہ تجھے

حاجی صاحب کے پاس لے جائے گا۔ تو حاجی صاحب کی بیعت کر آ۔ بس میں تجھ سے اور کچھ

نہیں مانگتی۔“

میں نے ملاں کی بات مان لی تھی۔

میرا خلیل تھا کہ حاجی صاحب کوئی بڑی طاقت ور ہستی ہیں۔

ان دنوں مجھ پر ایک لڑکی کا جنون سوار تھا۔ آدھی رات کے وقت جب سارے

گھر والے سو جاتے تو میں دے پاؤں اٹھتا اور گھر سے باہر نکل جاتا۔ پھر کھلے کی اس گلی میں

پہنچتا جہاں وہ رہتی تھی۔ سلاخ دار کمری کھلی ہوتی۔ میں سامنے وہ اپنی چار پائی پر بڑی سوتلی

ہوتی۔ سرہانے دیا ٹھہرا رہا ہوتا۔ اور میں وہاں کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہتا۔ دیکھتا رہتا۔
جب بھی میں محبوبہ کو دیکھنے جانے لگتا تو دیکھتا 'اہں جاگ اٹھتی اور مجھ سے
منت کر کے کہتی نہ بیٹے یہ ٹھیک نہیں۔ میں پھر لیٹ جاتا۔ انتظار کرتا رہتا کہ کب اہں
سوئے۔ جب اہں گہری خند سو جاتی اور خراسانے لینے لگتی تو میں پھر دبے پاؤں اٹھتا۔ ابھی دو
قدم بھرتا کہ اہں پھر جاگ اٹھتی تو میں پھر دبے پاؤں اٹھتا۔ ابھی دو قدم بھرتا کہ اہں پھر
جاگ اٹھتی۔

ایک دن اہں بولی دیکھ بیٹے میں نے تیرا معاملہ حاجی صاحب کو سوچ دیا ہے۔
جب بھی تو ادھر جانے لگتا ہے تو حاجی صاحب مجھے سمجھو ڈر بگاڑ دیتے ہیں۔
اس کے بعد مجھے حاجی صاحب سے ڈر آنے لگا۔ میں سمجھا حاجی صاحب کوئی بست
طاقتور آدمی ہو گا۔

حاجی صاحب اسی جلی ملاں میں رہتے تھے۔

اللہ والے

حمید مجھے انہی پنج در پنج گلیوں میں گھسانے کے بعد ایک بند گلی میں لے گیا۔ دروازہ
کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر کے بعد ایک محیف و نزار بڑا جا بابر نکلا۔ پتلے دبے کمر و جسم پر ایک سرخ
بھول رہا تھا۔ جیسے روٹی کا بنا ہوا ہو۔ نہ جسم میں جان تھی نہ سر میں۔ بیٹھانی تکتے دو بھور کالی
گو یا سرسہ سے بھرچر آٹھکیں کنوڑوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں ہلاکی چمک تھی۔
ہاں جیسے دھندل دی ہو۔

"انہیں دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ تو یہ ہے وہ حاجی صاحب جو اہں کو عین وقت پر بگا
دیتا ہے۔ لیکن اس میں تو خود کو سنبھالنے کو ہمت نہیں۔ یہ ایک باغی نوجوان کو کیسے سنبھالے
گا۔

اس زمانے میں میں بزرگ کا مفہوم نہیں سمجھتا تھا۔ اللہ والوں کی عظمت سے واقف
نہ تھا۔ چلتے آگے کو نہیں پہچانتا تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ اللہ کے بندوں کی حسیات ہم سے
دس گنا زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ وہ زیادہ سننے ہیں۔ زیادہ دیکھتے ہیں۔ زبان و مکان ان کے
راستے کی دیوار نہیں بن سکتے۔

میں نے سوچا۔ یہ شخص چاہے کتنا ہی پاکیزہ ہے آخر ہے تو میری طرح کا بندہ اس سے کھل کر بات کیوں نہ کروں۔

جب حمید اوہراوہرا ہوا تو میں نے بات چلا دی۔ میں نے کہا۔ ”حاجی صاحب یہ بتائیے کہ میں نے آپ کا کیا قصور کیا ہے۔“

وہ یہ سن کر گھبرا گئے۔ ”نہیں نہیں“ وہ بڑے لطافت سے بولے۔ ”خدا انور سے آپ کیوں قصور کرنے لگے اور پھر میری حیثیت ہی کیا ہے۔“

میں نے کہا ”پھر آپ اہل کو میں وقت پر کیوں جگا دیتے ہیں۔“

اس پر وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔ بولے۔ ”نہیں نہیں۔ میں تو انہیں نہیں جگانا۔“

میں نے مزید وضاحت کی۔ میں نے کہا ”رات کے وقت جب بھی میں محبوب کو دیکھنے کے لئے اٹھتا ہوں۔ آپ اہل کو جگا دیتے ہیں۔“

وہ پھر ہنسے گئے۔ بولے۔ ”میں نہیں جگانا۔ آپ کی والدہ محترمہ اپنی روشنی کی وجہ سے جاگ پڑتی ہیں۔“

معلق آنکھیں

میں نے کہا ”حاجی صاحب ایک بات پوچھوں۔“

بولے ”بہد شوق پوچھئے۔“

”آپ برا تو نہیں مانیں گے۔“

”بالکل نہیں۔“ وہ ہنسے۔ ”مجھے تو آپ کی باتیں بہت پسند آ رہی ہیں سبحان اللہ کتنی

صاف بات کرتے ہیں آپ۔“

میں نے کہا ”حاجی صاحب۔ جوانی میں آپ کو کسی لڑکی سے محبت ہوئی تھی

کیا۔“

بولے ”کسی ایک سے تو نہیں ہوئی۔“

”ایک سے زیادہ سے ہوئی تھی کیا۔“

”نہیں۔“ وہ خنس کر بولے۔ ”مجھے تو ہر حسین لڑکی ابھی لگتی تھی ان دنوں“

کہنے لگے ”کھٹکتے ہیں ہمارے بکست کی دکان تھی۔ بس ایک ہی دھن سنائی تھی کہ کسی خنپاسی

سے ایسی چیز حاصل کریں کہ ہر داہ چلتی نہیں دیکھ کر رک جائے۔ اور پھر ہمارے پیچھے پیچھے

بہل پڑے۔ ”

”کیا ایسی چیز ملی ” میں نے پوچھا۔

”ہاں ملی۔ ” وہ بولے۔ ”اور یہی چیز باعث رحمت ہو گئی۔ ”

”وہ کیسے جنم۔ ”

”ایک ضیاعی نے سرمہ بنانے کی ترکیب بتائی۔ دو سال کی مسلسل محنت عملوں اور
دعائیوں کے بعد سرمہ تیار ہوا۔ آنکھ میں ڈالا۔ باہر نکلے۔ لوکیاں ہمیں دیکھتیں اور گویا
اندھی ہو جاتیں۔ رونا نہ دار غفلگی باندھے ہمیں دیکھے جاتیں جیسے صدمہ بدھ کھوٹ چکی ہوں۔
بس یہ دیکھ کر سراب ٹوٹ گیا۔ نگاہ میں عورت کی کوئی وقعت نہ رہی۔ وہ کشش حصول
زندگی بن گئی۔ ”

”پھر۔ ” میں نے پوچھا۔

”پھر کیا۔ ” وہ مسکرائے ”کشش کے سب سے بڑے مرکز کو پہنچا لیا۔ دکان
چھوڑ دی۔ سب کچھ چھوٹ گیا۔ ”

ہندوستانی دواخانہ

اس روز ہم دونوں اشفاق اور میں ملی ملاں کی انہی گلیوں میں گھوم بھر رہے تھے۔
اشفاق حسین راہ گیروں سے ہندوستانی دواخانے کا پتہ پوچھ رہا تھا اور میرے سامنے حاجی
صاحب کی دکان اور روشن آنکھیں معلق تھیں۔

دو دوا اشفاق حسین نے مجھے پہنچوا۔ میں چہ نکلا۔

”مل گیا مل گیا۔ ” وہ چلایا۔ ”اس کی باجیس کھلی ہوئی تھیں۔

”کیا مل گیا۔ ” میں نے پوچھا۔

”ہندوستانی دواخانہ۔ وہ دیکھو سامنے۔ ”

سامنے ایک بڑی سی دکان پر ہندوستانی دواخانہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ دکان میں
عسرت اور حسرت دیاس کی وصول اڑ رہی تھی۔ دیواریں غم آنسو تھیں اور الماریاں یوں
بند تھیں جیسے انہیں کبھی کھولا نہ کیا ہو۔ بوتلیں اور شیشیاں گرد سے آٹی ہوئی تھیں۔

سامنے دو لٹنی ہوئی میزیں بھی ہوئی تھیں جن پر دو انسان نما اونچے بیٹھے ہوئے تھے۔ چپ چاپ خاموش بے حس و حرکت۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ دونوں عرصہ دراز سے مر چکے ہوں اور ان کی ردھیں عالم حیرت میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں ہوں۔

وہ دوکان شفاخانہ معلوم نہ دیتی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی چار شفا پانے کی امید نہیں رہا سکتا تھا۔ اس سے تو وہ آیو رویدک کی دوکان کیس زیادہ اچھی تھی۔

اگرچہ آیو رویدک کی دوکان پر بھی کوئی چل نہ تھی۔ ویڈ صاحب بڑے طعنه سے بنی گئی میز کے سامنے بیٹھے لوگ رہے تھے۔ پھر بھی دوکان پر گرد آلودگی کی کیفیت طاری نہ تھی۔

ایک دن وہ تھا جب دلی کے طبیبی دواخانوں میں چل پل تھی۔ دلی کے باض عکیموں کی انگلیاں گویا شخص کے کہیوڑ تھے۔

اشفاق حسین آگے بڑھا۔ مجھ میں ہمت پیدا نہ ہو رہی تھی۔ سٹریمن میں حرکت ہوئی۔ اس نے ہاتھ ہلایا اور زیر لب کچھ کہا جو مجھے سنائی نہ دیا۔

اولپک کپ

اشفاق حسین خوشی خوشی دوکان سے نیچے اترے۔

”بولا“ بن گئی بات۔“

”کیسے۔“ میں نے پوچھا۔

”انہوں نے رحیم خراوی کا پتہ دیا ہے۔“

ایک ٹھگ سی گلی میں ایک ویڑا سا نظر آیا۔ سامنے ایک چھوٹے قد کا آدمی موڑے پر بیٹھا تھا۔ اس کے عقب میں ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔

وہ ٹھگنا کر مضبوط جسم کا آدمی، آدمی نہیں لگتا تھا۔ ایسے معلوم دیتا تھا جیسے ہار کے منہ پر کوئی جن بیٹا ہو۔

اشفاق حسین اس کے قریب گیا۔ بولا۔ ”جناب رحیم خراوی کی دوکان کہاں ہو گی؟“

کانی دیر تک وہ ہار ہار ہی رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹا تو

ایک بڑا سا گودام نظر آیا۔ گودام کے مرکز میں ایک بڑا سا پرانی طرز کا خراؤ لگا ہوا تھا۔ جس کے ارد گرد کانٹہ اور پلاسٹک کے تھیلے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ لکڑی کا سامان چٹا ہوا تھا۔ پیچھے بڑے بڑے طاقتوں میں بھری ہوئی پوریاں پڑی تھیں۔

رحیم خراویہ اپنے خاں میں ایک سوڑھے پر بیٹھ گیا۔

”بیٹو جی بیٹو۔ کیا چاہتے۔ ابے سوڑھے لے آؤ۔“ اس نے رعب دار

آواز میں کہا۔ اندھیرے کونوں سے دو سائے سے نمودار ہوئے۔

”بھئی سدا کا نام سن کر وہ چلا یا۔“ ابے گھاسوں کی پوری اندر۔ ادھر سے۔ ”پھر خود ہی اٹھ کر ادھر چلا گیا۔

اشفاق حسین نے مجھے کہنی ماری۔ کہنے لگا۔ ”یار یہ تو بن گیا کام۔“

دو کھٹے کے بعد چار گلاس اٹھائے ہم رحیم خراویہ کی دکان سے یوں باہر نکلے جیسے

لوپکس سے کہ جیت کر آئے ہوں۔

سکھ نارائن

بھئی سدا کے گلاس خرید لینے کے بعد چاندنی چوک کی اداسی ہماری نگاہ میں اتنی دیر نہ

رہی۔ بازار سے گزرتے ہوئے اشفاق حسین بولا ”چلو یاد وہ بھی خرید لیں۔“

”وہ کیا۔“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگا ”سدا رات میں سوچتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ واقعی

ہمیں گھر والے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور لے جانا چاہیے۔“ اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا

”یہ ہے وہ دکان۔“

”کون سی دکان؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ کارڈ ہمارے پنڈی نے دیا تھا۔“

”کون پنڈی۔“

”بھئی شکی حمام میں جو ہمارا پنڈی ہے۔“ اس نے بڑے رازدارانہ انداز سے

مجھے بتایا تھا کہ کشمیری شمل خریدنا ہو تو چاندنی چوک میں اس دکان پر جانا۔ چیز اچھی دے گا

دام واجبی لگائے گا۔ کارڈ پر لکھا تھا ”سکھ نارائن کہنی۔“

دو کھٹے کی تلاش کے بعد ہم سکھ بھرائن کہنی پیچے۔

وہ ایک بہت ہی چھوٹی سی دکان تھی جس میں کوئی شوقین نہ تھی۔ مال یوں ٹاٹ میں لپٹا ہوا پڑا تھا جیسے پوریوں کی دوکان ہو۔

”آئیے آئیے۔“ لالہ جی بولے۔

”سکھ بھرائن.....“ اشفاق رک گیا۔

”جی مہراج کی ہے سکھ بھرائن۔“

دکان میں نہ سکھ تھا نہ بھرائن۔ ٹاٹ ہی ٹاٹ۔

”کشمیری چادر چاہئے۔“ لالہ جی نے پوچھا۔

”جی۔“ اشفاق سے کہا۔

”بس قیمت کی چاہئے۔“ لالہ جی نے پوچھا۔ ہماری کھیرا ہٹ دیکھ کر بولے
”کھیرا ئے میں مال اصلی لے گا۔“

”نہ مہراج۔“ اشفاق حسین مسکرایا۔ ”ہمیں اصلی نہیں چاہئے۔ ہمیں تو ایسی
چادر چاہئے۔ جو ہو ایک سو کی پر دیکھے ایسے کہ کہ ایک ہزار کی ہے۔“

”اوسوں مہراج۔“ لالہ جی نے کہا۔ یہاں تو ایسا مال ہے جو ہے ایک ہزار کا
دیکھے ہے ایک سو کا۔“

یہ سن کہ ہم دکان پر بیٹھ گئے۔

اشفاق حسین بولا ”لالہ جی ہم پر دیکھی ہیں۔“

وہ تو مہراج ظاہر ہے۔“ وہ بولا۔

”کیسے ظاہر ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”پاکستان کے ہیں نا۔“ وہ بولا۔

دیکھو لالہ جی۔ بات یہ ہے کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پور گھر دلی کے لئے
تخفہ لے جاتا ہے۔“

ہاں مہراج۔“ وہ بولا۔ ”وہ تو لے جاتا ہی پڑے گا۔“

”چیز سو دو سو کی ہو پر قیمت ہزار بتائیں تب بات بنتی گی۔“ اشفاق نے کہا۔

”ورنہ وہ دروازے کی کنڈی نہیں کھولے گی۔“

”جی مہراج۔“ لالہ مسکرایا۔ ”پھر تو ایک ہی بات ہے۔“ لالہ جی بولے۔
”کیا۔“ میں نے پوچھا۔

”جو گھر والی مال بچاتی ہے۔ پھر تو مشکل ہے۔“

”وہ لالہ جی۔“ میں نے کہا۔ ”گھر والی تو ایک ہی چیز بچاتی ہے چاہے ہند کی ہو یا پاکستان کی۔ چمک۔ بھڑکیلا ہیں۔“

”جی ہے مہراج۔“ وہ بولا۔ ”مہراج چمک تو مشینی چیز ہے۔ گھر والے نہیں۔“

یہ سن کہ ہم بائیس ہو گئے۔ جب دکان سے اٹھنے لگے تو لالہ جی بولے ”ہاں ایک چیز ہے۔ رنگ۔ شاید بات بن جائے۔ دیکھ لو۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ ٹاٹ کا ایک بستر اٹھا لایا۔ اسے کھولا۔ رنگ کا ایک ریٹا آیا اور ہم پھر سے بیٹھ گئے۔

آدھ گھنٹے کے بعد چادریں لپیٹتے ہوئے لالہ جی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”مہراج کسی سے یہ نہ کہنا کہ یہ سکھ نارائن کامل ہے بڑی کرپا ہو گی۔“

”لالہ جی آپ مجھے کس کے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”لالہ جی بولے ”جی اب تو مجھ کو دلی کے ہیں۔ پہلے ہار دوال کے تھے۔“

سے سے

”ایک بات تو بتائیے مہراج۔“ اشفاق حسین نے کہا۔

”پوچھو مہراج“ لالہ جی بولے۔

”چل دن ہو گئے ہیں ہم ادھر دلی میں گھوم چکر رہے ہیں۔ جس سے بھی پوچھتے ہیں کہ پیچھے سے آپ کس کے ہیں تو کوئی لاہور بتاتا ہے۔ کوئی پٹنہ۔ کوئی سیالکوٹ۔ کسی نے نہیں کہا کہ میں دلی کا ہوں۔ یہ کیا بات ہے۔“

”پتہ نہیں مہراج۔“ وہ بولے۔

”اپنیے لگتا ہے کہ لوہر سے آنے والوں نے دلی پر دھلوا بول دیا ہے۔ پر دلی والے کس گئے۔“

”لالہ جی مسکرائے۔ بولے ”مہراج سے سے کی بات ہے۔ کبھی دلی والوں کا

سے قصاب پنجاب والوں کا سے ہے۔"

چادر میں خرید کر ہم پھر چل پڑے۔ اشفاق حسین چلتے چلتے رک گیا۔ کہنے لگا "تم کہتے تھے کہ ہر خرید دل گام۔"

ہمارے سامنے دکان پر کھدر بھنڈا کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اندر ایک سردار مناسب قوت پرھیائے ہوئے بیٹھے تھے۔

میں نے کہا۔ "سردار جی سنا ہے ہند کا کھدر بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔"
سردار جی بولے۔ "مدراج کھدر تو کھدر ہے چاہے اوہر کا ہو یا اوہر کا۔ اوہر کا کھدر بھی کچھ کم نہیں۔"

"پھر اوہر کی مشہوری کیوں ہے۔" اشفاق حسین نے پوچھا۔
"یہ تو جی ایک فیشن ہے۔" سردار جی بولے۔ "کچھ تو بھیٹ چل ہے جو چل پڑی سو چل پڑی۔ بس گل تو ایک ہی ہے۔"
"وہ کیا جی۔"

سردار جی بولے۔ "اوہر لوک کھدر پہنتے ہیں اس لئے چنا ہے اوہر لوک نہیں پہنتے اس لئے نہیں چنا۔"

"اوہر کیا چنا ہے۔" سردار جی۔ "اشفاق حسین نے پوچھا۔
"سردار جی سنئے بولے "مدراج اوہر ناٹیکس چلتی ہے۔ ریشم چنا ہے سٹکڑا پن ہے۔ کائن نہیں چنا۔ جی گل ایہ ہے مدراج کہ اوہر ہنک چلتی ہے۔" اشفاق چنا ہے۔"

اشفاق حسین ہنسا۔ کہنے لگا "سردار جی قسمی چھن کدھر کے ہو۔"

سردار بولا مدراج "اساں رائے دندوے آں۔"
"تے فیرا دو کیوں بولدے او۔" میں نے پوچھا۔

"آپاں کیمڑے سوکھے ہو کے بولے آں۔" مدراج کی کریمے بولنا پینڈا اے
دکانداری جو ہوئی۔ کی دینے مدراج مردو بول بول کے آپاں دیاں تے در اچھاں پک
گئیاں نے۔ دیلے دیلے دی گل اے سہنوں۔"

کھدر خرید کر ہم دریا تنج کی طرف چلے تو اشفاق حسین بولا۔ "یار دلی دال کیا

ہوئے۔ ”

”کیا مطلب“ میں نے پوچھا۔

”یہاں چاندنی چوک میں تو سدا پنجاب آ رہا ہے۔ دلی کے رہنے والے کہاں گئے“

”جنوب میں چلے گئے ہوں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیوں۔“ وہ بولا۔

”بھئی یہ کول دروازوں والی بات ہے۔“

”کیا مطلب۔“

”ہند کی تاریخ میں عیشیسی ہوتا آیا ہے۔ ہر نئی قوم شمال سے آئی اور جو یہاں آباد تھے انہیں بچے و بھیل دیا۔ کول آئے اور دروازوں کو دھکیل دیا۔ آریہ آئے تو انہوں نے کولوں کو دھکیل دیا۔“

”لیکن وہ تو قوموں کی بات تھی۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔ ”دلی والے تو مذہب لوگ تھے۔ بہت بڑی مذہب تھی۔“

”ہاں زیادہ مذہب ہو جائے تو انسان میں وہ ولولہ نہیں رہتا۔ جرات نہیں رہتی۔“

”انہوں نے تم کتابی بات کر رہے ہو۔“ اشفاق حسین نے کہا۔ ”مجھے ٹرخا رہے ہو یا خود کو ٹرخا رہے ہو۔“

”بالکل تجھے نہیں خود کو ٹرخا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ خالص کتابی بات ہے۔ ویسے کچ پوچھو تو میں بھی بات کو نہیں سمجھا۔“

اشفاق حسین نے زور سے تہمت لگایا۔ کہنے لگا۔ ”میں سمجھتا تھا۔ تم وہی بات کرتے ہو جسے دل سے مانتے ہو۔“

کتاب و تشدید

مجھے نور بابا یاد آ گئے۔ نور بابا سے مجھے اشفاق احمد نے ملایا تھا۔

ایک روز اشفاق احمد کہنے لگا۔ ”یار نور بابا کہتے ہیں کہ جو شخص کتاب اور تشدید کے

چکر میں پھنس گیا سمجھ کر لوہہ علم سے دور ہو گیا۔
یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ سن کر میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اخلاقی امور سے
کما یاد مجھے نور بابا سے ملا دو۔

نور بابا سے مل کر میں بہت حیران ہوا۔ ان کی بیشتر باتیں گویا کہاوتیں تھیں۔
تھوڑے سے الفاظ میں ایک انتہائی حقیقت بیان کر دیتا نور بابا کا مکمل تھا۔ نور بابا سے ملنے کے
بعد میرے دل میں ان پڑھ لوگوں کی عزت پیدا ہو گئی اور مشاہدے کی عظمت کا احساس
جاکا۔ نور بابا سچ کہا کرتے تھے۔ فرماتے۔ پڑھی ان پڑھ کے ہاتھوں پاکستان کو کبھی نقصان
نہیں پہنچا۔

ایک روز نور بابا کے سامنے کتابی بات کہہ کر میں بے حد شرمندہ ہوا۔ بابا میری
شرمندگی بھانپ کر بولے۔
”نہ پڑاس بات پر شرمندہ ہونے کی چنداں حاجت نہیں۔ یہ تمہارا خلیل نہیں۔
تمہاری عادت ہے۔“

نور بابا سچ کہتے تھے۔ زندگی میں میں اکثر عار کا کتابی بات کر دیتا ہوں۔ وہ
میرا خلیل نہیں ہوتا۔ عادت ہوتی ہے۔

اس روز اخلاقی حسین سے بحث کرتے ہوئے میں عادت کا سدا لے رہا تھا۔ ویسے
دلی دال کے متعلق میری رائے مختلف تھی۔

جب بھی میری بیوی کسی اہل زبان سے ملتی ہے تو گھر آکر اکثر کہا کرتی ہے ”دیکھو
یہ اہل زبان ہم پنجابی لوگوں سے کس قدر بہتر ہیں۔ کتنے افضل ہیں۔“
”وہ کس طرح۔“ میں پوچھتا ہوں۔

کہتی ہے ”سیدھی بات ہے۔ ان کے مقابلے میں ہم تو گونگے ہیں۔ بچی دیر ہم
ہونٹ سنوارتے رہتے ہیں۔ وہ دس باتیں کر جاتے ہیں۔ کڑا کے دلہ باتیں۔ ہم جیسی
پسپسی نہیں۔ ان میں بات کرنے کی قابلیت ہے اور آج کے دور میں جس میں بات کرنے
کی قابلیت ہے وہ یقیناً افضل مخلوق ہے۔“

پہلی مرتبہ اپنی بیوی کی بات سن کر میں چو لکا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس
صلاحیت کو اس زاویے سے نہ دیکھا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ کچر کچر باتیں کرنا کوئی خوبی

مت بولنے

وقفہ اشفاق حسین رک گیا۔ بولا "یار مجھے تو یاد ہی نہ تھا۔ افضل نے فرمائش کی تھی کہ ایک جلد کافش رام کے میٹر یا میڈیکل کے آئے۔"

"وہ جو اردو میں ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں دی۔"

"وہ تو ادھر بھی ملتی ہے۔ عام" میں نے کہا۔

"ہاں ملتی ہے۔" اشفاق نے جواب دیا۔

"پھر یہاں سے لے جانے کا فائدہ۔"

"ہاں فرمائش ہے۔" وہ بولا۔

"یہاں سستی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ بولا۔

"ہنٹا یار" میں نے کہا "پچھے بھانے کے لئے بوجھ اٹھاتا رہا ہوتی ہے۔"

"نہیں یار" وہ بولا "ہا ہے کچھ بھی ہے پھر بھی فرمائش ہے۔ چلو بھڑاری کی

دکان پاس ہی ہے۔ پوچھ لیتے ہیں۔" دراصل وہ بھڑاری کی دکان میں جانے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔

ہم بھڑاری کی دکان میں داخل ہوئے تو تمام سیل گر کر کاؤنٹر پر آ گئیں۔

"ہم واپس جا رہے ہیں۔" اشفاق حسین نے کہا۔ "سوچا جانے سے پہلے آپ کو

مسکرا کر لیں۔"

"بڑی کرپا ہے۔" اوشانے دونوں ہاتھوں کو بوند کر ماتھے پر رکھ لیا۔

انگ کمرے میں چٹھی ہوئی مصوم لڑکی کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

"خرید لری کری۔" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"ہند کو لوٹ کر لئے جا رہے ہیں۔" اوشانے مسکرا کر پوچھا۔

"نہیں۔" اشفاق حسین بولا۔ "ہو میوہ تھی کا لڑکے لوٹا۔"

اس پر وہ سب قفسہ مار کر نہیں۔

"ہند میں ہومیو پیتھی تجربے کا بہت بڑا خزانہ ہے۔" اشفاق حسین نے کہا۔

"اچھا۔" لوشا بولی "اس خزانے کو یہاں کوئی نہیں لوتا۔"

"کوئی پوچھتا ہی نہیں۔" دوسری نے کہا۔

"بڑے السوس کی بات ہے۔" اشفاق نے کہا۔

"انہیں پتہ ہی نہیں" دوسری نے کہا۔ "کہ یہ خزانہ ہے۔"

"اچھا۔" اشفاق حسین نے کہا۔ "اب چلتے ہوئے ہمیں ایک کتب اور دے

دیجئے۔"

"سدری کی سدری لے جائیے۔" سبز کرل مسکرائی۔

"یقیناً لے جاؤ۔ ہر کیا کروں غریب آدمی ہوں۔" بچے نہیں دھیلے

تے کروائیلے میل۔ "والی بات ہے۔"

"کون سی کتب دوں۔" لوشا نے پوچھا۔

"کانٹی رام کی اردو کی کتب میٹریا میٹریکا۔"

"اردو کی۔" لوشا مسکرائی "یہاں اردو کی کتب نہیں بچتی۔"

"کیا مطلب۔" اشفاق حسین نے پوچھا۔

"انگریزی یا ہندی میں۔ اردو کوئی نہیں پڑھتا۔"

"ایک بات پوچھوں۔" میں نے کہا۔

"پوچھئے۔" وہ مسکرائی۔

"یہاں اردو بولتے کیوں ہیں۔"

"یہاں تو ہندوستانی بولتے ہیں۔"

"آپ سیب کا نام کیلا رکھ دیں پھر بھی وہ سیب ہی رہے گا۔ اردو کا کوئی نام رکھ

دیجئے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

"میں نہیں سمجھی۔" وہ بولی۔

"یہاں دلی میں سب اردو بولتے ہیں۔ ہندی نہیں بولتے مسکرت نہیں بولتے۔

برج بھاشا نہیں بولتے۔ وہ بولی نہیں بولتے جو آکاش دانی بولتی ہے لیکن اردو لکھتے پر ہیں

ہے چھپے پر ہیں ہے۔ اگر کھٹا کوارہ نہیں تو پوچھتے کیوں ہیں۔ مت بھولے۔ بی بی پارو۔
 مسلمانوں کی زبان نہیں دلی والوں کی زبان ہے۔"

آخری دن

دلی میں وہ ہمارا آخری دن تھا۔

اسی رات اٹھری دہائی تھی۔ ہمیں امرتسر جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہونا تھا۔

اس روز ہم آزاد تھے۔ کوئی کام نہ تھا۔ کوئی بندھن نہ تھا۔ قتل اور فرض نہ تھا۔

ہو میو جینٹلی کی کتابیں اور دو انیاں خریدی جا چکی تھیں۔

بچی سار کے چار گھاس ہمارے سلیٹن میں بندھے ہوئے پڑے تھے۔

راگ و دیا کا ایک نیپ اشفاق حسین نے پینے سے لگا رکھا تھا۔

اپنا اپنا ساگ دائم اور قائم رکھنے کے لئے ہم نے ایک ایک کشمیری چادر بھی خرید کر

رکھ لی تھی۔ اور بڑے اہتمام سے قیمت کی اس پرچی پر جواں کے ساتھ ٹانگی ہوئی تھی۔ ہم

نے ۲۰۰ کو ۵۰۰ میں بدل دیا تھا تاکہ دہائی پر بیگم صاحبہ گرم جوشی سے ہمارا استقبال

کریں۔

لذا ہمیں کوئی فکر نہ تھا۔ اندیشہ نہ تھا کہ گھبراہٹ نہ تھی۔ اس روز ہم خالص آدمی

گردی کرنے گھر سے باہر نکلے تھے اور یوں گرد و پیش کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہتان شہر کو

دیکھتے ہیں۔

یہاں وہاں

”لفظ اشتقاق حسین رک گیا۔“

”کیوں کیا ہوا۔“ میں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ بولا۔

”چلو آگے۔“

”کس۔“ اس نے پوچھا۔

”چھوڑو یاد۔“ وہ بولا۔

”کیا مطلب۔“ میں نے پوچھا۔

”چلو گھر چلیں۔“ اشتقاق حسین نے کہا۔

”ہیوں۔“

”یہاں دیکھنے کی کوئی چیز بھی ہو۔“

”بہتی رونق ہے۔ بھیڑ ہے۔“

”اوصوں — رونق نہیں۔“ وہ بولا۔ ”صرف بھیڑ ہے۔“ وہ بھی اتنی

نہیں۔“

”دکانیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں ہیں۔“

”ہاں سے ہماری ہوئی ہیں۔“

”ہانگ ہیں۔ پر دکانداروں فلرغ تھتے ہیں جیسے دکانیں خالی پڑی ہوں۔“

”اتنے سارے لوگ ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہیں۔ پر شاپنگ نہیں ہے۔“

”ہاں بہت کم شاپنگ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہاں تو دکانیں گڑی بھیلیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ کہیں ہی کہیں۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔

”پھر دیکھو۔ یہاں ہر چیزیں کس قدر سستی ہیں۔“

”بہت۔“ میں نے کہا۔

”پر ہر چیز تک پاور نہیں ہے۔ ذیاب چاہے ہمارے ہوں ہاتھ خالی ہیں۔ یہ لوگ

دیکھے تم نے۔ " اس نے پوچھا۔

" ہاں دیکھ رہا ہوں۔ " میں نے جواب دیا۔

" ہنستی ہیں، چست ہیں پر چمک نہیں۔ " اشفاق نے کہا۔

" ہاں بجھے بجھے سے ہیں۔ "

" کوئی شہمتی نہیں۔ "

" واقعی حیرت ہے۔ " میں نے آہ بھری۔

" عورت نہ ہو تو شہنگ کیسے ہو۔ ہو سکتی ہے کیا۔ "

" اوصوں۔ "

" وہ خود آتی نہیں بازار میں۔ یا آنے نہیں دیتے۔ " میں نے پوچھا۔

" پتہ نہیں۔ " وہ بولا۔ پھر دلفوز ایک ہو گئے ہوئے سوئر سائیکل کو

دیکھ کر مسکرایا " سوئک پر سوئر سائیکل دیکھے تو نے۔ "

" کوئی کوئی ہے۔ کہیں کہیں " میں نے جواب دیا۔

" یوں چلتے ہیں جیسے ہائیکل ہوں۔ " وہ ہنسا۔ " اوھر توڑوں —۔ زوں چلتے

ہیں۔ "

" ساتھ چنگلاڑی بھی ہیں۔ " میں نے کہا۔ " تو پہاڑ ہے کانوں کے پردے پہاڑ

دیتے ہیں۔ "

" اک لور بات دیکھی تو نے۔

" کیا۔ " میں نے پوچھا۔

" جوان ہیں پر ان میں جوانی کی شوں نہیں ہے۔ " اشفاق حسین نے کہا۔

" کیا مطلب۔ " میں نے پوچھا۔

" بلبلے نہیں مارتے۔ سوچے نہیں مروڑتے۔ گردن نہیں اکڑاتے۔ "

" اوھر تو بلبلے ہی بلبلے ہیں۔ " میں ہنسا " گردنیں ہیں گردنیں ہیں۔ "

" اوھر لڑکیاں راہ چلتے نہیں دیتیں۔ کشتی ہیں میری طرف دیکھ۔ ہے نا " اشفاق

حسین نے پوچھا۔

" اوھر تو لڑکی ہے ہی نہیں۔ " میں نے آہ بھری۔

”جو ہے بھی تو لڑکانی پھرتی ہے۔“

”اور اوہ تو لڑکے لڑکیاں بنے پھرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہیہا کیوں ہے مفتی۔“ اس نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“

”وجہ تو ہوگی۔“

”میں جتوں۔“ میں نے کہا ”شاید۔۔۔“

”ہا۔“

دل اور چاول۔

”یہ دو ٹنگ قومیں ہیں اوہرا اور اوہرا اور اس لئے۔“

”پہلے تو ایک ہی تھی“ وہ بولا۔

”اوسوں۔“ میں نے سرنگی میں چلایا۔

”کیسے۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”پہلے کھڑی تھی۔ دل چاول ملے جلتے تھے۔ اب دل ٹنگ اور چاول

ٹنگ۔“

”پہلے تو وطن ایک تھا۔ پھر ایک تھا۔“ اشفاق حسین بولا۔

”نہ نہ نہ۔“ میں نے لٹی میں سر ہلایا۔

”کیا مطلب۔“ اس نے پوچھا۔

”وطن ایک تھا پھر دو تھے۔“ میں نے کہا۔

”پھر زمین کی پیداوار ضیم ہوتی کیا“ اس نے پوچھا۔

”پھر عقیدے کی پیداوار ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا مجھے پتہ نہ تھا۔ بہر طور یہاں اتنی اڑاسی کیوں ہے۔ اتنی دیر لاتی کیوں ہے

— شاید۔۔۔۔۔ میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”شاید کیا۔“ اس نے پوچھا۔

”یہاں ٹنگ امیر ہے عوام غریب ہیں۔ وہاں عوام امیر ہیں ٹنگ غریب

” ہے۔“

”لوتوں۔“ وہ بولا ”ذہانت اور چمک امدت سے نہیں ہوتے۔ تجھے یاد ہے اس سکسٹی نے کیا کہا تھا۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔
 ”کیا کہا تھا۔“ آپ پاکستان سے آئے ہیں نا۔“
 ”اوشائے بھی تو یہی کہا تھا۔ کتنی تھی دور سے پتہ چل جاتا ہے کہ پاکستان سے آیا ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو نے یہاں کے سپاہی دیکھے۔“ اس نے پوچھا۔
 ”اگلے ڈیرے پر جو بیٹھتے ہیں اتنے سارے۔“
 ”وہ تو خیر جیم ہیں۔ یہ چوک دلا دیکھ لو۔“ اشفاق حسین بولا۔
 ”کیا ہے اسے۔“
 ”سالے کے پاس مروڑنے کے لئے موٹھ تک نہیں۔“
 ”کلیں شیو ہو گا تا اس لئے۔“ میں نے جواب دیا۔
 ”نہیں۔“ اشفاق حسین چلا یا۔ ”ہوئی بھی تو نہ مروڑا۔“
 ”کیوں۔“

”موٹھ مروڑنے کے لئے صرف انگلیں ہی نہیں چاہیں موٹھ مروڑی ذہانت بھی چاہئے نا“ وہ مسکرایا ”پھر یہاں کی موٹر دیکھی تم نے۔“ اس نے موٹر کو دیکھ کر پوچھا۔

”اس پر تو باز کرتے ہیں ہندو مالے۔ سو رہی ہے تا اس لئے۔“
 ”بے شک بڑ کریں۔ انہیں حق حاصل ہے۔ لیکن یہ پلتی ہوں ہے جیسے لالچ کی ماری ہو۔ ادھر ہم باہر سے منگواتے ہیں پروں پلتی ہے جیسے پانی میں بٹخ تھتی ہے۔“
 ”لوتوں۔“ مثل ٹیکہ نہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”تو کر دے ٹیکہ۔“

”یہاں کی موٹر یوں پلتی ہے جیسے لالچ کی ماری ہوئی ہو۔ وہاں کی یوں پلتی ہے جیسے میرا منڈی میں رہتی پلتی ہے۔“
 اشفاق ہنسا ”یاد آتی ہے ادب مثل دتا ہے تو ادب ہو کر۔“ وہ ہنسنے لگا۔

"اچھا ایک بات ہو جسے گا۔"

"اوضوں مشکل ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں۔"

"بہی سوچو بوجھ ہو گی۔"

"کوشش دو کر۔"

"اچھا۔ بول۔"

کھا اڑا۔۔۔ کما بچا

"یہ چاندنی چوک ہے نا؟"

"ہاں چاندنی چوک ہے۔"

"بڑا بازار ہے نا ولی کا۔"

"بالکل ہے۔"

"اتھرا بڑا بازار کون سا ہے۔ پتہ نہ پتا۔"

"راجہ بازار ہے۔"

"اس بازار اور اس بازار میں فرق دیکھتا ہے تو۔"

"ہست۔"

"مثلاً کیا۔"

"وہاں چلنے کو رستہ نہیں ملتا۔"

"اور۔۔۔"

"وہاں موڑھے مار چلتے ہیں۔"

"اور یہاں۔"

"یہاں رستہ دیتے ہیں، موڑھے نہیں مارتے۔"

"کچھ اور۔۔۔"

"وہاں دکاندار۔ خریدار سے آگے بیٹھے ہیں۔ یہاں دکاندار خریدار کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"کچھ اور۔"

"وہاں غنڈہ بازی چلتی ہے یہاں نہیں۔"

"کچھ اور۔"

"بس۔ اور کیا۔"

"کچھ دکانوں کے بارے میں۔"

"وہاں گرمی ہے شورا شوری ہے۔ یہاں ٹھنڈ ہے۔"

"کچھ اور۔"

"چھوڑ پار۔"

"وہاں ہر چو چھی دکان کھانے پینے کی ہے۔ ہے نا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بلکہ ہر تیری دکان۔"

"یہاں کوئی نظر آتی ہے کھانے پینے کی دکان۔"

"لونسوں۔"

"ایسا کیوں ہے۔"

"سیدھی بات ہے۔ وہ کھا اڑا قوم ہے یہ کھا بچا قوم ہے۔"

خوشحال

"لیک بالکل ٹھیک۔ وہ کھاتے ہیں۔ کھاتے ہیں۔ کھاتے ہیں۔ چلتے پھرتے کھاتے

ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے کھاتے ہیں۔ گھر میں، دفتر میں، ہوٹل میں، موٹر میں، سردار ہر جگہ۔"

"بالکل۔"

"پھر حیرت کی بات ہوئی نا۔"

"کیا۔"

"مجھ میں نہیں آتی۔"

"کیا مجھ میں نہیں آتی۔"

"شاید سمیری مجھ میں آئے۔"

"پوچھ۔"

"یہ بتا کیا کھا اڑا قوم کو خوشحال ہونا چاہئے یا کما بچا کو۔"

"ظاہر ہے کما بچا کو۔"

"پھر یہاں خوشحالی کیوں نہیں دیکھتی۔ دیکھتی ہے کیا۔"

"اوسوں۔ بالکل نہیں۔"

"اور حر دیکھتی ہے۔ ہے نا۔"

"ہست۔"

"یہ کیوں۔"

"شاید لوہر خالی دیکھنے والی ہو۔۔۔ نقلی اور لوہر نہ دیکھنے والی ہو اصلی۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں۔"

"خوشحالی دیکھے بغیر نہیں رہتی۔ جس طرح رنگ دیکھے بغیر نہیں رہتا۔"

"ہات تو ٹھیک ہے۔"

"اس کی وجہ کیا ہے۔"

"پتہ نہیں۔"

"ایک اور بات دیکھ۔ بھرا بازار ہے نا۔"

"بالکل۔"

"کوئی سٹکا نظر آتا ہے کیا۔"

"بالکل نہیں۔"

"کیوں۔"

"یہ تو سیدھی بات ہے۔"

"کیا۔"

"کوئی دینے والا ہی نہ ہو تو مانگے کون۔"

"وہاں تو منگتے ہی منگتے ہیں۔"

"دینے والے بنو ہیں۔"

"یہاں دامن پن نہیں کیا۔"

"بہت ہے۔ ہم سے زیادہ۔ وہاں پیسہ پیسہ دیتے ہیں۔ یہاں پیسہ پیسہ نہیں دیتے۔ لاکھوں دیتے ہیں۔ ہسپتال بنا دیتے ہیں سرائے بنا دیتے ہیں۔"

"فرد کو نہیں دیتے۔ حاجت مند کو نہیں دیتے۔"

"حاجت مند مانگتا ہی نہیں۔"

"کیا مطلب۔"

"مدینے شریف میں لوگ حاجت مند کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ شاید وہ قبول نہ کرے۔ وہاں لینے والا دینے والے پر افسوس کرتا ہے۔"

"اس شہر پر حضورؐ کا سایہ ہے۔ اس شہر کی کیا بات ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا۔

پوتل کا کاگ

دیر تک ہم دونوں خاموش چلتے رہے۔

وقفے پر رک گیا۔ "یار ملتی۔" وہ بولا "یہاں کوک نہیں دیکھا۔"

"لوٹوں یہاں کوک نہیں ہے۔"

"کیوں۔"

"وہ کوک نہیں ہمارے والا بدلتی۔ انہوں نے اپنا کوک بنایا ہوا ہے۔ سوئیٹی۔"

"سوئیٹی یا سوئیٹی کسی کو پتہ دیکھا ہے کیا۔"

"اونٹوں۔"

پتہ وہاں تو بچے کہتے ہیں چاہے روٹی نہ دو کوک پلا دو۔ جوان کہتے ہیں۔ پتہ یار عیاشی کریں کوک بچیں۔ کوک کی دکانوں پر بھیڑ لگی رہتی ہے۔"

"یہاں بھی پتہ ہے۔"

"کیا۔"

"کوک نہیں۔"

"ہوس۔"

"اونسوں۔"

"لوہ سمجھا۔" اشفاق حسین مسکرایا۔

"یاد ہے وہاں امرتسر کے تانگے والے سکھ ڈرائیور نے کیا کہا تھا۔ میں نے اسے کہا سردار جی یہ امرتسر کے لوگ کچھ بند بند سے ہیں جیسے بوتلیں ہوتی ہیں۔ وہ بولا نہیں مدارج رات پڑتی ہے تو بوتل کا کاک اڑ جاتا ہے۔"

"ہاں۔" اشفاق حسین نے کہا۔ "بند میں پینے کی عادت بڑھ گئی ہے۔"

"کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی ہے۔"

"بلکہ بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ کیا اچھی بات ہے۔"

"پاکل نہیں۔ گرم ٹکوں میں یہ بری بات ہے۔ اس روز فکر کے گھر میں بھی

تو نے دیکھا تھا۔"

"فکر تو خیر مجبور ہے۔"

"کیوں۔"

"اکتا بڑا لکھنے والا ہے مگر کو لگا۔"

"دوسرے لوگ تو گونگے نہ تھے۔ جب بوتل آئی تو تم نے ان کی آنکھوں میں

چمک نہیں دیکھی تھی کیا۔"

"اونسوں۔"

"مگر نہ تھی۔"

"یہ بتا بند کیوں پینے لگا ہے۔"

"پتہ نہیں۔" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"تو تو خود پینا رہا ہے۔"

"ہاں۔"

"لوگ کیوں پیتے ہیں۔"

"گونگے پیتے ہیں کہ بولیں۔ ذل پیتے ہیں کہ ہلکیں۔ جھجک والے پیتے ہیں کہ

ان جھک ہو جائیں۔ مظلوم پیتے ہیں۔ تلاش پیتے ہیں کہ دو گھڑی بھول جائیں۔"

"یہ بندہ والے کیوں پیئے لگے۔ کیا بھولنے کے لئے۔"

"پتہ نہیں۔" وہ بولا "آؤ کہیں بیٹھ جائیں۔"

"کہیں بیٹھیں۔"

چائے کا دھواں

"یہاں کوئی چائے کی دکان بھی نہیں۔"

"ہاں یاد کوئی فی ہاؤس نہیں، کافی ہاؤس نہیں۔"

"کوئی چائے خانہ بھی تو نہیں۔" وہ بولا۔

"ادھر تو قدم قدم پر ہوتا ہے۔ لوگ چائے کم پیتے ہیں۔ حالات حاضرہ پر باتیں زیادہ کرتے ہیں۔"

"یہ تو اچھا ہے۔" اشفاق حسین مسکرایا۔

"کس لحاظ سے؟"

"بہنی چائے کے بہانے دل کا دھواں نکال لیتے ہیں۔"

"یہاں تو پھر دھواں نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔"

"ہانگل نہیں۔"

"تو اکٹھا ہو رہا ہو گا۔"

"کیا؟"

"دھواں اور کیا۔ شاید شراب خانے میں نکلتا ہو۔"

"اونسوں۔ وہاں دھواں نہیں نکلتا۔" اشفاق حسین نے کہا۔

"یو آئل پر سے واٹ تو اڑتا ہے۔"

"اڑتا ہے پر دھواں نکالنے کے لئے نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"چائے دوسروں کے خلاف شکوہ نکالت نکالنے کے لئے اکٹھے ہو کر شراب اپنی معذوری کو دور کرنے کی چیز ہے۔ لی کر لنگڑا دوڑتا ہے۔" وہ حلوہ دیتا ہے۔ "بہرہ سنا ہے۔ چلو یاد گھر چلیں۔" دفتر اس نے بات بدلی۔

”وہاں جا کر کیا کریں گے۔“

”کچھ نہیں کریں گے۔ کچھ نہ کرنا بڑی عیاشی ہے۔“
”بڑی۔“

”یہ کالے لوگ ہیں۔ اسس فراغت سے محروم ہیں۔“

”بے شک یہ کالے لوگ ہیں۔ محنتی ہیں۔ ان میں تکلی نہیں۔ شدت نہیں۔ مہر

والے ہیں۔ بلبلے نہیں نکالتے۔ ان میں بڑی خوبیاں ہیں۔ مگر۔۔۔“

برکت ہی برکت

”مگر کیا۔“

”مگر۔۔۔ یہاں اداسی ہے۔ بڑی اداسی ہے۔“

”ہاں اداسی تو ہے۔“

”تازگی نہیں، تڑپ نہیں، چمک نہیں، رونق نہیں۔۔۔“

”مجھے ایسے لگتا ہے کہ یہاں بھی کچھ ہے پر برکت نہیں، رحمت نہیں۔“

”بالکل بالکل“ اس نے جواب دیا ”آخر تو نے بات کہہ دی۔ میرے سوال کا

جواب مل گیا۔ یہاں بھی کچھ ہے پر برکت نہیں اور وہاں برکت ہی برکت، برکت ہی

برکت ہے۔ اہلہ لگے ہوئے ہیں۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ دیر تک ہم خاموش رہے۔

”لیک بات پوچھوں۔“ میں نے کہا۔

”پوچھ۔“

”تو تو برکت کو نہیں مانتا تھا۔“

”نہ ہی رنگ میں نہیں مانتا۔“

”برکت تو کوئی نچرل چیز نہیں۔ نہ ریشمل ہے۔“

”بہ ہاں ہے تو عقل سے بہت کر۔“

”جو عقل سے بہت کر بات ہو وہ نہ ہی ہو جاتی ہے۔“

”وہ کس طرح۔“

"وہ پر نیچرل ہوتی ہے اور مذہب پر نیچرل سے اخذ ہوتا ہے۔"
 "ہٹا پار۔" وہ بولا "پل لب پلپس۔"
 "رکشٹا پکاروں۔"
 "رکشٹا۔" میں نے ایک گزرتے ہوئے رکشٹا کو آواز دی۔
 "رکشٹا۔" وہ بولا "اسے نہ روک۔"
 "کیوں۔۔۔ خود ہی کہتا ہے روک خود ہی کہتا ہے نہ روک۔"
 "یہ رکشٹا نہیں۔۔۔ یہ تو ظلم ہے۔"
 "ظلم کیوں۔"

"ہندو ہندے کو کھینچتا ہے۔ اس رکشٹا واسلے کی ٹانگیں دیکھو۔ یہ ظلم نہیں کیا۔ ہندو والے تو جیو ہتھیہ کے قاتل ہیں۔ پھر یہ کیوں گوارہ ہے۔"
 "ہندے کو جیو نہیں دیکھتے یہ۔"
 "کسے دیکھتے ہیں۔"
 "گائے کو۔"
 "ہاں پار وہ گائے نہیں دیکھی اور۔"
 "کون سی گائے۔"
 "وہ مقدس گائے جو ہند کے بازروں میں گھبراہٹ پھرا کرتی تھی۔"
 "ہاں وہ تو نظر نہیں آئی کہیں۔"
 "بہت کچھ بدل گیا ہے۔"
 "بس ایک بات ہے جو نہیں بدلی۔"
 "بس ایک بات ہے جو نہیں بدلی۔"
 "وہ کیا۔"
 "مسکوں سے عباد۔"

"وہ تو اتنا بد کیا ہے۔" وہ ہنس نکلا۔ "جب تک پاکستان کی وصول نہ اڑائیں گے انہیں چین نہیں آئے گا۔"
 "پھرے۔" کہیں چین نہیں آئے گا انہیں

”کیا مطلب“۔

”پاکستان کی رحول کوئی نہیں لڑا سکتا ہے۔“

”کیوں“۔

”پاکستان پر میرے اللہ کا ہاتھ ہے۔“

اپنے لڑے پر جانے کے لئے جو رکھا ہمیں ملا۔ اس کا ڈرائیور ایک نوجوان ہندو

تھا۔

ڈرائیور کے متعلق میرا ایک مفروضہ ہے جو میں نے عرصہ دراز سے دل میں پال

رکھا ہے۔

ہر پروفیشن کے چند ایک اثرات ہوتے ہیں۔“

حسابے

مثلاً حساب کتاب سے متعلقہ لوگ چڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ اعتراضات

ڈھونڈتے ہیں۔ اعتراضات پالتے ہیں۔ پیدا کرتے ہیں۔ پھر ان کا سونچا بنا کر اسے گندہ کی

طرح چلاتے ہیں۔ اس عمل میں انہیں بڑی راحت ملتی ہے۔

آؤ بیڑی ہنگی قلعی پر رک جاتی ہے۔

اعتراض کو تقویت دینے کے لئے وہ ایسا قانون ڈھونڈتے ہیں جو اسے سہارا دے

سکے۔ انسان کو اصول پر قربان کرنا ان کے ذہن میں بہت بڑی نیکی ہے۔ وہ اس بات کو

تسلیم نہیں کرتے کہ اصول انسان کے لئے بنائے جاتے ہیں انسان اصول کے لئے

نہیں۔

اس پروفیشن کے کارکنوں کی خانگی زندگی مسرت سے محروم رہ جاتی ہے۔ یکم صحت

دیکھی رہتی ہے۔ چونکہ ایک گھر میں دو اکاؤنٹینٹ گزر رہے ہیں کر سکتے۔ اسی طرح

ڈرائیوروں سے متعلق بھی میرے چند ایک مفروضے ہیں۔

ڈرائیور۔

ڈرائیور کے پیشے میں دو خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ ایک مسلسل حرکت۔

دوسرے گاڑی پر کنٹرول۔ اس پروٹیشن کے بیشتر افراد خاندان بدوش قوموں میں ملتے ہیں۔ یہ لوگ مرد وچہ رسم اور اخلاق سے بے پرواہ ہوتے ہیں۔ طبیعت میں اک شان بے نیازی ہوتی ہے۔ چلو۔ پھر کیا ہوا۔ جذباتی ہوتے ہیں رنگدار ہوتے ہیں بے پرواہ۔ سوچھہ مروڑ۔ ہرجائی۔

اب کا تو مجھے علم نہیں تقسیم سے پہلے جب انگریز کاراج تھا اور لوگوں کی دلوں میں رسم و رواج اور اخلاق کا بڑا خیال تھا۔ ان دنوں ریل کا گارڈ اپنے ریٹ شیشن پر تیار دیتا تھا سات ڈاکن سے آرہا ہوں۔ میرے لئے ڈبل چیل، دو ڈنر، اور لڑکی کا انتظام رکھو۔ شیشن ہاسٹر مسکرا کر یا لا حول پڑھ کر تار ریفریشنٹ روم کے ٹھیکیدار کو دے دیتا۔ ٹھیکیدار ریفریشنٹ کا انتظام کر دیتا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

بڑے شہروں میں ریفریشنٹ کا کام ہانگ ڈرائیور کیا کرتے تھے۔ امی کہنی کے پستان اگرچہ بڑے تعلیم یافتہ اور مذہب ہوتے ہیں۔ بڑے دل ٹریڈ ہوتے ہیں لیکن مکلف قبض کے چپے وہی ہانگ ڈرائیور یا گارڈ ہوتا ہے کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ ایک مفروضہ ہے۔ میرا مفروضہ۔

دلی کے بیشتر رکشہ ڈرائیور اس مفروضے پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ان میں وہ نہیں نہیں تھی جو ڈرائیور میں ہوتی ہے۔ وہ سوہاٹ نہ تھا۔ صرف واسکے کی بس میں جس سکھ ڈرائیور نے ۲ کروڑ پوئی سنبھالی تھی اس کی آنکھوں میں، گردن میں، مونچھ میں سب کچھ تھا۔ وہ تو خاتم فلمی گیت بھی گنگنا رہا تھا۔ بہر حال دلی میں میرا یہ مفروضہ ٹوٹ کر پاش پاش ہو گیا۔

دلی کے رکشہ ڈرائیور کی چھاتی تھی ہوتی نہیں جھکی جھکی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں حیا ہوتی ہے، لاج ہوتی ہے۔ انداز میں صبراً ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ سب کے سب میٹر کے پابند تھے اور میٹر مستری کا سیٹ کیا ہوا نہیں تھا بلکہ کہنی کا سیٹ کیا ہوا تھا۔

دلی کے رکشہ ڈرائیور چلتے تھے، ریس نہیں کرتے تھے۔ انیس نہ تو زیادہ کمانے کی دھن لگی تھی نہ جلدی جلدی فارغ ہو کر گھر جانے کی لگن تھی۔ اپنے گھر نہیں مسجد کے گھر اپنے گھر جانے کی دھن ڈرائیور کو نہیں ہوتی۔

رام لال

بسرطوری اس روز جو ڈرائیور ہمیں ملا۔ اس کا نام رام لال تھا۔

میں نے کہا ”رام لال کتنا کمالاتے ہو“۔

بولتا ”بس جی رہا ہوتا ہے“۔

”خوب گزاریا“۔ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”ہاں جی“۔ وہ بولا۔ ”میں ہوں میری ماما ہیں۔ دو بھائی ہیں — چار چھو ہیں

جی“۔

”ڈبل شفٹ لگاتے ہو کیا۔“ میں نے پوچھا۔

”نہ جی“۔ وہ بولا۔

”کیوں نہیں لگاتے سوکھا گزاریا سچی والا ہو جائے گا“۔

”ماما جی لگانے نہیں دیتی“۔

”کیوں“۔

”کتنی ہیں راتے جتنے کالا لچ نہ کر تھوڑا سہی پر سبھی رہ کر“۔

”دیے رام لال یہاں دلی میں پیسے کیسے چلتا ہے“۔ میں نے پوچھا۔

”بس جی رے موافق۔ لوگ بسوں میں بیٹھتے ہیں تا اس لئے یا۔ سبھی رکشے لے

لیتے ہیں“۔

”پچھتے سے کہاں کے ہو رام لال“۔

”ماما جی کتنی ہیں وہاں راجہ رام کے ہیں“۔

”اوھر کے ہی ہوئے نا“۔

”ہاں جی اوھر کے ہی ہیں“۔

”سدا سے ہی اوھر کے گتے ہیں دلی میں“۔

”پتہ نہیں جی پر اپنا سدا محلہ اوھر کا ہی ہے کوئی سرگودھے کا ہے کوئی شیخوپورے کا

کوئی سیالکوٹ کا“۔

حار شریف پر پہنچ کر ہم نے رام لال کو روک دیا۔ وہ رک گیا۔ اس نے دونوں

کارڈ نکالے۔

”رام لال یہ دو کارڈ کیوں دکھاتے ہو۔“

”وہ جی پٹنے ایک ہی کاٹ ہوتا تھا۔ پھر بڑھتی ہوئی تو دو چال گیا اس والے میں ریت ہے جی۔ اس دوجے میں بڑھتی ہے۔“

جاتے وقت رام لال نے جبک کریں پر نام کیا جیسے گرائیں گرائیں کو کرتے ہیں۔

ہونچ گینٹ ہوپ

اقبل ہوٹل میں ہم صاحب دیسے ہی اقبل کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے چائے کا پیالہ دھرا تھا اور وہ کسر رہے تھے۔ بھئی آپ ہم سے بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ اقبل مسکرا رہا تھا۔ ہم صاحب کے چہرے پر بڑی بے بسی تھی۔

میں نے اشفاق حسین سے کہا ”میرا جی چاہتا ہے ہم صاحب کو ساتھ لے چلوں۔“

”کہیں۔“ اشفاق حسین نے پوچھا۔

”پاکستان لے چلوں۔“

”ارے۔“ اشفاق حسین نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”جھپیں ان پر ترس نہیں آتا۔“

”کن پ۔“

”ان مسلمانوں پر۔“

”ترس کس بات پر۔“

”یہ اپنے شہر میں ہوں بیٹھے ہیں جیسے پردیس میں ہوں۔“

”ہاں۔“ وہ بولا ”گلتا تو لیا ہی ہے۔“

”تو نے اس روز دلی دو خانہ دیکھا تھا؟“

”دیکھا تھا۔ دو آدمی بیٹھے تھے۔“

”ہاں ہوں بیٹھے تھے جیسے حق و حق صحرائیں بیٹھے ہوں۔“

”بالکل۔ لیکن یہ لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ کس امید پر۔“

"یہ لوگ اسید پر نہیں بیٹھے۔"

"تو پھر۔"

"الٹاک کے لالچ پر بیٹھے ہیں۔"

"چروں پر الٹاک کے آئل تو نہیں۔"

"انہیں پتہ ہے کہ ایک روز الٹاک چھن جائے گی۔ اسے آگ لگا دیں گے۔"

"پھر کیوں بیٹھے ہیں۔"

"ہیٹنگ انینٹ ہو پ۔"

"ایک بات پر چھوں۔"

"پوچھ۔"

"میں کے عمام میں تو زہر نہیں۔ دکھتا نہیں۔"

"کیا مطلب۔"

"پھر آگ کون لگاتا ہے۔ فساد کون کر داتا ہے۔"

"انہدوں کو ایک اشلہ کر دیتے ہیں۔ وہ دھواں پھوڑتے ہیں۔ زہر بلا دھواں

میں بھانھڑا جاتا ہے۔"

"کون اشلہ کرتا ہے۔"

"بڑے لور کون۔"

"بڑے کون۔"

"بڑے پیٹ۔ بڑی تجوریں لونی کریں۔"

"السلام علیکم۔ ہم صاحب ہمارے سر پر آکھڑے ہوئے۔" آپ جا رہے

ہیں۔ وہ بولے۔

"مئی آج جا رہے ہیں۔"

"کس وقت۔"

"آج رات کو۔"

"اچھا صاحب۔ وہ مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ "مٹھ آپ کا حافظہ دبا کر

ہو۔" ان کی آنکھیں پر نم ہو رہی تھیں۔ "جب ادھر سے لوگ آتے ہیں تو انہیں دیکھ کر

بڑی سرست ہوئی ہے ہمیں۔ خدا حافظ۔"

بھگوان پورہ

جب ہم سلاٹ کیمپ پہنچے تو سیکورٹی والے اسی طرح چاق و چوبند بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں تھڑے پر چڑھ گیا۔ وہ میری طرف متوجہ ہو گئے۔ میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لئے۔

"شکر ہے مہداج آج آپ کو اس کشت سے چھٹکارا ہو جائے گا۔"

بوڑھا ہندو اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا "نہ مہداج کشت کیسا۔ ہمیں تو بڑی خوشی تھی۔"

"نہ مہداج۔" میں نے جواب دیا۔ "میں بیٹھے رہنا بیٹھے رہنا بیٹھے رہنا۔"

"بیٹھنا تو کشت نہیں ہوتا مہداج۔" وہ بولا۔

"ہر حال ہماری وجہ سے آپ کو بڑی کھینچل ہوئی۔"

"نہ مہداج۔ ایسا نہ کہو۔" وہ بولا۔

"اک بات پوچھوں لالہ جی۔"

"وس پوچھو مہداج۔"

"آپ بچپے سے کہیں کے ہیں۔"

"میں مہداج۔" اس نے پوچھا۔

"جی آپ۔"

"مہداج میں بھگوان پورے کا ہوں۔"

"اچھا جی اللہ بھلی۔" میں نے آخری سلام کیا اور تھڑے سے پیچھے اتر آیا۔

ترکی حمام کی طرف جاتے ہوئے اشفاق حسین نے پوچھا "یاد یہ سیکورٹی والا کس علاقے کا تھا۔"

"لاہور کا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تو بھگوان پورہ بتا رہا تھا۔"

"ہاں۔۔۔" میں جیسا "رسی جل مٹی پر جل نہیں گیا۔"

"کیا مطلب۔"

"مغلوں نے شہر سے دور اک باغ بنوایا۔" میں نے بات شروع کی۔

"لیکن۔" اختلاف حسین نے احتجاج کیا۔

"بات تو سن لے پہلے۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

"نا۔"

"مغلوں نے شہر سے باہر دور اک باغ بنوایا۔"

"لیک۔"

"باغ کار کھڑکھڑ کرنے والے لوگوں نے باغ کے قریب مٹی یا چنے کے مکان بنائے اپنے رہنے کے لئے۔"

"لیک ہے۔"

"یہ مکان بہت سے ہو گئے تو گاؤں کی شکل بن گئی۔"

"نہرے تو باغبان پرے کی بات کر رہا ہے۔"

"بات تو سن لے پہلے۔"

"نا۔"

"ہندوؤں نے سوچا کسی طرح یہ گاؤں ہندو نہ ہو جائے۔"

"پھر۔"

"انہوں نے ایک مسم چلا دی۔" غلوں میں اپنا اپنا پتہ بھگوان پورہ لکھتا شروع کر دیا۔

پورہ لوں پر بھگوان پورہ لکھ دیا۔"

"اس کا قاعدہ۔"

"کوئی قاعدہ نہیں۔"

"مقصد۔"

"آرٹ فلڈ آرٹ سیک۔"

"وہ ہنسا۔ شاید یہ مقصد ہو کہ شہزاد باغ کو بھگوان باغ مشہور کر دیں۔"

"پھر بھی تو کوئی قاعدہ نہیں نا۔"

"مطلب نام چلے۔ ہندو کا نام چلے۔" وہ ہنسنے لگا۔

”شاید مطلب یہ ہو کہ مسلمان کا نام سننے “۔
 ”جتنی حرام میں سب دلائل مسلمان ہمارے بیٹھے تھے۔“

لٹیرے اور لوٹ

مسلمان مسلمان مسلمان۔

مسلمان کی کشتی ہمیشہ مسلمان کی وجہ سے ڈوبی۔

جو ہند میں مقیم ہیں وہ ہم صاحب کی طرح مسلمان کے لئے بیٹھے ہیں جو زائر بن کر آتے ہیں مسلمان کی گفتاریاں اٹھائے وطن پہنچتے ہیں اور اس بوجھ پر پھولے نہیں ساتے۔
 میں بھی اپنی گفتاری پر پھولے نہیں سارہا تھا۔ اس میں ہند کی سوغاتیں تھیں۔ ہند کے پلن۔ ہند کی بیڑیاں۔ ہند کی لالچھیاں۔ ہند کا کتھہ۔ ہند کے پاؤں۔ ہند کا گھدر۔ ہند کے سب سنے اور اٹھے۔ ہند کی کھڑاواں۔

میں اپنی گفتاری کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔

کبھی اپنی اپنی گفتاریاں سینے سے لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ یوں جیسے سوغات کو سر کر کے آ رہے ہوں۔

”کہاں ہے میری گفتاری“۔

”میرا سوٹ کیس کہاں ہے“۔

”میری پاؤں کی ٹوکر“۔

سب اپنی اپنی گفتاریاں منجھل منجھل کر رکھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ لیڈر صاحب بھی چلا چلا کر پوچھ رہے تھے ”کیوں بھیجی میرا پہلوں کا ٹوکر کہاں رکھ دیا“۔
 گاڑی سیٹیاں بددلی تھی۔

لٹیرے لوٹ کاٹل منجھل رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے بیکورنی والے چوری چوری جس رہے تھے۔ ریل گاڑی کھی کھی کھی کرتی ہوئی سرک رہی تھی۔

دور جاس مسجد کلاں پر ہاتھ رکھے چلا چلا کر پوچھ رہی تھی۔ ”مجھے لینے کب آؤ گے۔ اللہ اکبر“



اس کتاب میں میں نے کئی ایک موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن میں ہند اور
ہندو پیش پیش ہیں۔ ان دو موضوعات پر بات کرنے کا مجھے حق حاصل ہے چونکہ میں نے
اپنی زندگی کے 42 سال ان کے ساتھ گزارے ہیں۔

میں ہند اور ہندو دونوں کا احترام کرتا ہوں
میں ہندو قوم کی جملہ مثبت خصوصیات کا اعتراف کرتا ہوں۔
مجھے ان سے صرف ایک شکایت ہے کہ انہوں نے مسلمان کو ہمیشہ اچھوت سمجھا
اور پاکستان کو پتھروں سے تسلیم نہیں کیا۔

پھر یہ بھی ہے کہ ہندو کے اس رویے کا مجھ پر بہت بڑا افسان ہے۔
ہندو کے اس رویے نے مجھے مسلمان بنا دیا مجھے ایک تعصب بخش، منفی تعصب
میں، مثبت تعصب۔

الحمد للہ کہ میں ایک متعصب مسلمان ہوں
الحمد للہ کہ میں ایک متعصب پاکستانی ہوں۔



فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

لاہور - راولپنڈی - کراچی